انگریزوں کی
لسانی پالیسی

تالیف:

سید مصطفےٰ اعلیٰ بریلوی

بی کام، ایل، ایل، بی

مقدمہ:

مرزا علی اظہر برلاس

انگریزوں کی لسانی پالیسی

تالیف

سید مصطفیٰ علی بریلوی بی کام۔ یل۔ یل۔ بی

مقدمہ

مرزا علی اظہر برلاس

ناشر

ڈائریکٹر اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

سعیدہ منزل، متصل سرسید گرلس کالج۔ کراچی ۱۸

طبع اول

تعداد	ایکہزار
قیمت	آٹھ روپے

مطبوعہ

انجمن پریس کراچی

۱۹۷۰ء

فہرست مضامین

باب ۔ ۹

صوبہ پنجاب

اردو زبان کے خلاف دلائل

اراکین انجمن پنجاب

مقدمہ

از جناب مرزا علی اظہر برلاس چیئرمین کانفرنس اکیڈیمی و عبداللہ کالج کراچی

انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے اقتدار کو جمانے اور مسلم اثرات کو مٹانے کے لئے جو مختلف طریقے اختیار کئے ان میں اردو کی دشمنی سرفہرست تھی۔ مگر اپنے اس جذبے کو انگریزوں نے انتہائی چالاکی کے ساتھ اس طرح پیش کیا کہ ہندو اور مسلمان دونوں دھوکہ کھاگئے۔ ہندوؤں کے سامنے اردو کو محض مسلمانوں کی زبان کہہ کر پیش کیا اور ان کے تعصب کو ابھارا۔ چنانچہ سر ہنری ایلیٹ (SIR. H. M. ELLIOT) نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ ہند" میں اس بات پر حیرت و استعجاب کیا ہے کہ ہندو مصنفین اپنی کتابوں کی ابتداء اللہ کے نام سے اور نعت پیمبر سے کرتے ہیں۔ اُدھر مسلمان اردو کو بلا شرکت غیرے اپنی زبان سمجھنے لگے، اور اس کے دعویدار بن گئے، جس کی وجہ سے ہندوؤں کی عصبیت میں تیزی و تلخی پیدا ہوگئی۔ اس طرح دو طرفہ تعصبات کو بھڑکا کر ایک ایسا منصوبہ بنایا کہ جس سے سوائے ان کے سب کو نقصان پہنچے۔

انگریزوں کی اس لسانی پالیسی اور اس کے سیاسی پس منظر پر ایسی کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گذری جس میں اس پیچیدہ مسئلہ اور اس کے عوامل و محرکات پر بالتفصیل بحث کی گئی ہو۔ اس کمی کو جو بہت عرصے سے تعلیم یافتہ طبقہ محسوس کر رہا تھا۔ عزیزی سید مصطفیٰ علی صاحب بریلوی نے بہت ہی محنت و جانفشانی سے

اس کتاب کو لکھ کر پورا کر دیا۔

۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی کے بعد انگریزوں نے اپنے پنجے بنگال میں مضبوطی سے گاڑ دیئے اور ان کو پھلنے پھولنے کا موقع مل گیا۔ اگرچہ تاریخ کی ورق گردانی سے ثابت ہوتا ہے کہ انگریزوں کی دوربین نگاہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی انحطاط کا اندازہ تقریباً ایک سو سال قبل ہی لگا لیا تھا۔ اور مزید شواہد کی بنا پر جب ان کو اپنے اندازے کی صحت کا یقین ہو گیا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے سربراہ سر جوشوا چائلڈ (Sir. JOSHVA CHILD) نے ۱۶۸۷ء میں جبکہ سلطنت مغلیہ کی شوکت وحشمت اور شہنشاہ اورنگ زیب کی علمی فضیلت و عملی جدوجہد دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کئے ہوئے تھی۔ انگلستان لکھ بھیجا کہ "ہندوستان کے حالات ہمیں تدریجاً حکومت اعلیٰ کی طرف لئے جا رہے ہیں" اور ایک وسیع اور مستحکم انگریزی حکومت قایم کرنے کی سفارش کر دی تھی۔

ظاہر ہے کہ جو قوم صدیوں پیشتر منصوبہ بنا کر گامزن ہوگی تو اس کی چالوں کا سمجھنا آسان نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اٹھارویں صدی کے زوال پذیر مسلم معاشرے میں انگریزوں کی روباہ بازیوں کو کوئی سمجھ نہیں سکا۔ اور اگر اکا دکا کسی نے سمجھا بھی تو دوسروں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ انگریزوں نے اختلاف اور افتراق کی بنا زبان پر رکھی اور فارسی کی جگہ رفتہ رفتہ علاقائی زبانوں کو بڑھانا شروع کیا۔ ظاہراً تو ان علاقوں کے لوگوں کے ساتھ یہ ہمدردی تھی۔ مگر در پردہ مسلمانوں کے اتحاد اور ان کے تفوق پر ضرب کاری تھی۔ چنانچہ جیسا کہ لائق مصنف نے مستند حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ بنگال میں "پوتھی ادب" جو اسلامی روایات

کا مخزن تھا، کی جگہ" ہندو بنگلہ نے لے لی۔ مگر بنگال میں اکثریت چونکہ مسلمانوں کی تھی، اس لئے" مسلمانی بنگلہ" جس میں زیادہ تر الفاظ عربی و فارسی کے تھے اور تشبیہات و استعارات وغیرہ بھی عربی و فارسی ادب کے مرہون منت تھے مسلم عوام و خواص میں بدستور جاری رہی۔ اور ہندو دانشوروں کی یہ سعی نامشکور یعنی" ہندو بنگلہ" صرف ہندو زمینداروں اور سرمایہ داروں میں محدود ہو کر رہ گئی۔ مگر ۱۸۵۷ء کے بعد سے ہندو چونکہ انگریزوں کا سہارا پا کر پورے ہندوستان کی علمی اور کاروباری فضا پر چھا گئے تھے۔ خصوصیت سے بنگال میں۔ اس لئے اردو کے بجائے مقامی زبانوں کو ابھارنے کی کوششیں ہندوؤں نے بھی شروع کر دیں۔

۲۳-۱۹۲۲ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مشہور ماہر تعلیم سر آسوتوش مکرجی نے سنڈیکیٹ سے یہ تجویز پاس کرا دی کہ کلکتہ، مرشدآباد اور ڈھاکہ کے علاوہ پورے صوبۂ بنگال میں ذریعہ تعلیم بنگلہ زبان قرار دی جائے جس کے معنی یہ تھے کہ سوائے ان تین شہروں کے (جہاں اکثریت اردو بولنے والوں کی تھی) پورے صوبے کے مسلمان بچوں کو بنگلہ زبان" لازماً" پڑھنا پڑے گی۔ اس پر صوبے بھر کے مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ اور خاص طور سے کلکتہ میں۔ اتفاق سے اس زمانے میں راقم الحروف کلکتہ کے مسلمانوں کے مشہور اور سب سے بڑے علم و تہذیب و تمدن کے مرکز یعنی مسلم انسٹی ٹیوٹ کا سیکریٹری تھا۔ کلکتہ کے علمی حلقوں نے اور خاص طور سے ہمارے ممبروں نے اصرار کیا کہ ایک جلسہ کر کے ہندوؤں کی سازش کو بے نقاب کرنا چاہیے بحیثیت

سکریٹری میں نے یہ مناسب خیال کیا کہ جلسہ کے قبل لیڈران قوم کو توجہ کرنا چاہیے اور نمایاں شخصیتوں کو تقریر کرنے کی دعوت دینا چاہیے چنانچہ مولوی فضل الحق مرحوم۔ مولوی ابوالقاسم بردوانی مرحوم، مسٹر حسین شہید سہروردی مرحوم (سابق وزیر اعظم، مولوی رضا علی وحشت مرحوم۔ نواب علی چودھری مرحوم (ہمارے سابق وزیر اعظم محمد علی بوگرا مرحوم کے دادا) سر عبدالحلیم غزنوی مرحوم و دیگر عمائدین کی خدمت میں حاضر ہو کر وعدہ لیا۔ بحیثیت سکریٹری میں نے سنڈی کیٹ کے فیصلہ کے خلاف تجویز پیش کی اور اپنی تقریر میں مسلمانان بنگال پر اس کے مضر اثرات پر روشنی ڈالی میری تائید فضل الحق صاحب مرحوم اور ابوالقاسم صاحب بردوانی مرحوم نے کی۔

مولوی فضل الحق صاحب مرحوم کی تقریر میرے کانوں میں آج تک گونج رہی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کا ہال اور کمرے اور پشت کا برآمدہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ڈائس پر اکابرین قوم و ملت بیٹھے ہوئے تھے۔ (جس میں بہت سے سرکاری افسران بھی شامل تھے) فضل الحق صاحب گول سنہری ٹوپی پہنے ہوئے کھڑے ہوئے اور تقریباً ایک گھنٹے تک بہت ہی زوردار اور جوشیلی تقریر کی۔ اس زمانے میں فضل الحق صاحب کی خطابت انتہائی عروج پر تھی۔ دوران تقریر اور دلائل کے علاوہ اردو کی موافقت میں یہ دلیل بھی پیش کی کہ "اگر ہمارے بچوں پر بنگلہ زبان ٹھونس دی گئی تو بنگال کے مسلمان ہندوستان کے دیگر مسلمانوں سے کٹ جائیں گے اور اردو میں مسلمانوں کا جو تہذیبی تمدنی اور علمی خزانہ ہے" اس سے ہماری نسلیں محروم ہو جائیں گی۔ مگر سب سے زیادہ دلچسپ اور متاثر کرنے والی بات یہ تھی کہ فضل الحق صاحب مرحوم نے ایک، بنگالی کی روزانہ بول چال کو دہرا کر ثابت کیا کہ مسلمانوں کی بنگلہ زبان میں

اسی فی صدی تک عربی و فارسی الفاظ مستعمل ہیں اور بہت تھوڑے الفاظ ملا دینے سے بنگالی مسلمان کی زبان اور اردو میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ مگر فائدہ یہ ہے کہ بنگال سے لے کر پشاور تک ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے دکھ درد کو سمجھ سکے گا اور ہاتھ بٹا سکتا ہے۔ ہندوؤں کی یہ سازش ہے کہ وہ زبان کی دیوار کھڑی کر کے بنگال کے مسلمانوں کو ہندوستان کے بقیہ مسلمانوں سے علیحدہ کرنا چاہتے ہیں۔ ابوالقاسم صاحب بردوانی مرحوم نے بھی اردو کی موافقت میں بڑی زوردار تقریر کی

اردو کے حق میں تجویز غالب اکثریت سے پاس ہو گئی۔ اور حسب دستور سابق عمل درآمد رہا

صوبجات متحدہ (یوپی) میں انگریزوں نے جب ہندی کو دفتری اور عدالتی زبان بنانا چاہا تو مسلمانوں کے اختلال و انتشار کے باوجود صوبے بھر میں مخالفت کی لہر دوڑ گئی۔ نواب محسن الملک مرحوم سکریٹری اردو ڈیفنس کمیٹی علی گڑھ، کرامت حسین[1] مرحوم بیرسٹر ایٹ لا، الہ آباد اور حامد علی خاں[2] مرحوم بیرسٹر ایٹ لا، لکھنؤ نے ایک

---

[1] مولانا سید کرامت حسین صاحب مرحوم بعد کو الہ آباد ہائیکورٹ کے جج ہو گئے تھے۔ اور چونکہ عربی میں اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے اسلئے شرح محمدی کے متعلق ان کے فیصلے اب تک سند کے طور پر پیش ہوتے ہیں۔ ۲۹ر جون ۱۹۱۲ء کو ہائیکورٹ کی ججی سے سبکدوش ہونے کے بعد لڑکیوں کا ایک سکونتی مدرسہ - کرامت حسین گرلز اسکول" کے نام سے نومبر سنہ ۱۹۱۲ء کو لکھنؤ میں قایم کیا جو بحمد اللہ آج تک بحیثیت کالج کے قایم ہے۔ مولانا کرامت حسین صاحب نے ۱۹ر اپریل سنہ ۱۹۱۷ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔

[2] لکھنؤ کے مشہور بیرسٹر اور حیات مولانا کرامت حسین کے لائق مصنف۔

مراسلہ مورخہ لکھنو، ۲۹ جولائی سنہ ۱۹۰۰ء عمائدین شہر کے نام حسب ذیل عبارت کا بھیجا :-

"جناب من ۔ اردو ڈیفنس کمیٹی لکھنؤ نے باتفاق رائے کمیٹی علی گڑھ اور دیگر کمیٹیوں کے جو مختلف اضلاع میں اردو ڈیفنس کے لیے قایم ہوئیں، یہ تجویز کی ہے کہ ۱۸ اگست روز شنبہ کو ۷ بجے لائیل ہال رفاہ عام میں شمالی ہندوستان کے لائق اور معزز اہل وطن کا ایک جلسہ منعقد ہو۔ تاکہ اس بی گورنمنٹ کے رزولیوشن مورخہ ۱۸ اپریل سنہ ۱۹۰۰ء پر جس کی رو سے عدالتوں میں ناگری حروف جاری کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ غور اور مشورہ کیا جائے" (۱)

جلسہ کی اہمیت کے لحاظ سے اس وقت کی موزوں ترین شخصیت یعنی میر انیس مرحوم کے صاحبزادے میر خورشید علی صاحب نفیس مرحوم کو صدر جلسہ منتخب کیا گیا انتہائی پرجوش تقریروں نے مجمع کو مضطرب کر دیا تھا۔ جلسہ کے اختتام پر نواب محسن الملک مرحوم نے یہ مصرع پڑھ کر کہ

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

ایک جلوس نکالا۔ جس کے آگے آگے اردو کا جنازہ تھا اور تابوت کے پیچھے سوگوار دں

---

(۱) اتفاق سے والد مرحوم کے کاغذات میں یہ محفوظ ہے۔ مگر پورا مراسلہ، اگرچہ دلچسپ ہے، بخوف طوالت یہاں نقل نہیں کیا گیا۔

میں سب سے اول نفیس مرحوم کو رکھا تھا۔ نواب محسن الملک مرحوم کی تنظیمی صلاحیتوں نے پورے صوبے میں آگ لگا دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شدید مخالفت سے متاثر ہو کر سر انتھونی میکڈانلڈ نے اردو کی حیثیت کو بجنسہ برقرار رکھا۔

ہندوستان میں ۱۹۳۷ء میں پہلی مرتبہ کانگریس گورنمنٹ قائم ہوئی۔ یوپی میں پنڈت گوبند بلبھ پنت نے بحیثیت وزیر اعلیٰ کے حکومت ترتیب دی رفیع احمد قدوائی صاحب مرحوم بھی کابینہ میں شریک تھے۔ قدوائی مرحوم چونکہ پنڈت موتی لال نہرو (پنڈت جواہر لال نہرو کے والد) کے خاص آدمی تھے، اس لئے جواہر لال نہرو اور دیگر اکابرین کانگریس ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اور اپنی ذہانت اور سوجھ بوجھ کی وجہ سے بھی ان کے مشورے بہت اہمیت رکھتے تھے۔

پنت گورنمنٹ نے سال بھر کے اندر ہی عدالتوں اور دفتروں میں ہندی زبان میں درخواستیں دینے کا حکم نافذ کر دیا۔ اردو میں لکھی ہوئی درخواستیں واپس ہونے لگیں۔ مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ اتفاق سے قدوائی صاحب دورہ کرتے ہوئے بہرائچ آئے۔ راقم الحروف اس زمانے میں بہرائچ میونسپل بورڈ کا چیرمین تھا اور بحیثیت اول شہری کے وزیر موصوف سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے شہر کے حالات پوچھنا شروع کر دیئے۔ میں نے اور باتوں کے علاوہ اردو کی درخواستوں کا مسئلہ خاص طور سے چھیڑا۔ اور بعض متعصب ہندو حکام کی اردو دشمنی کی شکایت کی۔ انھوں نے فوراً نوٹ کیا اور لکھنؤ کی واپسی پر مناسب احکام جاری کرنے کا وعدہ فرمایا اور ایسا ہی کیا۔ پھر حسب دستور سابق درخواستیں اردو میں گذرنے لگیں اور افسران متعلقہ ان کو لینے لگے۔

مگر انگریزوں نے جو بیج بویا تھا وہ بالآخر رنگ لا کے رہا اور رفتہ رفتہ امتداد زمانہ کے ساتھ دو قومی نظریے کو اختلافات لسانی نے اس قدر ہوا دی کہ تقسیم ہند کا ایک قوی سبب اردو ہندی کا جھگڑا بھی تھا۔

پاکستان بننے کے بعد یہ امید ہوئی تھی کہ مسلمان اپنے مذہب و تہذیب و شائستگی۔ اور اپنی قومی زبان اردو کی خدمت میں سر و تن کی بازی لگا دیں گے تاکہ دیگر السنۂ کبیرہ کے دوش بدوش اردو کو بھی اقوام عالم کی ایک مستند زبان تسلیم کر لیا جائے مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

پاکستان تو مسلمانوں نے بے شمار قربانیاں دے کر بنا دیا۔ مگر مسلمانوں کو تباہ کرنے اور وحدت اسلامیہ کو مٹانے کے لیے انگریزوں نے جو صد سال قبل علاقائی زبانوں کے غلط استعمال کا بیج بویا تھا، وہ اب بار آور ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ انگریز تو چلے گئے مگر ان کے مسلم کش اثرات امراض متعدی کی طرح پاکستان کے ہر علاقے میں پھوٹ پڑے ہیں۔

اردو، جس نے برّ صغیر کے مسلمانوں کو، بحیثیت قومی زبان کے، متحد کر دیا تھا، اس کی مخالفت پر کچھ اشخاص کمر بستہ معلوم ہو رہے ہیں۔ اور چونکہ اردو برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی ثقافتی زبان ہے، لہٰذا اس سے بیزاری کے ساتھ ہی ساتھ اب ادبی استعارات و تشبیہات کے لیے بجائے متنبّی و جاحظ یا سعدی و حافظ کے کالیداس اور ٹیگور وغیرہ کی طرف نگاہیں لگی ہوئی ہیں اور ان سے فیضان حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن اردو کی ذاتی صلاحیتیں اور اس کی ہمہ گیری

ایسی ہے کہ کوئی طاقت دانستہ یا نادانستہ اس کو پنپنے سے روک نہیں سکتی۔ ہندوستان میں باوجود جن سنگھیوں اور ہندو مہا سبھائیوں کی انتہائی مخالفت کے اردو میں جو کچھ کام ہو رہا ہے وہ پاکستان سے کہیں زیادہ ہے۔ اور مغربی ممالک میں خاص طور سے تاشقند (روس) وغیرہ میں ادبیات اردو کے متعلق جو شغف و انہماک کا اظہار ہو رہا ہے اس کی ترویج و توسیع میں جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ اس بات کی ضامن ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے نخل اردو کی جو آبیاری اپنے خون سے کی تھی، وہ انشاء اللہ اس کو کمھلانے نہ دیگی۔

آخر میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جس دیدہ ریزی سے عزیزی مصطفےٰ علی صاحب سلمہٗ نے ہندوستان کے مختلف صوبوں مثلاً بنگال، بہار، یو۔پی۔ سندھ، کشمیر، راجستھان اور دکن وغیرہ میں انگریزوں کی لسانی پالیسی کا جائزہ لیا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کر کے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے وہ انھیں کا کام ہے۔ انھوں نے کوئی بات ایسی نہیں کہی ہے جس کے لئے کوئی مستند دلیل پیش نہ کی ہو جس سے ان کے منطقی استدلال کے علاوہ ان کی وسعت نظر بھی ثابت ہوتی ہے۔ جس محنت شاقہ سے انھوں نے مختلف ماخذوں کو کھنگال کر اپنی تالیف کے لئے مواد جمع کیا ہے اس کی کما حقہ داد صرف وہی حضرات دے سکتے ہیں جن کو تحقیق و تدقیق کا تجربہ ہے اور جو دن کا آرام اور رات کی نیندیں اپنے اوپر حرام کر چکے ہیں۔ میں خداوند عالم سے دست بہ دعا ہوں کہ اس جواں سال دانشور کی ہمت میں اضافہ دے اور اس کو زیادہ مواقع بہم پہنچائے کہ قوم و ملت کی خدمت اسی ایثار و

جذبے کے ساتھ جاری رکھ سکے۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

تعارف

از جناب ثناءالحق صدیقی ایم۔ اے

زبان کا مسئلہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بے انتہا اہمیت کا حامل ہے۔ کسی قوم کے عادات و اطوار، طرزِ زندگی اور تہذیب و معاشرت کو متعین کرنے اور بدلنے میں زبان نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ہم زبانی ہم خیالی کو مستلزم ہے۔ اور ہم خیالی سے تہذیب و تمدن میں یکسانیت پیدا ہوتی ہے۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ حکمران قوم کی زبان محکوموں کو متاثر کرتی ہے اور زبان کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کا تمدن و تہذیب بھی محکوموں میں مقبول ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے شعار اور عادات و اطوار کو بھول کر حاکم قوم کے عادات و اطوار اختیار کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کورانہ تقلید کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ وہ پوری طرح حاکم قوم کے خصائص و اطوار کو اپنا سکتی ہے اور نہ اپنے شعار و تمدن پر قائم رہ سکتی ہے۔ البتہ محکوم قوم کے افراد میں قبیح کیفیتیں ضرور پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ غلامانہ ذہنیت میں مبتلا اور احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور آخر کار قومیت کا فقدان، اپنی روایات سے بیزاری اور اپنے علوم و فنون سے نفرت کے جذبات پختہ ہو کر ان کی عادات ثانیہ بن جاتے ہیں۔ قوموں کے لئے اس سے بڑا سانحہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

انگریز نے جس وقت برصغیر میں حکومت کا منصوبہ بنایا تھا، اسی وقت سے اس نے زبان کے مسئلہ پر خصوصی توجہ دینا شروع کر دی تھی۔ ایک فطری اصول کے تحت یہ تو لازمی تھا کہ یہاں انگریزی زبان اور مغربی علوم و فنون کا دخل ہوتا اور رفتہ رفتہ ان چیزوں کو یہاں کے باشندے قبول کر لیتے۔ لیکن انگریز جیسی چالاک قوم فطرت کے اصول کے تابع ہو کر کیسے رہ سکتی تھی، اسے تو یہاں ایک بڑی قوم پر حکومت کرنا تھا۔ قوم بھی وہ جس میں مختلف نسلوں مختلف عقائد اور مختلف خصائص کے لوگ آباد تھے۔ یہ ضرور ہے کہ صدیوں کے اختلاط اور باہمی میل جول سے ان میں ایک دوسرے سے وحشت اور اجنبیت کا عُنصر زیادہ نمایاں نہیں رہا تھا۔ مسلمانوں کے طویل دور حکومت میں مختلف علاقے بعید فاصلوں کے باوجود ایک دوسرے سے بہت قریب آ گئے تھے۔ فارسی زبان جو سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی تھی سب جگہ اپنالی گئی تھی۔ اور اگرچہ عام بول چال اور لین دین کے کاموں میں مقامی زبانیں رائج تھیں۔ لیکن تحریری کام تقریباً تمام تر فارسی میں ہوتا تھا۔ اور اس چیز پر سب کا اتفاق تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو، مسلمان اور سکھ سب فارسی کا سیکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ سندھ۔ پنجاب۔ یوپی۔ بہار اور بنگال نیز دکن اور شمالی ہندوستان سب جگہ فارسی کا سکہ رواں تھا۔ اور اس یکسانیت و یکرنگی نے ان بعید علاقوں کو آپس میں متحد اور ایک دوسرے سے قریب کر دیا تھا۔ انگریز کے لیے یہ اتحاد سمِ قاتل کی حیثیت رکھتا تھا۔ لہٰذا اس نے شروع ہی سے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کرنا ضروری سمجھا۔

اس کے نزدیک اس مقصد کے حصول کا مؤثر ترین ذریعہ یہ دکھائی دیا کہ جس طرح ممکن ہو لسانی اتحاد و یکرنگی کو ختم کیا جائے۔ اس کو یقین تھا کہ اس پالیسی پر عمل درآمد ہونے کے بعد حسب ذیل نتائج برآمد ہوں گے،

(۱) برصغیر کی مختلف قوموں کے مابین صدیوں کے اختلاط اور میل جول سے جو ایک طرح کی یگانگت پیدا ہو گئی ہے وہ ختم ہو کر اس کی جگہ بیگانگت اور دشمنی جنم لے گی۔

(۲) مختلف علاقوں کے درمیان جن میں اتحاد کا اور کوئی ذریعہ اتنا قوی نہیں ہے، زبان کی یکرنگی ختم ہونے سے اجنبیت کی ایسی فضا پیدا ہو جائے گی جس کو دور کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہو گا۔

(۳) تمام قوموں بالخصوص مسلمانوں کے ذہنوں سے ان کی اپنی روایات محو ہو جائیں گی اور ان کا سرمایۂ علمی جو صدیوں سے جمع ہوتا چلا آرہا تھا، گلدستۂ طاقِ نسیان بن جائے گا۔

(۴) وہ اپنی دیرینہ روایات اور شعائرِ ملی و دینی کو ترک کر کے بے راہ روی اختیار کر لیں گے۔

(۵) اُن کے دلوں میں حاکم قوم کی برتری اور تفوّق کا نقش گہرا ہو گا۔ اور وہ ہمیشہ کے لئے جذبۂ مرعوبیت میں مبتلا ہو جائیں گے۔

ان مقاصد کے حصول کے لئے انگریز نے پہلے مختلف علاقوں میں مختلف زبانوں کا ڈھونگ رچایا۔ پھر ہندوؤں اور مسلمانوں میں دو مختلف رسم الخط رائج کر کے ان کے درمیان افتراق و انشقاق کی فضا پیدا کی۔ رسم الخط کے اختلاف سے

ایک زبان کی کئی قسمیں ہوگئیں، اور وہ مختلف زبانوں کے نام سے موسوم کی جانے لگیں جو زبان برصغیر میں لنگوا فرینکا کی حیثیت رکھتی تھی، اور دور و نزدیک ایک نام ہندوی یا ہندوستانی کے نام سے موسوم کی جاتی تھی. رسم الخط کے مختلف ہوتے ہی دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصہ پر اردو کا اور دوسری پر ہندی کا لیبل لگ گیا۔ اسی طرح رسم الخط میں تبدیلیاں کرکے اسی زبان کو بعض علاقوں میں جداگانہ حیثیت دیدی گئی اور مختلف فرقوں اور علاقوں کے درمیان افتراق کے لئے لسانی بنیاد قایم ہوگئی جس نے اور اختلافات کو بھی ہوا دے کر ابھارا۔ اور وہی قوم جو صدیوں کے میل جول سے بڑی حد تک اتفاق و یکجہتی کے رشتہ میں منسلک ہوگئی تھی اس تدبیر سے کئی فرقوں اور قوموں میں بٹ گئی۔

تیسرے مقصد کے حصول کے لئے انگریز نے اپنی زبان کی برتری، فضیلت، وسعت اور جامعیت کے راگ بڑی بلند آہنگی سے الاپے اور اس کو دُنیوی ترقی کا زینہ قرار دے کر اور مختلف علوم و فنون کے خزانوں کی کنجی بنا کر اس کا سیکھنا لازمی کر دیا۔ اس آواز پر پہلے ہندوؤں نے اور پھر مسلمانوں نے لبیک کہا اور نصف صدی سے بھی کم عرصہ میں قوم کی جو حالت بنی اس کا نوحہ موسیو لیبان اِن الفاظ میں کرتا ہے،

"گذشتہ چالیس پچاس سال میں اس تعلیم کے پیالے بڑی مقدار میں دیسیوں کو پلائے گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک انوکھا جدید فرقہ ملک میں پیدا ہوگیا جو بابو یا انگریزی تعلیم

یافتہ کے لقب سے مشہور ہے۔ ۔ ۔ ۔ بابو ایک عجیب برزخ ہے۔ اس کی دماغی و اخلاقی حالت عجیب قسم کی ہے اس کے مطالعہ سے معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ ایک قسم کی مصنوعی قوم کا فرد ہے جس کے خصائص نہایت عجیب ہیں ۔ ۔ ۔ دماغی اور اخلاقی حالت کے لحاظ سے بابو کی مثال ایک ایسے جہازران سے دی جا سکتی ہے، جس کا قطب نما گم ہو گیا ہو۔ ۔ ۔ خیالات کی پراگندگی کے ساتھ ساتھ بابو پر جو ایک اور خوفناک نتیجہ یورپی تعلیم کا ہوا وہ یہ ہے کہ اس میں اخلاقی پاکیزگی کے متعلق لاپرواہی آگئی مذہب کی مضبوط بنیاد پر اس کے چال چلن کا دارومدار تھا وہ اس درجہ برباد ہو گیا ہے کہ اب اس کے پھر پنپنے کی امید نہیں ہے۔ وہ اپنے باپ دادوں کے اعتقادات کھو بیٹھا ہے۔ اور یورپی لوگوں کے اصول چال چلن بھی اس نے اختیار نہیں کئے۔ اس کی راستی و دیانتداری صرف وہیں تک محدود ہے جہاں تک اس کو پولس کی حراست کا خوف ہے"

انگریز کی لسانی پالیسی نے عملی جامہ رفتہ رفتہ پہنا اور پورے برصغیر میں کبھی ایک پالیسی اختیار نہیں کی گئی۔ بلکہ قوم کو متفرق و منتشر کرنے کے لئے ضروری سمجھا گیا کہ اولاً لسانی اعتبار سے اس کو ایک انتشاری کیفیت میں مبتلا

کیا جائے۔ اور جب افتراق و انشقاق کی بنیادیں مضبوط ہو جائیں تو پھر انگریزی زبان کی برتری جتا کر اس پر سب کو متحد کر دیا جائے۔ پہلے منصوبے کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہندی اور اردو کی بنیاد پر دو قومی نظریہ نہایت شدت سے ابھرا اور سر سید مرحوم کو بھی جو پہلے برّصغیر کی پوری آبادی کو ایک قوم سمجھتے تھے۔ آخر میں دو قومی نظریہ کا قائل ہونا پڑا۔ کمشنر بنارس سے اس سلسلہ میں ان کی جو گفتگو ہوئی وہ اس تبدیلی پر پوری طرح روشنی ڈالتی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ

"انہیں دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا۔ ایک روز مسٹر شکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے۔ میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا، اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کیا کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے۔ آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا! وہ دیکھے گا۔" انہوں نے کہا۔ "اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح

ہوئی تو نہایت افسوس ہے" میں نے کہا۔ مجھے بھی نہایت افسوس ہے۔ مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے"

انگریزی زبان کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیدینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ ہی عرصہ بعد خود برصغیر کے باشندے اپنی زبان کو حقیر سمجھنے لگے۔ اور پڑھا لکھا اور مہذب آدمی اس کو قرار دینے لگے جو انگریزی زبان سے واقفیت رکھتا ہو۔

غرض انگریز نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ پوری قوم کے لئے نہایت مہلک ثابت ہوا اور اس کے نتائج حسب ذیل برآمد ہوئے۔

(۱) برصغیر میں مختلف فرقوں اور صوبوں کے درمیان ایسی خلیجیں حائل ہوگئیں جن کا پاٹنا مشکل ہوگیا۔

(۲) ماضی کی روایات نہ صرف ذہنوں سے فراموش ہوگئیں، بلکہ ان کی جانب سے ایک گونہ نفرت کا جذبہ پیدا ہوگیا۔

(۳) دلوں میں مغرب کی ہر چیز کا ایسا رعب قائم ہوگیا کہ آج آزادی حاصل ہو جانے کے بعد بھی دلوں سے اس کا دور کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔

(۴) نظر میں بے انتہا سطحیت پیدا ہوگئی اور سہل انگاری نے کسی بات کی گہرائی تک پہنچنے کی صلاحیت کو مفقود کردیا۔

اس لسانی پالیسی سے برصغیر میں جو انقلاب رونما ہوا اس کی داستان اتنی پُرپیچ ہے کہ تمام کڑیوں کو ملا کر اس کو ایک وحدت اور قابل فہم بنانا عوام تو کیا خواص کے لئے بھی نہایت دشوار ہے۔ لیکن چونکہ اس کے نتائج و عواقب کو ہم آج نہ صرف محسوس کر رہے ہیں بلکہ بھگت بھی رہے ہیں، اور اگر اب بھی واقعات

کو سمجھ کر اصلاح حال کی کوشش نہ کی گئی تو آئندہ بھی بھگتنا پڑیں گے۔ اس لئے ضروری ہے کہ تاریخ کی روشنی میں واقعات کا جائزہ لیا جائے اور ان کڑیوں کو ملا کر دیکھا جائے جنھوں نے یہ واقعات اور نتائج پیدا کئے ہیں۔

بدقسمتی سے ابھی تک کوئی ایسی جامع کوشش ان حالات کا جائزہ لینے کے لئے نہیں کی گئی جو واقعات کی صحیح اور واضح تصویر پیش کرتی۔ برادر محترم سید مصطفےٰ علی بریلوی نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے بڑی محنت اور عرق ریزی سے یہ کام انجام دیا ہے اور مختلف مآخذ سے مواد جمع کرکے یہ داستان مرتب کی ہے اس میں انھوں نے ابتداءً زبان اور رسم الخط پر کسی قدر تفصیلی بحث کی ہے اور قوموں کی زندگی میں ان دونوں چیزوں کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کے عروج وزوال پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ ابتداءً انگریزوں نے چاپلوسی اور خوشامد سے کام لے کر اپنے قدم مضبوطی سے جمائے۔ جب اسلامی حکومت رو بہ زوال ہوئی اور مسلمانوں کی حالت بگڑنے لگی تو ان کے ساتھ ہر طرح کے مظالم کئے اور ان کے کلچر اور تہذیب و تمدن نیز زبان و ادب کو مٹانا انھوں نے اپنے لئے ضروری سمجھا اور اس مقصد کے حصول کے لئے اکثریت کا تعاون حاصل کیا۔ چنانچہ جہاں جہاں انگریز کا قبضہ مستحکم ہوتا گیا وہاں سے فارسی خارج کی جاتی رہی۔ اور اس کی جگہ ابتداءً مقامی زبان بعدہٗ انگریزی زبان لیتی گئی۔ لیکن یہ عمل اس نے اس چالاکی سے کیا کہ نہ صرف اس وقت کسی کو شبہ نہیں ہوا بلکہ آج بھی یہ سمجھا جاتا ہے کہ سب کچھ انگریز نے مقامی زبانوں کی محبت میں کیا۔ فورٹ ولیم کالج قائم کرکے اردو دراصل ہندی کو ترقی دینے کے بہانے ابتداءً

دو مختلف رسم الخط کا اور بعد میں دو زبانوں کا تصور ذہن نشین کیا۔ اور اس طرح دو قومی نظریہ کی بنیاد ڈالی۔ پھر جہاں جہاں انگریزوں کے قدم جاتے رہے وہ اسی پالیسی پر عمل کرتے رہے۔ اس طرح اگرچہ ہر جگہ مختلف اوقات میں اور مختلف طریقوں سے انھوں نے اپنی پالیسی کو عملی جامہ پہنایا۔ لیکن بنیاد ہر جگہ وہی رکھی اور نتائج بھی ہر جگہ یکساں برآمد ہوئے۔ یعنی قوموں اور صوبوں میں عصبیت بیدار ہوئی اور کسی کو بھی اپنی روایات اور اپنے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن سے واسطہ نہ رہا۔

ان تفصیلات کو مؤلف موصوف نے ہر صوبہ اور علاقہ کا الگ الگ جائزہ لے کر پیش کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ علاقہ جاتی تصور کس طرح اُبھرا اور کیونکر مختلف صوبجات کے درمیان مغائرت کی ناقابل شکست دیواریں کھڑی ہوگئیں انھوں نے نہایت ژرف نگاہی سے جائزہ لے کر اور تجزیہ کر کے دکھایا ہے کہ ان دیواروں کی بنیاد بیشتر اسی لسانی پالیسی پر ہے جو انگریز نے نہایت معصومانہ اور مربیانہ انداز میں وضع کی اور جس کے اثرات ہم آج تک محسوس کر رہے ہیں

صوبوں کا الگ الگ جائزہ لیتے وقت ابتدا بنگال سے کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں وہاں کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ اور مسلمانوں کے مذہبی علوم عربی میں تھے۔ مقامی طور پر جو زبان استعمال ہوتی تھی وہ قدرتی طور پر ان دونوں زبانوں سے متاثر ہوئی۔ اس دور میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ پوتھیاں کہلاتی تھیں۔ اس پوتھی ادب میں کتابوں کے نام عربی اور فارسی کے تھے۔ زبان سب پوتھیوں کی یکساں تھی۔ اور ان میں عربی اور

فارسی کے الفاظ بکثرت تھے۔ چنانچہ بقول مولف موصوف:

"جن ہندو ادیبوں نے پوتھیاں لکھی ہیں انھوں نے بھی عربی اور فارسی الفاظ فراخ دلی سے استعمال کئے ہیں۔"

اسی لسانی یکسانیت کا اثر تھا کہ صوبہ کے مختلف طبقے اور فرقے ایک دوسرے سے بہت قریب آ گئے تھے۔ اور ان کے درمیان مغائرت کا عنصر تقریباً ختم ہوگیا تھا۔ لیکن انگریز کو یہ یکسانیت اور یگانگت اپنے مقصد کے موافق نظر نہ آئی۔ لہٰذا اس کا دور شروع ہوتے ہی ایک انقلابی رجحان پیدا ہوگیا۔ اس سلسلہ میں مولف نے ڈاکٹر انعام الحق کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

"بنگالی نظم و نثر میں سنہ ۱۸۰۰ء سے جو انقلابی رجحانات شروع ہوئے تھے وہ سنہ ۱۸۵۷ء میں اچھی طرح قایم ہو گئے اور چونکہ نیا ادب زیادہ تر ہندوؤں کا تخلیق کردہ تھا، اس لئے اس میں ان کے اصلی قومی اثرات داخل ہو گئے۔"

بنگال کے صدر مقام کلکتہ میں انگریزوں نے ہندو مسلم کی تفریق کو بڑھانے کے لئے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ڈالی اور اس کو سلطنت برطانیہ کے قیام و استحکام کے لئے ضروری سمجھا۔ چنانچہ جب کورٹ آف ڈائرکٹرز نے اس کالج کے قیام کی مخالفت کی تو ویلزلی نے ایک پرائیویٹ خط میں لکھا کہ:-

"کالج کو قائم رہنا ہوگا ورنہ سلطنت ختم ہو جائے گی"

غرض اپنی اس پالیسی کو جاری رکھتے ہوئے سنہ ۱۸۳۴ء میں لارڈ میکالے نے اظہار رائے کیا کہ:

"عربی و فارسی کی ترویج و اشاعت پر جو روپیہ صرف ہوا وہ بے کار گیا۔ گورنمنٹ ان اداروں کو حکماً بند کرنے کی مجاز ہے۔"

اس کی رائے کے وزن کو محسوس کرتے ہوئے ولیم بینٹنگ نے رزولیوشن کی شکل میں جن امور کی منظوری دی ان میں یہ بات بھی تھی کہ:

"جو رقم مندرجہ بالا تجویز کے نتیجے میں بچے وہ ہندوستان میں انگریزی لٹریچر اور سائنس کے فروغ پر خرچ کی جائے اور ذریعہ تعلیم انگریزی ہو۔"

لیکن یہ بات ناممکن العمل سمجھتے ہوئے کہ پوری قوم میں ایک دم انگریزی کو اس حد تک جاری و ساری کر دیا جائے کہ وہ نہد سے لے کر لحد تک ہر فرد کی زبان بن جائے اور وہ روزانہ زندگی کی ضروریات اور درس و تدریس میں کام آ سکے۔ ضروری سمجھا گیا کہ دیسی زبانوں کو بھی کچھ سہارا دیا جائے۔ لہذا خاص بنگال میں مسلمانوں کے اثر کو ختم کرنے کے لئے اول بنگلہ زبان کا رسم الخط بدلا اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے بنگالی ادب کو دفتر پارینہ کہہ کر ٹھکرا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو گئیں اور ہندو انگریز کا سہارا پا کر تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ زبان کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے دور میں جو ایک متحدہ اور مشترکہ تہذیب و تمدن اور کلچر پیدا ہوا تھا وہ پھر ہندوانی رنگ میں رنگتا چلا گیا۔

بہار کا جائزہ لیتے ہوئے گارساں دتاسی کے حوالہ سے لکھا ہے

"بہار میں ہندی کا چرچا حال میں نا جارہا ہے۔ کیونکہ وہاں کی سرکاری

زبان ہمیشہ فارسی رہی جسے ہندو مسلمان سب ہی سیکھتے تھے۔"

دوسری جگہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے الفاظ دہرائے ہیں:

"جب ملک کی متحدہ زبان کے رسم خط کو اردو ہندی کے دو حصوں میں بانٹ کر ملکی اتحاد کی رگ کے آخری قطرے کو بھی بہا دیا یا سنہ ۱۸۶۵ء میں بہار اور بنگال کی گورنمنٹ نے ہندی کو دفتروں کا خط قرار دیا اور اس اثنا میں یہاں بنگالی کی ہمسائیگی کے اثر سے انگریزی تعلیم کو روز افزوں ترقی ہوتی گئی تو اس زبان پر اس صدمہ میں مردنی چھا گئی۔ عدالتوں اور دفتروں کی ضرورت سے کون آزاد؟ ہندی رسم الخط نے عوام میں ہندوستانی (اردو) رسم خط کی جگہ لینی شروع کی۔ اور خواص میں جو دن بدن انگریزی تعلیم پر مٹے جاتے تھے، دیسی زبان کی یہ کیفیت قریب قریب پچاس ساٹھ برس رہی۔ اس طویل عرصہ میں بزرگوں کی ادبی دولت برباد ہو گئی اپنی زبان کی خدمت کا ولولہ جاتا رہا۔ صحیح زبان بولنے اور لکھنے کی دھن نہ رہی۔"

یو۔ پی کے تفصیلی واقعات بیان کرنے کے بعد مولف موصوف صوبہ پنجاب کا جائزہ لیتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

"سکھوں کے پچاس سالہ خون آشام دور میں پنجاب و سرحد کے مسلمانوں کو ہر لحاظ پر دردانگیز تباہیوں سے واسطہ پڑا۔ لیکن صرف ایک معاملہ میں وہ خوش قسمت رہے۔ یہ خوش قسمتی فارسی زبان کا خالصہ دربار کی زبان کے طور پر برقرار رہنا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منشی کے پیشہ میں مسلمانوں کا تھوڑا بہت وقار قائم رہا۔ اور فارسی لٹریچر کے سہارے مسلمانوں کا قومی و روحانی جذبہ بھی برقرار رہا۔ چنانچہ

جب انگریز پنجاب پر قابض ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ علمی کا میدان مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ مسلمان طلبا کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہندو طالب علموں کو بھی مسلم اساتذہ پر بے حد اعتماد ہے، وہ اسلامی مدارس میں بڑی کثیر تعداد میں فارسی پڑھتے ہیں، اگر اس چیز کو اسی حالت میں چھوڑ دیا گیا تو حکومت کی تمام طاقت مسلمانوں کے ہاتھ میں آجائے گی۔ یہ ایک ایسا سیلاب ہے جسے بہت جلد روکنے کی ضرورت ہے۔"

یہ حقیقت آشکارا ہو نے کے بعد ممکن نہیں تھا کہ فارسی کو قایم رہنے دیا جاتا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۸۴ء کی ایجوکیشن رپورٹ کے مطابق :۔

"پنجاب میں گورنمنٹ نے ابتدا ہی میں طے کر دیا تھا کہ ایک واحد زبان ایک ہی رسم الخط میں اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم ہوگی۔ چنانچہ اردو زبان فارسی رسم الخط میں اسکولوں کی زبان قرار دیدی گئی۔ اس سلسلہ میں اس وقت بمشکل ہی کوئی اختلاف موجود تھا۔ اگرچہ پنجاب کی بولی اردو سے خاصی مختلف تھی؛

لیکن اس میں بھی چونکہ یک رنگی اور یکسانیت پیدا ہونے کا خطرہ تھا اس لئے حالات کو اس نہج پر بھی قایم نہ رہنے دیا گیا اور فرق آہستہ آہستہ ابھرتا چلا گیا۔"

سندھ کی داستان بھی اسی قسم کی ہے۔ چنانچہ "فارسی کا دیس نکالا" عنوان دے کر مؤلف تحریر کرتے ہیں :

"صدیوں سے سندھی مسلمان اپنے دیگر ہموطنوں کے طرح عربی، فارسی تعلیم حاصل کر رہے تھے، اس لئے یکایک پوری قوم کی عادت اور ضمیر کو بدلنا آسان کام نہیں تھا، لہذا انگریزوں نے بڑے سلیقے سے آہستہ آہستہ قوم کا

مزاج بدلا۔ مثلاً سندھی بچوں کو فارسی زبان کی تعلیم سے ہٹانے کے سلسلہ میں مسٹر ایلیس نے لکھا ہے،، "چونکہ فارسی زبان میں علم و ادب ہے نیز زبان سرکاری فاتر کی زبان ہے اور سالہا سال سے ملک سندھ میں جاری رہی ہے اس لئے اگر اب ایسے اسکول قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی جن میں صرف دیسی زبان سکھائی جائے تو اس قسم کی کوشش ضرور ناکام ہوگی۔ اور اگر سندھی اور فارسی زبانوں کی تعلیم اسکولوں میں جاری کی جائے گی تو امید ہے کہ لوگ سندھی زبان پڑھنے لگیں گے ہاں اتنا ضرور ہے کہ جیسے جیسے سندھی زبان دفاتر کے کاربار میں رائج ہوتی جائے گی ویسے ہی بتدریج سندھی زبان عام لوگ پڑھنے لگیں گے۔"

عربی اور فارسی کی تعلیم کے لئے فیس مقرر کی جائے اور یہ شرط ہو کہ جب کوئی طالب علم سندھی زبان میں پوری لیاقت کا ثبوت دے تو اسے فیس دینے سے مستثنیٰ کیا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ صرف وہ لوگ فارسی پڑھیں گے جو فارسی کو بخیال اس کے علم و ادب کے سیکھیں۔ یا بطور ایک کمال کے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔" اسی طرح دیگر صوبجات کشمیر، راجستھان، دکن وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے مؤلف نے اس دلچسپ معلومات افزا مگر الم انگیز داستان کو نہایت دردمندی اور سوزِ دل سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے مواد کی فراہمی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ غالباً یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس روداد کو جس تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ اس کتاب میں دُہرایا گیا ہے اور ہر بات کو مؤثق و مستند بنانے کے لئے ہمعصر اور بعد کے مصنفین مورخین کے حوالے دیئے گئے ہیں، قبل ازیں کبھی پیش نہیں کیا گیا۔ امید ہے کہ یہ کوشش قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ واللہ الموفق و ھو المستعان

انتساب

اپنی اس ناچیز تالیف کو عمّہ محترمہ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں جن کو میں نے اس وقت لکھتے دیکھا جب میں طفلِ مکتب تھا اور مجھ میں جو بھی کچھ ناچیز صلاحیت اور جذبۂ قومی موجود ہے یہ سب اُن ہی کی بابرکت ذات اور غیر معمولی محبت کا صلہ ہے۔ فقط

سید مصطفیٰ علی بریلوی

۷۰ — ۱ — ۱۳

پیش لفظ

از مُصنّف

جب تک مغلوں کی حکومت میں استحکام رہا۔ کسی غیر ملکی طاقت کی یہ مجال نہ تھی کہ دم مار سکے۔ لیکن اورنگ زیب عالمگیر کے کمزور جانشینوں کے دور میں حالت بالکل بدل گئی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں اور فرانسیسیوں نے پر پُرزے نکالے اور وہ تجارت کے محدود دائرے سے قدم نکال کر سیاست کے میدان میں اپنی جولانیاں دکھانے لگے۔ اس دوڑ میں فرانسیسی پیچھے رہ گئے، انگریزوں نے میدان جیت لیا۔ اور پھر انھوں نے ملکی معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا۔ کچھ ہی دن بعد جب ان کے قدم جم گئے، تو انھوں نے مصلحت بینی کو پس پشت ڈال کر کھلم کھلا اپنی چیرہ دستیاں اور ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ چنانچہ وارن ہیسٹنگز نے نواب علی وردی خاں صوبہ دار بنگال کے ساتھ انگریزوں کا رویہ مندرجہ الفاظ میں بیان کیا ہے :

"ان انگریزوں کا رویہ نہایت غلامانہ اور ذلیل تھا۔ وہ حکومت وقت سے خائف رہتے تھے۔" [1]

---

[1] کتاب "وارن ہیسٹنگز اور انگریزی راج" از ای۔ پی۔ مون۔ مترجمہ سید اولاد علی گیلانی۔ کتاب منزل۔ لاہور۔ ص ۱،

ایسٹ انڈیا کمپنی کا بورڈ آف ڈائریکٹرز ہندوستان میں کمپنی کے اقتدار اعلیٰ حاصل کرنے کے خلاف تھا۔ لیکن اُن افراد کمپنی نے جو یہاں موجود تھے، اپنے ذاتی جذبے اور جوش میں وہ کچھ کر دکھایا جس کا عام حالات میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ کمپنی کے ملازم اگرچہ طرح طرح کے اخلاقی عیوب کا شکار تھے۔ لیکن ایک خوبی ان سب میں مشترک تھی اور وہ تھی اپنے ملک و قوم سے بلا شرط وفاداری۔ اس طویل دور میں ہمیں ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی۔ جہاں کسی ذمہ دار انگریز نے اپنے ملک اور قوم کے مفاد سے روگردانی کا مظاہرہ کیا ہو۔ اس کے برعکس برصغیر پاک و ہند میں "میر جعفروں" کی کمی نہیں رہی۔ سنہ ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی واقع ہوئی۔ یہ جنگ نتائج کے اعتبار سے تو یقیناً فیصلہ کن تھی۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو سپاہیانہ شہامت و شجاعت کے بجائے محلاتی سازشوں کا ایک افسوسناک مرقع معلوم ہوتی ہے۔

میر جعفر کے جانشین میر قاسم اور انگریزوں کے مابین "دوعملی" کے مسئلہ پر اُلجھاؤ ہوا ؎

غم صیاد و خوفِ باغباں ہے
دوعملی میں ہمارا آشیاں ہے

میر قاسم نے وہی کیا جو ایک محبّ وطن، خوددار اور بہادر شخص کو کرنا چاہیے تھا۔ جس کی بنا پر ایک دوسری جنگ کے اسباب پیدا ہو گئے۔ چنانچہ سنہ ۱۷۶۴ء میں جنگ بکسر واقع ہوئی۔ ایک طرف نواب شجاع الدولہ والیٔ اودھ، شاہ

عالم ثانی، قاسم علی خاں، اور دوسری طرف مٹھی بھر انگریز۔ باوجود زبردست لاؤ لشکر، شان و شوکت، دعویٰ بہادری اور دلیری، میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے یہاں نظم تھا، یہاں بدنظمی۔ اُن کے یہاں مقصد سے ہم آہنگی اور اتحاد باہمی تھا۔ اور یہاں جذبۂ اُخوت وامداد باہمی کا فقدان۔ ان سب باتوں نے انگریزوں کو کامیاب اور بامراد کیا۔ شاہ اودھ کو حکومت اور سلطنت تو واپس مل گئی لیکن انگریز کا قدم جم گیا اور بالآخر سنہ ۱۸۵۶ء میں سقوط اودھ کے ساتھ یہ باب بھی ختم ہو گیا میر قاسم علی خاں طبعی موت مر گئے، اور اس طرح غم دنیا اور غم دوران سے نجات پا گئے۔

شاہ عالم اولاً انگریزوں کے پنشن خوار نے پھر مرہٹوں کے۔ سلطنت کی حدود از دہلی تا پالم رہ گئیں۔ دوآبہ گنگا و جمنا میں ایک جہادی قوت روہیلوں کی رہ گئی تھی۔ سنہ ۱۷۷۴ء میں شاہ اودھ نواب شجاع الدولہ نے اپنی ناعاقبت اندیشی کی بنا پر انگریزوں سے اتحاد کر کے روہیلوں کی آزاد حکومت بھی ختم کرا دی۔ لیکن صرف چھبیس سال بعد ۱۸۰۱ء میں اضلاع روہیلکھنڈ پر انگریز قابض ہو گئے۔

دکن میں ٹیپو سلطان شہید نے خاصی قوت کا مظاہرہ کیا۔ لیکن جب نظام دکن اور مرہٹوں نے انگریزوں سے ساز باز کر لیا تو یہ بہادر بھی اپنے مشن میں ناکام ہو گیا۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد سنہ ۱۷۹۹ء میں یہ آخری سہارا بھی ٹوٹ گیا۔ لارڈ کارنوالس جس کے دور میں میسور کی آزاد مسلم ریاست کا خاتمہ ہوا۔ انگریزی اقتدار کا زبردست داعی تھا۔ اس کے جانشین لارڈ ویلزلی اور

لارڈ ڈلہوزی نے انگریزوں کی توسیع پسندی کی پالیسی کو تکمیل تک پہنچایا۔ سنہ ۱۸۵۷ء سے چند سال قبل ہی ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے، جن کے تحت کسی زبردست ہنگامے کے برپا ہو جانے کا خطرہ بعید از قیاس نہیں تھا۔ بغاوت کا زیادہ زور دوآبہ، دہلی اور نواحی علاقوں میں رہا۔ مسلمانوں کو شدید جانی، مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ صرف دہلی میں تقریباً ساڑھے ستائیس ہزار مسلمان پھانسی پر چڑھائے گئے۔ عام مقابلہ میں کتنے بہادر شہید ہوئے۔ ان کا کوئی شمار نہیں۔ اضلاع پنجاب و سرحد میں بظاہر امن رہا لیکن خون مسلم کی ارزانی میں یہ علاقہ بھی لالہ زار ہی نظر آتا ہے۔ سکھوں نے مجموعی طور پر قومی مفاد سے غداری کی۔ سرجان لارنس گورنر پنجاب اپنی یادداشت میں لکھتا ہے:

"جب میں گذشتہ چار ماہ کے واقعات پر نظر ڈالتا ہوں تو اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو بھی زندہ پاکر خدا کی مہربانی پر محو حیرت ہو جاتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری تباہی مقدر ہو چکی تھی کیونکہ اگر سکھ بھی ہمارے خلاف شامل ہو جاتے تو کوئی دنیاوی طاقت ہم کو بچا نہیں سکتی تھی۔ بادی النظر میں اس کوتاہ بینی اور قومی آزادی کے خلاف اتنے زور شور کے ساتھ کھڑے ہو جانے کی توقع کوئی بھی شخص ان سکھوں سے نہیں کرسکتا تھا۔ جو لوگ موقع واردات پر موجود تھے، ان کا بیان ہے کہ:

"یہ سوال کہ سکھ ہمارے ساتھ ہیں یا نہیں، مسلسل ہوا میں معلق رہا اور اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ خالصہ گروہوں

میں بعض محبانِ وطن سپاہیوں کے دماغ میں بغاوت کا خیال آیا لیکن وہ بغیر کسی لیڈر کے تھے۔ نیز ان کے دلوں میں مسلمانوں اور پوربیوں (ہندوستانیوں) کے خلاف نہ ختم ہونے والی آگ سلگ رہی تھی۔[1]

سکھوں کو مسلمانوں سے جو نفرت تھی اس کو انگریزوں نے بڑی حکمت عملی سے نہ صرف قایم رکھا بلکہ اپنے مقاصد کے تحت استعمال بھی کیا۔ ملاحظہ ہو:

"اس طرح دو طبقات کو ایک دوسرے کے خلاف تیغ پر آمادہ رکھنا۔ ایک قوم کو دوسری قوم یا عقیدہ والوں کے خلاف ابھار کر توازنِ قوت قایم رکھنا۔ ایسے عظیم مقاصد تھے، جو ڈپٹی کمشنر مسٹر ایف کوپر کو سونپے گئے"[2]

مندرجہ بالا پالیسی کے تحت صرف آٹھ سال قبل کے مظلوم سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے موقع پر انگریزوں کے حلیف اور دوست بن گئے جبکہ دیگر مقامات پر انگریزی قوت کا ساتھ دینے والے گردن زدنی قرار پائے۔ اس سلسلہ میں جو ہدایات پنجاب کے اعلیٰ انگریز افسران کو دی گئیں ان کا ایک نمونہ درج

---

[1] یہ اقتباس ہم نے کیپٹن ایسٹ وک سابق پولیٹیکل ایجنٹ اپر سندھ کی کتاب "تقاریر کیپٹن ایسٹ وک" سے لیا ہے جو غالباً سنہ ۱۸۶۵ء لندن میں چھپی تھی۔

[2] کیوبراؤن جلد اول بحوالہ "عظیم انقلاب سنہ ۱۸۵۷ء" از ڈاکٹر معین الحق صفحہ ۲۴۸

ذیل ہے:

"سپریم گورنمنٹ نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ ہندوستانی سپاہی برخاست نہ کئے جائیں۔ اور نہ ہی ان کو اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے کی اجازت دی جائے ان احکام پر سختی کے ساتھ عمل درآمد کا چیف کمشنر نے حکم دیا۔ جب سے بغاوت ہوئی ہے، ہم نے اس نسل (پوربیے) ہندوستانی جو زیادہ تر اودھ اور روہیل کھنڈ کے تھے) کے تقریباً پانچ ہزار افراد کو ختم کیا ہے۔ اگر ہمارے جنرل زیادہ قابل اور چالاک ہوتے تو ہم زیادہ بڑی تعداد کو مار دینے میں کامیاب ہوتے۔ فی الوقت ہم ان میں سے تقریباً انیس ہزار سپاہیوں کو اپنی سخت گرفت میں لئے ہوئے ہیں جب تک یہ لوگ کوئی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ ہم ان کو سزائے موت نہیں دے سکتے۔ ہم ان کو ہتھکڑی بیڑی ڈال کر جیل خانہ میں بھی نہیں ڈال سکتے۔ جب کہ بھی وہ واحد برتاؤ باقی ہے جو ان کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ تاہم ہم کو یقین ہے کہ ان میں سے بیشتر بغاوت کرنے کے واسطے موقع کے منتظر ہیں" ؎

ان بدنصیب مسلم مجاہدین کا حشر یہ ہوا کہ ان کی اکثریت یا تو انگریزوں اور سکھوں کی مشترکہ فوج سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئی یا ان کو نہتا کر کے کنٹونمنٹ کے علاقوں سے نکال دیا گیا۔ جوں ہی وہ باہر نکلے، مقامی پیشہ ور غنڈوں اور لٹیروں نے لوٹ مار کرنے کے بعد شہید کر دیا۔ صرف سیالکوٹ اور جالندھر کی فوجیں دہلی تک پہنچیں۔ اور دہلی کے دفاع میں شریک ہوئیں۔ چونکہ

؎ بغاوت پنجاب کا ریکارڈ جلد دوم ص ۳۶ مطبوعہ پنجاب گورنمنٹ پریس ۱۹۱۱ء

ہمیں اس مرحلہ پر تفصیلی واقعات بیان کرنا نہیں ہیں، اس لیے اس دردناک سرگزشت کو یہیں چھوڑتے ہیں۔

ہر تخریب میں تعمیر کا بھی ایک پہلو ہوتا ہے۔ چنانچہ قدرت کا ایک عجیب کرشمہ ہوا کہ سنہ ۱۸۵۷ء کی زبردست خانہ بربادی کے بعد ہندوستان کی حکومت براہ راست تاج برطانیہ کے تحت آگئی اور کمپنی کی انانیت کا خاتمہ ہوگیا یہ تبدیلی اگرچہ خاصی عظیم تھی۔ لیکن مسلمانوں کی حد تک حکومت کی پالیسی قطعاً تبدیل نہیں ہوئی۔ ان پر ہر قسم کی معاش کے دروازے بند ہوگئے ان کے مکتبی نظام کا خاتمہ کردیا گیا۔ جہالت اور نکبت ان کے واسطے مقدر ہوگئی دفاتر میں سوائے چپراس گیری کے کسی اور عہدے کے وہ اہل نہیں سمجھے جاتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ بقول سرسید آسمان سے آنے والی ہر بلا مسلمان کا گھر تاکتی تھی۔ ان حالات میں اچھے اچھے افراد نے خانہ نشینی اختیار کرلی۔ لیکن سرسید احمد خاں نے اس نازک مرحلہ پر قوم کی قیادت کا بیڑہ اٹھایا۔ اسباب بغاوت ہند لکھ کر اس وقت کے ماحول کو دیکھتے ہوئے بڑا دلیرانہ کام کیا۔ حقیقتاً سرسید پہلے بزرگ تھے جنھوں نے وقت کی نبض کو پہچانا اور انقلاب بذریعہ تعلیم کا نعرہ بلند کیا۔ ایک طرف تو وہ انگریزی علوم وفنون سیکھنے کے قائل تھے، دوسری طرف مسلم اقدار کی حفاظت کے واسطے سینہ سپر رہتے تھے۔ سرسید علیہ الرحمۃ کی مثال ایک ایسے ستارے کی سی ہے جو اندھیری رات میں بھولے بھٹکے مسافروں کی رہنمائی کرتا ہے۔ سنہ ۱۸۹۸ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو انگریز کی پالیسی کا رخ بدلا

ہوا تھا۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں تو وہ مسلمانوں کو بیخ و بُن سے اکھیڑ پھینکنے کی فکر میں تھا۔ لیکن سنہ ۱۸۹۰ء میں وہ ہندوؤں کی مدد سے مسلمانوں کے کلچر تہذیب اور زبان کو مٹانے پر تُلا ہوا نظر آنے لگا۔ جب تک سرسید زندہ رہے اپنی بساط کے مطابق مقابلہ کرتے رہے۔ یہ سرسید ہی کا فیض ہے کہ صوبہ یوپی اور عظیم صوبۂ پنجاب و سرحد میں اردو زبان بحال رہی اور اس طرح مسلم کلچر اور تہذیب و تمدن کو حیات نو میسر آ گئی۔ اگر بنگال و بہار اور سابق سندھ کی طرح ان دونوں صوبوں میں بھی انگریزی پالیسی کامیاب ہو جاتی تو آج نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔ سرسید کے انتقال کے بعد نواب وقار الملک اور نواب محسن الملک نے مسلمانوں کی قیادت سنبھالی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تقسیم بنگال عمل میں آئی اور لارڈ کرزن نے صوبۂ بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی اسکیم شائع کی تو نہ صرف بنگال کے ہندو بلکہ سارے ملک کے غیر مسلم اس خیال کے خلاف متحدہ مظاہرہ کرنے لگے۔ وجہ محض یہ تھی کہ اس ارادہ کی تکمیل کے نتیجہ میں ایک مسلم صوبہ معرض وجود میں آتا نظر آ رہا تھا۔ ان ایجی ٹیشن کرنے والوں کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ مسلمانان بنگال ماضی قریب میں کس طرح انگریزی استعمار کا شکار ہو چکے ہیں اور کس طرح ان کی معافیات، اوقاف اور زرخیز آراضیات چھینی جا چکی ہیں۔ لارڈ کرزن یہ تقسیم مسلمانوں کے آنسو پونچھنے .... اور محض بے وقوف بنانے کی غرض سے کر رہے تھے کیونکہ مسلم اکثریت کے اس صوبہ پر اپنی تعلیم اور دولت کی وجہ سے غیر مسلموں ہی کا غلبہ رہتا تھا لیکن بقول رئیس احمد جعفری :-

"وہ ہندو قوم جو سارے ہندوستان میں تقریباً تین چوتھائی کی

اکثریت رکھتی تھی مسلمانوں کی اکثریت کا یہ صوبہ اس اندیشہ سے گوارا نہ کرسکی کہ آج مسلمان پسماندہ اور مفلوک الحال سہی لیکن ایک ایسا وقت آسکتا ہے جب ان میں سیاسی شعور پیدا ہوگا۔" [۱]

سنہ ۱۹۰۶ء میں جب بنگال اور آسام ملا کر ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا گیا تو مسلمانوں میں قدرتی طور پر بیداری کے آثار پیدا ہوئے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کا اجلاس ڈھاکہ خواجہ سر سلیم اللہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اور اسی اجلاس میں مسلمانان ہند کی سیاسی قیادت کے واسطے آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں میں رابطہ و اتحاد قائم رکھنے کے واسطے ایک اخبار حکیم مولوی حبیب الرحمٰن خاں احسن کی زیر قیادت ڈھاکہ سے ماہنامہ "المشرق" جاری ہوا۔ رسالہ کے اغراض و مقاصد یہ بتائے گئے،

"المشرق" کی اشاعت سے غرض بنگال میں مسلمانوں کی قومی زبان اور انڈیا کی لنگوا فرانکا اردو کی توسیع و اشاعت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح کی تدبیر بتلانا اور رعایا و گورنمنٹ کے تعلقات میں غلط فہمیوں کے انسداد کی کوشش اور ہندوستانی برادران مذہب سے تبادلہ خیال کر کے ذریعہ رابطۂ اتحاد اور تعلقات اُخوت کو مضبوطی سے قائم کرنا ہے جو بلا اردو کے ناممکن ہے۔" [۲]

---

[۱] مقالہ "تاریخ پاکستان کی جھلکیاں" از رئیس احمد جعفری۔ روزنامہ انجام ۱۴ مئی سنہ ۱۹۴۹ء
[۲] مقالہ مشرقی پاکستان کا پہلا اردو جریدہ از سید وحید قیصر ندوی روزنامہ جنگ ۱۰ جون ۱۹۶۶ء

مسلمانوں کو علیحدہ صوبہ ملنے سے جو توقعات قایم ہوئی تھیں وہ ریت کے گھروندا ثابت ہوئیں اور انگریزوں نے ہندوؤں کی متشددانہ کارروائی کے آگے سپر ڈال دی۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال منسوخ ہوگئی اور مسلمانوں پر یاس کے بادل چھا گئے۔ اب مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے تین تحریکی مرکز بن گئے۔

۱۔ تحریک علی گڑھ
۲۔ تحریک دیوبند
۳۔ آل انڈیا مسلم لیگ۔

آل انڈیا مسلم لیگ اور تحریک علی گڑھ کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے، علی گڑھ کی تعلیمی تحریک سے متاثر ہوکر کئی مقامی تنظیمیں بھی اُبھریں جنھوں نے قابل تعریف کام کیا۔ مثلاً انجمن حمایت الاسلام لاہور اور سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی کی تحریک وغیرہ۔ جوں جوں مسلمانوں میں تعلیم پھیلتی گئی وہ برادران وطن اور انگریزوں کی چالوں کو سمجھتے گئے۔ پہلی جنگ عظیم۔ تحریک خلافت، شدھی سنگھٹن کی تحریکیں، نمک کی ستیہ گرہ سنہ ۱۹۳۶ء کے الیکشن، نیز اسی سال سنہ ۱۹۳۶ء میں مسلم صوبہ سندھ کی صوبہ بمبئی سے علیحدگی بھی مسلمانوں کی فتح کے مترادف واقعات ہیں۔ غرض ہر مرحلہ پر مسلمانوں کی سیاسی تربیت ہوتی گئی۔ بالآخر جنگی مصالح کے تحت انگریز ہندوستان چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ اور زبردست کشمکش کے بعد سنہ ۱۹۴۷ء میں قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں پاکستان قایم ہوگیا۔

انگریز کا قدم اگرچہ آج ہمارے درمیان نہیں ہے۔ لیکن اس نے جو آگ بھڑکائی تھی اس کے نتائج بد آج تک محسوس ہو رہے ہیں۔ لہذا اس وقت کے مسائل حل کرنے کے واسطے ہم کو اپنے ماضی قریب کو دیکھنا بھی لازمی امر ہے۔

کسی قوم کی زندگی میں رسم الخط اور زبان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے انگریزوں نے ہماری دکھتی ہوئی رگ کو ضرب پہنچائی۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے واسطے انگریزی زبان کو ذریعہ قرار دے کر ہمارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو مفلوج اور ذہنیت کو منقلب کر دیا۔ بقول پروفیسر حسن علی عبدالرحمٰن سابق وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی:

"سب سے بڑا صدمہ جو ہمارے تعلیمی نصاب کو پہنچا وہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دینے سے پہنچا۔ ہمارے استادوں اور طالب علموں کی برسوں کی محنت جس کو تحصیل علم میں صرف کرنا چاہیے تھا، محض ایک غیر زبان کی تحصیل میں رائگاں گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے طالب علموں کی اکثریت نے مقررہ مضامین اور کتب نصاب کو بغیر سمجھے رٹنے اور ایک رسمی امتحان پاس کر لینے کو تعلیم کا مترادف سمجھ لیا"

"اس تعلیم نے انھیں ایک سند تو دلا دی، اور سرکاری ملازمتوں کے ان کے لئے دروازے بھی کھول دیئے۔ لیکن علوم و فنون کے اصل خزانوں تک

ان کی رسائی ناممکن ہو گئی۔ سوچنے اور سمجھنے کی قوت کمزور
پڑ گئی۔ اور کسی علم یا فن میں جو اصلی لیاقت اور مہارت
پیدا ہوتی ہے وہ مفقود ہو گئی۔ یہی سبب ہوا کہ برائے نام
جدید علوم و فنون کے باوجود انگریزوں کے اقتدار کے
کم و بیش دو سو سالہ دور میں ہم کوئی موجد کوئی محقق
اور کوئی سائنس داں یا ماہر ایسا پیدا نہ کر سکے جو کسی حد
تک بین الاقوامی شہرت کا مالک ہوتا۔ ہماری تعلیم اور
ہماری تحقیق علمی دونوں کا معیار ایسا پست ہوا کہ ہم اپنے
سارے قدرتی ذرائع اور وسائل کے باوجود ترقی کی دوڑ
میں دنیا کے بعض بہت چھوٹے چھوٹے ملکوں سے پیچھے رہ گئے[1]

اسی طرح کا اظہار خیال ملک کے اور بھی کئی زعما اور مفکرین نے کیا ہے۔ ان سب کی روشنی میں اگر اس مسئلہ پر غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ انگریزی دور حکومت میں ہندی مسلمانوں کو جو جو نقصانات پہنچے ان میں سر فہرست انگریز کی لسانی پالیسی کا مسئلہ ہے۔ انگریز نے اپنی اس پالیسی کو مرکزی حیثیت دے کر ایک طرف اپنا سیاسی استحکام کیا دوسری جانب مسلمانوں کو خصوصاً ان کے ماضی سے بیگانہ ان کے مذہب سے ناآشنا اور صحیح تعلیم و تربیت سے محروم رکھا۔ اگرچہ اس پالیسی سے برادران وطن بھی متاثر ہوئے۔ تاہم انھوں نے خود کو بہت جلد اس سے ہم آہنگ

---

[1] خطبۂ استقبالیہ۔ کل پاکستان اردو تدریسی کانفرنس کراچی ۱۰ رجون ۱۹۶۷ء

کرلیا۔ کیونکہ انھیں فارسی کو چھوڑ کر انگریزی اختیار کرنی پڑی۔ علاوہ ازیں انھیں انگریزوں سے کافی مدت سے اختلاط ہونے کے سبب اجنبیت بھی نہیں رہی تھی بہرحال مسلمانوں کے لئے ایک عظیم سانحہ تھا۔ جس کے اثرات ان کی قومی زندگی کو بہت گہرائی تک متزلزل کر گئے۔

قیام پاکستان سے قبل مسلمانان ہند کو مندرجہ ذیل دو امور پر کامل اتفاق رائے تھا۔

(۱) پاکستان میں اسلامی نظام حکومت کا قیام۔

(۲) اور اس خطۂ زمین کی قومی زبان اردو ہونا۔

بدقسمتی سے پاکستان کے قیام کے صرف چند سال بعد ہمارا ملک صفِ اول کے دو قائدین سے محروم ہو گیا۔ ہماری مراد قائداعظم محمد علی جناح کی وفات اور قائدِ ملت لیاقت علی خاں کی شہادت سے ہے۔ ایسی ہمہ گیر۔ بالغ نظر شخصیتوں کی دائمی جدائی کی وجہ سے جو خلا پیدا ہوا وہ ایک نئی ابھرتی ہوئی نظریاتی سلطنت کے واسطے بہت نقصان دہ ثابت ہوا۔ اور سیاسی انتشار کے نتیجہ میں غیر ملکوں میں پاکستان کا وقار گر گیا ہندوستان پاکستان کے وجود کو مٹانے کی کوششوں میں سرگرم عمل ہو گیا اندرونی بے چینیوں میں بھی اسی مناسبت سے اضافہ ہو گیا۔ کہیں سنہ ۱۹۵۶ء میں ہم ایک دستور بنا سکے اس دستور کے بعض اہم امور میں ایک یہ تھا کہ بجائے ایک کے دو قومی زبانیں قرار دے دی گئیں۔ مارشل لا، کے نفاذ کے بعد ایک نیا دستور سنہ ۱۹۶۲ء میں قوم کو دیا گیا۔ لیکن اس معاملہ میں سابقہ دستور کا اتباع کیا گیا۔ یہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط یہ بات تو تاریخ ہی بتائے گی۔

البتہ یہ بات افسوسناک ہے کہ منفی سیاست پر ایمان رکھنے والے لوگ زور پکڑ گئے ہیں اور علاقائی زبانوں کی ترقی کی آڑ میں وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو نہیں کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ پاکستان کے نظریئے پر پختہ یقین رکھنے والا کوئی بھی ایماندار شخص کسی نوع سے علاقائی زبانوں کا مخالف نہیں ہے۔ کیونکہ اہل دانش کے نزدیک قومی زبان یا زبانوں کی افادیت سے قطع نظر مقامی زبانیں پاکستان کا عظیم سرمایہ ہیں۔ جن سے اعراض برت کر ہم قومی خودکشی کے مرتکب ہوں گے۔ اندریں صورت زبان کے مسئلہ پر علاقہ واریت کے جھگڑوں کا اٹھنا تعجب خیز ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کے نزاعی مسائل آج کل کی ہی پیداوار ہیں۔ یا ان کی کوئی تاریخ بھی ہے۔ یہ سوال اکثر ہمارے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ لیکن لاعلمی کی بنا پر ہماری زبان و قلم سے بعض ایسی باتیں نکل جاتی ہیں، جن کے خلاف جد وجہد کرتے کرتے ہمارے بزرگوں کی عمر یں بیت گئی تھیں۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ :-

۱۔ بنگالی مسلمانوں نے موجودہ بنگلہ رسم الخط اور ہندو بنگلہ کے خلاف اپنی بساط کے مطابق پندرہ بیس سال تک مسلسل آواز بلند کی تھی۔ جس کا نفاذ تقریباً سنہ ۱۸۷۰ء میں ہوا۔

۲۔ صوبہ بہار میں ہندی جبریہ دفتری زبان بنا دی گئی تھی۔ تقریباً چالیس سال کی کشمکش کے بعد مسلمانان بہار اردو کو ہندی کے ساتھ عدالتی و تدریسی زبان بنوا سکے۔ انفاذ تقریباً سنہ ۱۸۷۱ء اور تبدیلی سنہ ۱۹۱۱ء سر علی امام مرحوم کی خصوصی کوشش سے نتیجہ خیز ہوئی۔

۳۔ یو۔ پی کے مسلمانوں نے سر سید علیہ الرحمۃ، نواب محسن الملک اور وقار الملک کی قیادت میں زبردست جد وجہد کی۔ جس کے نتیجہ میں اردو سرکاری زبان کی حیثیت سے سنہ ۱۹۴۷ء تک قایم رہی۔

۴۔ صوبہ پنجاب و سرحد میں گورمکھی، پنجابی اور ہندی زبانوں کو کورٹ کی زبان قرار دلوانے کی زبردست کوششیں ہوئیں اور کم از کم تین بھرپور حملے ہوئے۔ لیکن مسلمانان پنجاب نے اس کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ اور اردو مسلسل اس صوبہ اور صوبہ سرحد کی تعلیمی اور دفتری زبان رہی۔

۵۔ صوبہ سندھ کے مسلمانوں کا فارسی عربی سے اتنا ہی گہرا تعلق تھا جتنا دیگر صوبجات ہندوستان کے عام مسلمانوں کا تھا۔ لیکن سنہ ۱۸۵۲ء میں انگریزوں نے اس تاریخی رشتہ کو منقطع کر دیا۔ مسلمانان سندھ نے اس سازش کے خلاف خاصی جد وجہد کی لیکن ناکام رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب قیام پاکستان عمل میں آیا تو سندھ بھی انتہائی پسماندہ صوبوں میں سے ایک تھا۔

اس کتاب کی تالیف کا مقصد مندرجہ بالا لسانی سیاست کی تاریخ پیش کرنا ہے۔ جو سبق آموز بھی ہے اور عبرتناک بھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ماضی قریب کی اس لسانی سیاست نے ہمارے موجودہ سیاسی رجحانات پر گہرا اثر ڈالا ہے لہٰذا اس میدان سے اعراض خطرناک نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔

یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ کسی قوم میں حقیقی قومیت کا اس وقت تک احساس پیدا نہیں ہوتا جب تک کہ اس قوم کی علیحدہ زبان، رسم الخط

اور روایات نہ ہوں۔ انگریزوں نے ہندوؤں میں قومیت کا احساس پیدا کرنے کی غرض سے سنسکرت زبان کو زندہ کرنے کی سعی لاحاصل کی۔ اور نئی ہندی کو جنم دیا۔ بنارس اور کلکتہ میں ہندو مسلمانوں کی علیحدہ علیحدہ درسگاہیں بنا کر مختلف نقطہ ہائے نگاہ کی پرورش کی۔ سرایڈورڈ آرنلڈ لارڈ ڈلہوزی کے دور کا حال لکھتے ہوئے رقمطراز ہے:

"ہم ہندوستان میں ایک قوم بنا رہے ہیں، یہاں اب تک ہزاروں قبائل تھے مگر ایک واحد قوم نہ تھی"

انگریزوں کا ہندوؤں میں جذبۂ قومی کا احیا کرنا بادی النظر میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ لیکن در اصل یہ مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک زبردست اکثریتی قوت کو لانے کا پروگرام تھا۔ طویل مسلم عہد حکومت میں اگرچہ مسلمانوں نے ہندوؤں کی بنیادی ہیئت کو نہیں بدلا۔ لیکن فارسی زبان کی وجہ سے ہندو مسلمانوں میں ایک خاص وحدت فکر پیدا ہو گئی تھی۔ بقول جسٹس سید محمود:

"مسلمانوں نے اپنی سلطنت کے زمانہ میں ہندوؤں کے کیریکٹر میں کوئی تبدیلی نہیں کی بلکہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔"

لیکن مسلمانوں کے مندرجہ بالا احسان کا برادران وطن کی طرف سے مناسب جواب نہیں ملا۔ ان تفصیلات سے قطع نظر صرف صوبہ بنگال میں مسلم کش پالیسیوں کے نتیجہ میں مسلمان قوم کس حال پر پہنچا دی گئی اس کی داستان شیر بنگال مولوی فضل الحق مرحوم و مغفور کی زبان سے سنیئے:-

"جنگ پلاسی کے بعد سے آج تک حکومت برطانیہ کی مسلمانوں کی تعلیم سے مجرمانہ غفلت بلکہ مسلمانوں کی بربادی و تباہی اور خرابی کی بنیاد پر دیگر جماعتوں کی ترقی کی عمارت کھڑی کرنے کی پالیسی نے مسلمانان بنگال کو آسمان حکومت و ریاست سے گرا کر خاکِ مذلت و مسکنت میں ڈال دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تک مسلمانان بنگال اپنی اصلی حالت میں نہیں آسکے۔ اور اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو سکے"

مندرجہ بالا پالیسی کے نفاذ میں برادران وطن نے انگریزوں کی ہر طرح مدد کی۔ کچھ اسی قسم کی دل خراش داستان خفیف سے تغیر و تبدل کے ساتھ دیگر صوبوں کی بھی ہے۔

اب پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ماضی کے ان تلخ تجربات کی روشنی میں کیا پاکستان کی اسلامی ریاست کو خدانخواستہ ثقافتی انتشار کا شکار بننے دیا جائے گا۔ اور اہل فکر و دانش بے فکر بیٹھے رہیں گے۔ تاہم یہ خوشی کی بات ہے کہ موجودہ حکومت اس بارے میں واضح پالیسی اختیار کر رہی ہے اور مجوزہ نئی تعلیمی پالیسی کے تحت بنگلہ اور اردو مقررہ مدت میں قومی و تعلیمی زبان بنانے کے مبارک اقدامات پر غور کر رہی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ عوام و خواص کو پاکستان میں اب وہ مشکلات درپیش نہیں ہیں جو ابتدائی ایام میں پیش آئیں۔ ایک متوسط الحال شخص کو علمی خزانوں تک پہنچنے میں فرصت اور سہولت کی جو شدید الجھنیں پیش آتی ہیں راقم السطور بھی ان سے

مبرا نہیں ہے۔ بعض صوبوں کے واقعات طویل ہو گئے ہیں۔ لیکن بعض صوبوں مثلاً سرحد، بلوچستان اور کشمیر کے حالات مختصر ہیں جس کے سلسلے میں ہماری مجبوریوں کو بڑا دخل ہے۔ ایک قومی فرض کی تکمیل کی خاطر جتنا کام ہو سکا ہے وہ حاضر ہے۔ امید ہے کہ اہل علم و نظر اس کاوش کو شرفِ قبولیت بخشیں گے اور اگر کسی خیال سے اختلاف ہو یا کوئی بات خلاف واقعہ نظر آئے، تو مصنف کو مطلع فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

چونکہ یہ کتاب ملک کے ایک انتہائی نازک نیز اہم مسئلہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے بطور پیش بینی و نظر ثانی اس کے مسودات اپنے بزرگ جناب مرزا علی اظہر برلاس اور برادر مکرم جناب ثناء الحق صدیقی کی خدمت میں پیش کئے گئے تھے۔ میں ہر دو حضرات کا بدل شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے نہ صرف اپنے تاثرات قلم بند فرمائے، بلکہ بعض کار آمد مشورے دیکر کتاب کی علمی حیثیت کو بلند کیا۔

جس وقت راقم السطور یہ کتاب مکمل کر رہا تھا اسی دوران میں محبِ گرامی جناب فرہاد زیدی صاحب روزنامہ حریت کراچی نے راقم سے اردو زبان اور پاکستانی صوبوں کے تاریخی و سیاسی تعلق کے متعلق لکھنے کو ارشاد فرمایا۔ چونکہ کتاب اور اخباری مضامین کے مزاج میں فرق ہوتا ہے، لہٰذا مجھے نئے سرے سے مطالعہ کرنا پڑا اور اس طرح غیر ارادی طور پر کتاب میں متعدد نئے اضافے ممکن ہو گئے۔ اس سلسلہ میں جناب زیدی صاحب و برادرم عبدالکریم عابد صاحب میگزین ایڈیٹر حریت کا شکر گذار ہوں۔

آخر میں جناب پروفیسر حامی الدین خاں صاحب جے پوری، مولوی حمید اللہ خاں صاحب نجیب آبادی اور جناب حکیم ریحان الزماں صاحب کا ممنون ہوں۔ کیونکہ ان اصحاب نے کسی نہ کسی شکل میں راقم السطور کو اس ناچیز تالیف کے دوران مدد دی۔ فقط

سید مصطفیٰ علی بریلوی

کراچی ۷ر جنوری سنہ ۶۰

باب ۱
زبان اور رسم الخط

قوموں کی زندگی میں زبانوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ زبان دراصل وہ آئینہ ہے جس میں کسی قوم کے افکار و خیالات، تہذیب و معاشرت اور عقائد و نظریات پوری طرح منعکس ہوتے ہیں۔ زبان محض روزمرہ کی زندگی میں کام آنے والا ہی ایک آلہ نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے ماضی، حال اور مستقبل تینوں ادوار کی محافظ و امین ہوتی ہے۔ اسی سے قوم کے افراد کے خیالات میں یکرنگی و ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ اسی سے ایک دوسرے کے دل میں مہر و محبت کے جذبات نشو و نما پاتے ہیں اور آپس کی ہمدردی اور یگانگت اسی کی رہین منت ہیں۔ غرض مختلف قلوب کو ملانے اور خیالات میں یکسانیت پیدا کرنے میں اس کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا جادو ہے جس سے اغیار کو بھی رام کر لیا جاتا ہے۔ زبانوں کی یکسانیت دور افتادہ لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب لے آتی ہے اس کے برعکس زبانوں کے اختلاف سے اپنے غیر ہو جاتے ہیں۔ مذہب کا رشتہ اگرچہ بے حد مضبوط ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات زبان کے اختلاف کی وجہ سے وہ بھی کمزور پڑ جاتا ہے اور ہم مذہبی کا جو اثر ہونا چاہیے وہ قائم نہیں رہتا۔

دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ کو سامنے رکھ لیجئے اور دیکھئے کہ ان کے لئے اسلام کا رشتہ سب سے زیادہ مضبوط ہے لیکن یہ رشتہ اس وقت تک جتنا مضبوط رہا جب تک تمام مسلمانوں کی زبان عربی رہی اتنا اس وقت استوار نہیں رہ سکا جب مختلف ممالک میں مختلف زبانیں کام میں لائی جانے لگیں اس نکتہ کو ابتدائے اسلام میں بخوبی سمجھ لیا گیا تھا۔ لہٰذا ان ممالک میں بھی جہاں کی زبان عربی نہیں تھی رفتہ رفتہ اسی زبان کو رائج کیا گیا اسی کا نتیجہ ہے کہ امتدادِ زمانہ کے باوصف ان ممالک میں اسلام آج بھی قایم ہے۔ اور کئی ممالک اس وقت بھی عربی کو اپنی قومی زبان بنائے ہوئے ہیں۔

رسم الخط کا مسئلہ بھی زبان سے کچھ کم اہم نہیں ہے۔ رسم الخط اور زبان میں جسم و جان کا سا تعلق ہے۔ ہر زبان کا رسم الخط اس زبان کے مزاج کے عین مطابق ہوتا ہے۔ کسی زبان کی مختلف خصوصیات کو اس کا اپنا رسم الخط ہی کچھ اچھی طرح ظاہر کر سکتا ہے۔ دوسرا کوئی رسم الخط اس زبان کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ بہت سے مخارج اور آوازیں جو کسی مخصوص زبان سے تعلق رکھتے ہیں ان کو اسی زبان کا رسم الخط بخوبی ظاہر کر سکتا ہے۔ دوسرا رسم الخط اس معاملہ میں ناکام رہتا ہے۔ رسم الخط کی تبدیلی کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس زبان کی اپنی خصوصیات فنا ہو جائیں۔ اور زبان کا اپنا اسلوب اور مزاج بگڑ جائے۔ یہ بگاڑ بعض اوقات اتنا مہلک ثابت ہوتا ہے کہ اس کی بنا پر وہ زبان فنا کی منزل پر جا پہنچتی ہے۔ چنانچہ جب انگریزوں کا ورود برصغیر میں ہوا۔ اور انھوں نے اپنی بعض مصلحتوں کی بنا پر اردو زبان سیکھنی شروع کی تو ابتداءً

انھوں نے اس زبان کے لئے رومن رسم الخط استعمال کیا۔ لیکن جلد ہی انھیں اس کے نقائص کا احساس ہوگیا۔ اور اُردو زبان کے ساتھ اس کے مخصوص رسم الخط فارسی کو سیکھنا ضروری سمجھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اردو زبان اپنی خصوصیات کو برقرار رکھے رہی۔ اور آج بھی رکھے ہوئے ہے۔ اگر اس وقت مستقلاً رومن رسم الخط اختیار کر لیا جاتا تو اب تک اگر اس زبان کا وجود ختم نہ ہو گیا ہوتا تو کم از کم اس کی صورت ضرور مسخ ہو چکی ہوتی۔

اپنے اس بیان کی تائید میں کہ زبان اور رسم الخط کو قوموں کی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے ہم بعض ماہرین لسانیات اور مفکرین کے چند اقتباسات ذیل میں درج کرتے ہیں۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کا ارشاد ہے کہ

"زبان اپنے بولنے والوں سے اس طرح وابستہ ہے کہ وہ کسی وقت اور کسی حال میں ان سے جدا نہیں ہو سکتی۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہر وقت ان کی ہمدم ہے۔ ان کی تہذیب اور تعلیم و تربیت کا یہی ذریعہ ہے۔ زبان کا حشر وہی ہوگا جو اس کے بولنے والوں کا۔ اس کا بنانا اور بگاڑنا ہمارے ہاتھ میں ہے۔ گزشتہ زمانہ میں جیسا کہ ہم نے اسے بنانا چاہا ویسی ہی بنی اور آیندہ بھی جیسا اسے بنانا چاہیں گے ویسی ہی بن جائے گی۔"[1]

---

[1] خطبۂ صدارت مولوی عبدالحق سالانہ اجلاس انجمن حمایت اسلام لاہور ص ۱۷۔ ۱۹۴۱ء

یہی بات شمس العلماء مولانا محمد امین عباسی چڑیا کوٹی اس طرح بیان کرتے ہیں :-

"اقوام عالم کی ترقی اور پستی کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر زبان اُس قوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہے جس میں وہ زبان رائج ہے۔ جس قوم کی جو زبان ہے۔ جب تک وہ قوم زندہ ہے، زبان بھی زندہ ہے۔ کسی قوم کا انحطاط شروع ہوتا ہے تو زبان بھی مائل بہ زوال ہو جاتی ہے۔ اسی اصول کے ماتحت جس طرح نظام قومی میں انقلابات اور تغیرات ہوتے ہیں اسی طرح زبان بھی اپنے اصل مبدا سے آگے بڑھتی ہے، تو اس میں بھی انقلابات لازم ہوتے ہیں اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ ہر قوم کی حیات اس کے لٹریچر کی زندگی سے وابستہ ہے۔ نظام قومی میں جب انقلاب و تغیر پیدا ہوگا تو اس قوم کا لٹریچر بھی اسی سانچے میں خود بخود ڈھل جائے گا۔ اس کی واضح دلیل زبان عربی کے لٹریچر کا انقلاب ہے جو اسلام کے بعد پیدا ہوا" [1]

ڈاکٹر زبیر نے مندرجہ بالا دونوں رایوں کا نچوڑ اس طرح پیش کیا ہے:

"اور جب قومی اور ترقی یافتہ قوم کے ساتھ حکومت کی طاقت

---

[1] مقالہ تدریس اُردو بحوالہ کتاب "تعلیم و تعلّم"، مرتبہ سید الطاف علی بریلوی صفحہ ۹۶

اور مذہبی جوش وخروش بھی شامل ہو تو اُس کی زبان سے صرف
اس کے زمانے ہی کی دوسری قوم کی زبان متاثر نہیں
ہوتی بلکہ بعض قدیم تر اور ترقی یافتہ زبانیں بھی متاثر
ہوتی ہیں۔" [۱]

سر مطیع الرحمٰن کا قول ہے کہ
"فاتحین کی زبان رائج کرنے سے مفتوحہ علاقوں پر دیر
تک حکومت کی جا سکتی ہے۔" [۲]

زبان کی مندرجہ بالا مسلمہ حیثیت سیاسی اعتبار سے فاتح اقوام اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ لہٰذا سب سے پہلے مفتوح اقوام کو قطعاً بے بس کرنے کے واسطے ان کی زبان اور تعلیمی نظام پر ہاتھ ڈالا جاتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند پر جب انگریزوں نے قبضہ و اقتدار حاصل کیا تو مندرجہ بالا نظریات کے تحت انھوں نے سب سے پہلے زبان کے مسئلہ پر توجہ کی۔ ملاحظہ ہو:

"کمپنی کی عمل داری کے دوسرے پچاس سال میں دفتری
سیلاب کی رفتار ابتدا میں سست تھی۔ مگر مسلسل بڑھتی گئی
کیونکہ اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ بجائے سلمان

---

۱ مقالہ فارسی زبان کا اثر ہندوستانی زبانوں پر عموماً اور بنگالی زبان پر خصوصاً
"معارف" اعظم گڑھ ص ۲۴۵

۲ "رپورٹ السنۂ شرقیہ کاملہ"

از مطیع الرحمٰن قریشی (ملتان)

فاتحوں کی اجنبی زبان کے دیسی (یعنی بنگالی) زبان میں دفتر رکھا جائے۔ تب سے ہندوؤں کا غلبہ شروع ہوا اور اس وقت سے سرکاری ملازمت کے ہر درجہ میں ہندو ہی ہندو بھر گئے" لے

فاضل اجل مولانا سید سلیمان ندوی نے انگریزوں کی لسانی پالیسی کی تشریح کرتے ہوئے کیا خوب نتائج اخذ کئے ہیں:-

" ابھی اٹھارویں صدی بھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ فرنگی جادوگروں کے منتر سے اردو اور ہندی کے دو خاکی پُتلے فولادی سپاہی بن کر ملک کے طول و عرض میں مرنے کٹنے لگے۔ ہندو بھائیوں کے دلوں میں یہ خیال زور پکڑنے لگا کہ اب جب مسلمانوں کی سلطنت کے دباؤ سے وہ آزاد ہو چکے ہیں تو ہم کو اسلامی اثر کی ہر چیز سے آزاد ہونا چاہیے اس بنا پر انگریزوں کی تفریق کی سیاسی تحریک بہت زیادہ کارآمد ثابت ہوئی اور سب سے پہلے اس کا اثر زبان کے معاملہ میں ظاہر ہوا اور ہندی کے نام سے ایک زبان کی تبلیغ شروع ہوئی اور بعض صوبوں میں یہاں تک کیا گیا کہ اردو رسم الخط تک عدالتوں سے خارج کر دیا گیا۔"

ہمارے وطنی بھائیوں نے اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لیا

لے بحوالہ کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" از ڈبلو ڈبلو ہنٹر۔

ہے کہ قوم کی پیدائش اور ترقی میں اس کی زبان کو کس درجہ اہمیت حاصل ہے۔ انسان جانور وں کو لگام لگا کر اپنا تابعدار بناتے ہیں. لیکن جب ایک قوم دوسری قوم کو اپنا تابعدار بناتی ہے تو گو اس کے منھ میں لوہے کی لگام نہیں لگاتی تاہم اس کے منھ میں ایک لگام لگا دیتی ہے جس کا نام "بدیسی زبان" ہے۔ انسان کے تمام اعمال اس کے خیالات کے ماتحت ہیں۔ خیالات کی روح الفاظ کے جسم میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ الفاظ زبان کا دوسرا نام ہیں، اس لئے کسی قوم کی زبان کے معنی ہیں اس قوم کا تمدن و تاریخ، مذہب و جذبات ہر چیز"[۱]

آخر میں ہم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے زبان و رسم الخط کے بارے میں خیالات پیش کرتے ہیں :-

"ایک قوم کی زبان اور اس کا رسم الخط اس کی تہذیب اور اس کی قومیت کی بقا و فنا میں فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔ کسی قوم کو اگر آپ دوسری قوم میں تبدیل کر دینا چاہیں تو اس کی زبان اور رسم الخط کو بدل دیجیے۔ رفتہ رفتہ وہ خود بخود دوسرے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی۔ اس کی آنے والی نسلوں کا تعلق اپنے اسلاف سے منقطع ہو جائے گا

---

[۱] بحوالہ کتاب "نقوش سلیمانی" ص ۶۹ — ۶۸

اور وہ بالکل نئی ذہنیت، نئے افکار اور نئی صورت قومی لے
کر اُٹھے گی۔ جن جن لوگوں نے قوموں کے بنانے اور بگاڑنے
کا کھیل کھیلا ہے ان سب نے یہی ہتھیار ضرور استعمال کیا
ہے۔ زار روس کی حکومت نے اپنے امپیریلزم کی بنیادیں
مستحکم کرنے کے لئے، روسی زبان اور رسم الخط کو تمام غیر روسی
قوموں پر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ یہ سب قومیں روسی
بن جائیں۔"

"یہی پالیسی فرانس نے شمالی افریقہ میں اختیار کی۔
وہاں عربوں اور بربریوں کو فرانسیسی قومیت میں ڈھالنے
کے لیئے ساری طاقت اس پر صرف کی جا رہی ہے۔ (اب الجزائر
آزاد ہوگیا ہے اور کہانی بدل گئی ہے) کہ عربی زبان اور رسم
الخط کو مٹا دیا جائے۔" [1]

زبان اور رسم الخط کا عام طالب علموں کی صلاحیتوں پر بہت گہرا اثر پڑتا
ہے۔ مسٹر کارگل پرنسپل دلّی کالج نے ۱۸۵۲ء کی رپورٹ میں تحریر کیا ہے کہ "مشرقی
شعبہ کا طالب علم اپنے مغربی شعبہ والے حریف سے سائنس میں کہیں بڑھا ہوا ہے"
(بحوالہ کتاب "دلّی کالج"
از مولوی عبدالحق)

---

[1] کتاب تحریک آزادیٔ ہند ص ۳۶ ۲۴ - از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی - شائع کردہ اسلامک
پبلیکیشنز ڈھاکہ - مرتبہ جناب خورشید احمد۔

وحدت قومی اور رسم الخط

سطور بالا میں ہم نے مشہور و بالغ نظر مفکرین کی آراء کی روشنی میں زبان اور رسم الخط کے مسئلہ کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ وحدت قومی اور رسم الخط کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ذیل میں ہم اس بارے میں مشہور ماہرین لسانیات اور اکابرین ملت کے خیالات پیش کرتے ہیں۔ عربی رسم الخط مسلمانان عالم کی حیات قومی میں ہمیشہ ایک نمایاں کردار ادا کرتا رہا ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلے مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری کو سنیئے:۔

"قرآن شریف عربی زبان میں ہے۔ اس کے حروف (رسم خط) عربی ہیں۔ مسلمانوں نے ابتدا ہی سے قرآن کی اصل زبان (عربی) اور اس کے حروف کو برقرار رکھا۔ اگرچہ انھوں نے سمجھنے سمجھانے کے لئے قرآن شریف کے دوسری زبانوں میں ترجمے بھی کئے۔ لیکن عیسائیوں کی طرح ان ترجموں پر انھوں نے تکیہ نہیں کیا۔ وہ نمازوں میں اصل عربی قرآن شریف پڑھتے رہے اور اپنے بچوں کو عربی قرآن پڑھاتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان اپنے دینی مرکز یعنی بیت اللہ سے جسے خود قرآن نے مَثَابَۃً لِلنَّاس مسلمانوں کا مرکز بنایا تھا، دور ہونے کے باوجود اس سے وابستہ رہے اور ان کا عرب کی زبان اور اس کے رسم تحریر سے تعلق منقطع نہ ہوا۔ جو قرآن شریف کے ترجموں پر تکیہ کرنے کے بعد ہرگز قائم نہ رہتا۔ مسلمان دنیا کے جس گوشہ میں بھی ہوں عربی کو اپنی قومی زبان اور عربی حروف کو اپنے ہی اور قومی حروف سمجھتے ہیں۔ ان کا

متا تا اپنے مرکز یعنی بیت اللہ سے عربی حروف ہی کی وجہ سے قایم ہے"

" ہندوؤں میں عقائد و خیالات اور اختلاف زبان کے باوجود کس چیز نے رشتۂ اتحاد مضبوط رکھا اور اختلاف زبان و مکان کے ہوتے ہوئے بھی یہود کو کس چیز نے ایک مستحکم حکومت کے قیام پر ابھارا؟ ان سوالوں کا جواب ایک ہے۔ ہندوؤں کو سنسکرت زبان اور دیوناگری حروف نے اور یہودیوں کو عبرانی زبان اور عبرانی حروف نے۔ براؤن نے ایک مقام پر رسم خط کی مذہبی اہمیت جتاتے ہوئے لکھا ہے کہ یہودیں کامل اتحاد و یکجہتی عبرانی حروف کی وجہ سے ہے۔ یہودی ایران کا ہو یا ترکستان کا۔ عرب کا ہو یا افغانستان کا وہ اپنی مادری زبان کو عبرانی حروف میں لکھنا پسند کرتا ہے" [1]

جناب مخمور اکبر آبادی اپنی مشہور تالیف - اردو زبان اور اسالیب میں زبان کے نازک مسئلہ کی صراحت فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں، کہ

" ہر زبان کو اپنی موروثی زبان سے جو اس سے قدیم تر ہوتی ہے ایک تبرکی لگاؤ ہوتا ہے۔ پرانی زبان مستند اور نئی کا ماخذ ہوتی ہے۔ اور اس کی کلاسکس کہلاتی ہے۔ کلاسکس کے الفاظ، ترکیبیں، جملے، فقرے، محاورے، اشعار اور ضرب الامثال نئی زبان میں بسا اوقات جوں کے توں رائج ہو جاتے ہیں۔ اردو کو بھی واسطہ اپنی کلاسکس عربی و فارسی

---

[1] کتاب "لسانی مسائل" از ڈاکٹر شوکت سبزواری صفحات ۳۲-۳۴

اور اپنی بہن برج بھاشا کے ساتھ رہا ہے۔ اردو تحریروں میں
ان زبانوں کے اجزا کی بڑی تعداد موجود ہے۔" [۱]

بعض اچھے پڑھے لکھے اشخاص بھی بعض اوقات رسم الخط کو ضمنی حیثیت دینے لگتے ہیں اور تاریخی شواہد سے سراسر رُوگردانی کرتے ہوئے اس مسئلہ کی اہمیت گھٹانے کے لئے ناکام کوشش کرتے ہوئے سیاسی سمجھوتہ بازی کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ ایک معمولی سی بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ رسم خط کا فرق ایسا ہی ہوتا ہے جیسے یورپ اور افریقہ کے انسان میں ظاہری اور باطنی طور پر پایا جاتا ہے۔ مثلاً شیخ ممتاز حسن جونپوری مرحوم جن کا خط و خطاطی کے موضوع پر اساطین ادب میں شمار ہوتا ہے۔ ہندی رسم الخط اور نستعلیق کے عنوان پر لکھتے ہیں:

"ہندی نستعلیق خط اور ایرانی نستعلیق خط کی شانِ تحریر میں فرق ہے اور یہ فرق قریب قریب اسی طرح کا ہے، جیسے ہندوستانی آدمی اور ایرانی النسل انسان کی صورت اور شان کا فرق ہوتا ہے۔ یہ ایک فنی بات ہے۔" [۲]

مشہور عالم مولانا محمد ابن عباسی (شمس العلما) جن کا قول ہم ابھی درج

---

[۱] صفحات ۲۳-۲۴۔ "اردو زبان و اسالیب" مصنفہ سید محمد محمود رضوی مخمور اکبر آبادی مطبوعہ ۱۹۶۱ء۔

[۲] بحوالہ کتاب "خط و خطاطی"۔ ص از ممتاز حسن جونپوری پروفیسر محمد ایوب قادری شائع کردہ اکیڈمی آف ایجوکیشنل کانفرنس آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی۔

کر چکے ہیں ایک اور جگہ لکھتے ہیں :- کہ

"علمائے اسلام نے مسئلہ لسانیات پر کافی غور کیا تھا۔ آخر اس نکتہ پہ پہنچے کہ ہر زبان کا رسم الخط اس زبان کی روح رواں ہے جب تک اس زبان کا رسم الخط باقی ہے وہ زبان باقی ہے۔ فارسی قدیم زبان پہلوی بائیں جانب سے لکھی جاتی تھی تمام ایرین زبانوں کی طرح لیکن مسلمانوں نے اس ملک کو فتح کیا تو پہلے اس زبان کے رسم الخط کو بدل کر عربی رسم الخط کیا۔ جس سے پہلوی زبان مٹتے مٹتے فنا ہو گئی اور اس کی جگہ عربی آمیز فارسی مروج ہو گئی۔ انھیں عربی حروف کی وجہ سے عربی الفاظ دخیل ہو گئے اور زبان فارسی کی کایا پلٹ ہو گئی۔ قدیم پہلوی رسم الخط[1] اس طرح فنا ہوا

---

[1] پہلوی زبان کے زوال کے بارے میں ڈاکٹر زبیر صدیقی صاحب نے "معارف" اعظم گڑھ بابت اپریل ۱۹۵۸ء میں تحریر فرمایا ہے کہ :

"اسلامی فتوحات کے بعد عربی زبان کا اثر ایرانی زبان پر اتنا گہرا اور وسیع ہوا کہ پہلوی اور اسلامی فارسی کے متعلق دو مختلف الاصل زبان ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ اسلامی فارسی زبان کا رسم الخط اس کا طرز بیان اور اس کا سارا ادب نئے انداز میں ڈھل گیا۔ اگرچہ اس میں بھی شک نہیں کہ عربی زبان و ادب پر بھی پہلوی زبان کا اچھا خاصا اثر پڑا۔ بیسیوں ایرانی الاصل الفاظ عربی زبان میں داخل ہو گئے اور آٹھویں اور نویں صدی کی عربی شاعری بھی ایرانی خیالات اور طرز ادا سے کافی متاثر ہوئی"

کہ اب ایران میں اس رسم الخط کا پڑھنے والا یا اس قدیم پہلوی زبان کا سمجھنے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ اگرچہ ہوں گے تو ان کا شمار انگلیوں پر ہو سکتا ہے۔ یہ وہ نکتہ تھا کہ جس سے زبان عربی ایران سے فنا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح جب مسلمانوں نے مصر فتح کیا تو وہاں کی زبان کو بدلا۔ عربی مصر کی زبان ہو گئی۔ اس وقت مصر میں عربی کی جس قدر ترقی ہے خود حجاز میں جو عربی کا گہوارہ تھا، یہ ترقی نہیں ہے۔ بعینہٖ یہی حالت اردو کی پنجاب میں ہے۔ اردو کی جتنی اشاعت پنجاب میں ہے وہ لکھنؤ میں، جو اردو کا مرز و بوم ہے نہیں ہے۔"[1]

رسم الخط کی تبدیلی کے ہولناک نتائج

مندرجہ بالا معروضات کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ رسم الخط اور زبان کی تبدیلی کا قوموں کی زندگی پر بہت گہرا اور دور رس اثر پڑتا ہے۔

مسلمانوں کے مشہور رہنما نواب محسن الملک کا ارشاد ہے کہ :

"سرکاری دفتروں میں زبان اور خط کا بدلنا کوئی خفیف بات نہیں ہے۔ اس کا بہت برا اثر قوموں پر پڑتا ہے۔ بمبئی اور مدراس کی کیفیت دیکھو۔ تبدیلیٔ خط اور تبدیلیٔ زبان کی وجہ سے وہاں کے مسلمانوں پر کیا کچھ اثر پڑا ہے سرکاری

[1] مقالہ "تدریس اردو" از شمس العلما مولوی محمد امین عباسی چڑیا کوٹی، بحوالہ کتاب تعلیم و تعلم مرتبہ سید الطاف علی بریلوی صفحات ۱۱۹ - ۱۲۰۔

دفتروں میں خصوصاً عملوں (اشاف) میں کہیں ان کا نشان نہیں ملتا۔ امیروں اور سوداگروں میں، کوئی نوکری وہ نہیں پا سکتے اور جو تباہی اور بربادی ان کی ہوئی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔" لے

اسی عنوان پر اظہار خیال کرتے ہوئے اجلاس کانفرنس کلکتہ ۱۸۹۹ء میں جسٹس شاہ دین (پنجاب) نے فرمایا:۔

"میرے خیال میں اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کہ ان حروف کی تبدیلی جس میں کہ کوئی زبان لکھی جاتی ہو ضرور اسی زبان پر بہت بڑا اثر ڈالتی ہے۔ بہت سے دلائل کی ضرورت نہیں ہے مثلاً مشہور مسلمانی نام "یوسف" اور "ذکریا" بمبئی میں بوجہ تبدیلی حروف "جوسوف" اور "جاکریا" لکھے جاتے ہیں۔ اور ویسے ہی پڑھے جاتے ہیں۔ یہ تبدیلی حروف کی گویا کچر کا پتلا سرا ہے جس سے یہ ارادہ ہے کہ رفتہ رفتہ ہندی بجائے اردو کے رائج ہوجائے جو کہ مسلمانوں کے لیے بے حد مضر ہے۔" ۲ے

ان تمام آرا کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ حیات قومی و

لے تقریر نواب محسن الملک اجلاس ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۹۹ء رپورٹ کا صفحہ ۱۳۱

۲ے تقریر جسٹس شاہ دین۔ اجلاس ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۹۹ء رپورٹ کا صفحہ ۱۲۵۔

ملی میں زبان اور رسم الخط دونوں ہی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ زبان قوم کے مزاج کا آئینہ ہوتی ہے، اور رسم الخط زبان کے مزاج اور اس کی خصوصیات کا محافظ و نگہبان ہے۔ ان میں سے اگر کسی ایک سے ترک تعلق کیا جائے اور اس کو بدل دیا جائے تو قومی زندگی بھی قلب ماہیت ہو جائے گی اور اگر دونوں کو خیرباد کہہ دیا جائے یا ان میں تبدیلی لائی جائے تو قوم کے لئے اپنی انفرادیت سے ہاتھ دھونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

باب ۲

انگریزوں اور برادران وطن کی لسانی پالیسی

زبان اور رسم الخط کی اہم تاریخی اہمیت کی روشنی میں جب ہم انگریزوں کی لسانی پالیسی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم تین باتیں محسوس کرتے ہیں:

۱۔ اولاً انگریزوں نے سلطنت مغلیہ کی درباری زبان فارسی سے پیچھا چھڑایا۔ اس طرح پورے ملک میں خیالات و افکار کی حد تک جو وحدتِ خیال پائی جاتی تھی اس کو پارہ پارہ کر دیا۔

۲۔ اردو کو عارضی طور پر فارسی کا جانشین بنایا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ زبانوں کی تخریبی مقاصد کے تحت سرپرستی شروع کر دی۔

۳۔ جب ہندوستان کے طول و عرض میں پڑھے لکھے طبقہ میں ایک انتشاری کیفیت پیدا ہو گئی اور آہستہ آہستہ انگریزی جاننے والے افراد پر مشتمل ایک نسل تیار ہو گئی تو انگریزی کو سرکاری زبان قرار دے دیا گیا

اگر بات یہیں تک رہتی تو کسی نہ کسی طرح صبر آجاتا لیکن چونکہ اس ملک میں ماضی کی سب سے بڑی قوت مسلمانوں کی تھی اس لیے انگریزوں کی یہ زبردست کوشش تھی کہ مقامی زبانوں کے انتخاب میں بھی اسی زبان کو فوقیت دی جائے جو مسلمانوں کے کلچر اور تہذیب و تمدن کو سب سے زیادہ متاثر کر سکے چنانچہ

بنگال میں سنسکرتی خط میں ہندی بنگلہ کو رواج دیا گیا۔ بہار۔ سی۔ پی اور بمبئی میں ہندی سندھ میں نئے حروف ابجد کے تحت وجود میں آنے والی سندھی بولی کو دفاتر میں رائج کیا گیا۔ پنجاب میں گورمکھی اور پنجابی کو بڑھانے کی ناکام کوشش کی گئی۔ یوپی میں جب ہندی زبان نافذ کرنے کی کوششیں ناکام ہوگئیں تو اس کو اردو کے ہم پلہ قرار دلوایا گیا۔

انگریزوں کے شاگرد ہندوؤں کی لسانی پالیسی بھی مسلمانوں کے خلاف یکساں مقاصد کی حامل تھی۔ چونکہ اردو زبان مسلمانوں کے دینی علوم و فنون کی سب سے بڑی امین تھی۔ اس لئے ہندو اس کے شدید مخالف تھے مولانا ماہر القادری نے اس حقیقت کو بڑے اچھے الفاظ میں بیان کیا ہے،

> ۔ کانگریس کا وہ عنصر جو مہا سبھا اور جن سنگھ کا مزاج رکھتا تھا اردو زبان کا اس لئے مخالف تھا کہ اسلام کے بعد اردو زبان متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کے اتحاد کا ذریعہ ہے۔ اس وحدت اور اتحاد کے ذریعے پر حملہ کر کے مسلمانوں کے شیرازہ کو بکھیر دو۔ مہا سبھائی ہندوؤں کو اُردو زبان سے بیر رکھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی اور ہے کہ اردو زبان دینی علوم اور اسلامی افکار کا بہت بڑا سرمایہ رکھتی ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۴۵ء میں جب متحدہ ہند کی مرکزی حکومت کانگریس کے قبضے میں آئی ہے تو سردار ولبھ بھائی پٹیل نے محکمہ اطلاعات و نشریات کا قلم دان وزارت سنبھالتے ہی اردو زبان

پرداز کیا۔ جس پر مسلم لیگ نے شدید احتجاج کیا"۔ [1]

سرکاری دفاتر سے فارسی کا اخراج
اور
اردو کا عارضی عروج

مسلمانوں کو صدیوں تک ہندوستان پر اقتدار اعلیٰ حاصل رہا۔ اُن کے دربار کی زبان فارسی تھی، اس لئے ہندوستان کے طول و عرض میں فارسی کا ڈنکا بجنے لگا۔ چونکہ مسلم اقتدار کی جڑیں بہت گہری تھیں اس لئے انگریز مسلم اثرات کو یک لخت زائل نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ لارڈ کلایو، پادری گرانٹ، لارڈ ویلزلی اور لارڈ میکالے وغیرہم نے متفقہ طور پر انگریزی اقتدار کو ہندوستانیوں کے ذہن و دماغ میں بٹھانے کی غرض سے فارسی کو دفاتر سے خارج کرنے کا فیصلہ کیا۔ خوش قسمتی سے اردو زبان اس وقت تک ترقی کرتے ہوئے اس منزل پر پہنچ چکی تھی کہ انگریز فارسی کے بجائے اردو کو ملکی زبان بنانے پر مجبور ہو گئے۔ کیونکہ اس وقت تک کسی بھی مقامی بولی میں سرکاری حیثیت حاصل کرنے کی اہلیت نہ تھی۔ انگریزوں کا یہ اقدام بڑی دور اندیشی پر مبنی تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ملکی نظام کار میں زبردست گڑبڑ ہو جاتی اور نظام حکومت سنبھالنا دشوار ہو جاتا۔ اردو دفاتر کی زبان

---

[1] مقالہ "اردو زبان۔ ریڈیو و اخبارات"، از مولانا ماہر القادری۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۶۷ء

قرار دینے میں یہ فائدہ بھی تھا کہ یہ عوامی زبان تھی اور افسران و رعیت کا قریبی رابطہ قائم ہونے میں سہولت ہو گئی۔ دفاتر کا کام اس لیے آسانی سے انجام پاتا رہا کہ جو لوگ فارسی جانتے تھے وہ لازمی طور پر اردو نوشت و خواند میں بھی اعلیٰ درجہ کی مہارت رکھتے تھے۔ چونکہ کمپنی کی عملداری ابتدا بنگال و بہار تک محدود تھی اور فارسی کے اخراج تک دوآبہ سے بڑھ کر دہلی تک اثرات غالب آچکے تھے۔ لیکن مرکز حکومت کلکتہ میں ہی تھا جب مقامی زبانوں کو ...... عدالتوں میں رائج کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو ۱۸۳۷ء کے آئین کے نشان ۲۹ کی دفعہ ۲ کی رو سے گورنر جنرل کو جو اختیارات حاصل تھے وہ بنگال کے ڈپٹی گورنر کو عطا کر دیے گئے۔ ڈپٹی گورنر نے حاصل شدہ اختیارات کے تحت فورٹ ولیم کے علاقہ نیز کل بنگال میں عدالتی زبان فارسی کے بجائے اردو نافذ کر دی۔ اس تبدیلی زبان کے واسطے ایک سال کا وقفہ دیا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد مرشد آباد کی عدالتوں میں بھی اردو کا رواج ہو گیا

فارسی کے اخراج کی دستاویز

۲۰ نومبر سنہ ۱۸۳۷ء کو انگریزوں نے فارسی زبان کی سرکاری حیثیت ختم کرنے کا فیصلہ حسب ذیل الفاظ میں کیا۔

(۱) یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ یکم دسمبر ۱۸۳۷ء سے گورنر جنرل کشور ہند باجلاس کونسل اس امر کے مجاز ہوں گے کہ بہ اتباع حکم مجریہ کونسل تمام ملک کے لیے جو بایا جہاں وہ مناسب خیال فرمائیں ضابطۂ بنگال کی اس دفعہ کو کالعدم قرار دے دیں جس کی رو سے فارسی زبان کا استعمال عدالتی کارروائی میں یا مالی معاملات

کی کارروائی میں قانوناً لازمی ہے اور اس کی جگہ کسی زبان یا رسم الخط کو ان تمام کارروائیوں کے لئے مقرر کر سکتے ہیں"

(۲) - نیز تاریخ مذکورہ سے اس اعلان کے ذریعے یہ بھی قانوناً لازمی قرار دیا جاتا ہے کہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل وہ تمام اختیارات جو قانوناً ان کو تفویض کر دیئے گئے ہیں وہ ایسی پابندیوں کے تحت جو گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل خیال کریں اپنے کسی ماتحت کو منتقل کر سکتے ہیں۔"

عدالتوں میں اردو کے نفاذ کی دستاویز

"سنہ ۱۸۳۹ء میں صدر عدالت دیوانی اور صدر نظامت کلکتہ نے مشترکہ طور پر اردو کی ترویج کے بارے میں جو فیصلہ کیا اس کا اقتباس حسب ذیل ہے :-

(۱) عالی مرتبت ڈپٹی گورنر کی منظوری سے عدالت قرار دیتی ہے کہ آئندہ سے صدر دیوانی اور نظامت عدالت برائے کلکتہ ..... اپنی تمام عدالتی کارروائیوں اور اجرائے احکام میں اردو زبان استعمال کرے گی۔

۲- تمام دیوانی مقدمات کی کارروائیاں اور دستاویزات، جو اس عدالت میں پیش کئے جائیں اور جو فارسی یا اردو یا بنگلہ زبان میں لکھے ہوئے ہوں ان کے ساتھ ترجموں کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن فوجداری مقدمات میں جو نظامت عدالت

کو بھیجے جائیں، بجز ٹھگی، جرائم کے مقدمات کی تمام مسلیں جو فارسی میں تحریر شدہ ہوں ان کا اردو ترجمہ ساتھ پیش ہوگا۔

(۳) موگھ، اڑیا اور دیگر بھاشاؤں میں جو مسلیں ہوں، ان کا اردو ترجمہ بھی اصل کاغذات کے ساتھ منسلک ہوگا۔

(۴) اضلاع بنگال کے افسران آپس میں دیسی زبان کے ذریعے مراسلت کریں گے اور دیگر اضلاع کی عدالتوں سے جو مراسلت ہوگی اس میں بھی اردو ہی استعمال ہوگی۔ اسی قانون کا اتباع کٹک اور دوسرے صوبوں سے مراسلت کرنے میں بھی کیا جائے گا۔ بشرطیکہ وہ اسی عدالت کے تحت ہوں۔

(۵) ان اضلاع کے حکام جن کے عملے نے اب تک دیسی زبان میں خاصی مہارت حاصل نہیں کی ہے، اس بات تک کے مجاز ہیں کہ اس عملہ کو اتنی مہلت دیں کہ وہ اس زبان میں پوری مہارت حاصل کریں [1]

---

[1] یہ دستاویزات ہم نے پروفیسر شیخ حیدر صاحب ایڈووکیٹ کے معرکۃ الآرا مقالہ "اردو زبان میں قانونی تعلیم کے امکانات" سے پیش کی ہیں۔

اصل دستاویزات انگریزی زبان میں تھیں۔ پروفیسر محمد حامی الدین خاں ایم اے نے "العلم" کراچی کے واسطے اردو میں ترجمہ فرمایا۔ پروفیسر شیخ حیدر صاحب کا مقالہ لا جرنل کراچی۔ انجمن ترقی اردو کے رسالہ "قومی زبان" میں بھی شائع ہوا تھا

جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا جا چکا ہے اردو کی ترویج و اشاعت کے واسطے یہ جو کچھ کام ہو رہا تھا وہ اس زبان کے ساتھ محبت و الفت کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ مقاصد دوسرے ہی تھے۔ یعنی انگریزی زبان کے غلبہ اور عروج کے واسطے تھوڑا وقت حاصل کرنا تھا۔

در اصل انگریز چاہتے تھے۔ کہ بلا لحاظ مذہب و ملت پوری ہندوستانی قوم کا انداز فکر ہی بدل جائے جو صدیوں کی مسلمانوں کی علمی صحبت اور فارسی زبان کے اثر سے پیدا ہوا تھا، جناب ایم۔ ایم متین صاحب اپنی مشہور کتاب "پاکستان کی قومی زبان" میں لکھتے ہیں:۔

"تمام ہندوستان میں انگریزی زبان کے نفاذ کے سلسلہ میں ہم انگریزوں کے ع۔ایم سے بخوبی واقف ہیں، وہ متفرق دیسی زبانوں کی سرپرستی جس میں اردو بھی شامل تھی محض اپنی ذاتی غرض کے تحت کر رہے تھے۔ چنانچہ اردو غالباً برطانوی گورنمنٹ کی اس دور کی سب سے زیادہ محبوب زبان بن گئی تھی۔ کیونکہ اس کے ذریعے انگریز فارسی کے اثرات کو زائل کر سکتا تھا۔ انگریزوں کا اردو کی سرپرستی کرنا در اصل ایک چال تھی یہ فارسی زبان کے خلاف ایک گہری سازش تھی"۔[1]

---

[1] جناب متین صاحب کی کتاب انگریزی میں ہے۔ اقتباس محولہ بالا صفحہ ۲۲۹ کا ترجمہ ہے۔

ہم فارسی کے سرکاری دفاتر سے اخراج کا آخری حکم قبل ازیں درج کر چکے ہیں اس حکم کا پس منظر مختصرا درج ذیل ہے:

جب سنہ ۱۸۳۴ء کا منشور نافذ ہوا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کی مجلس نظما نے حکومت سے دریافت کیا کہ فارسی زبان کو عدالتوں سے خارج کرنے کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے ......؟

حکومت نے صوبائی حکومتوں سے رائے طلب کی۔ صوبائی حکومتوں نے علاقائی صدر دیوانی عدالتوں کو رجوع کیا۔ وہ مقامی حکام عدلیہ سے اس بارے میں گفتگو کر کے تفصیلی رپورٹ مرتب کریں۔ اس حکم کی بخوبی تعمیل کی گئی، زیادہ تر رائیں فارسی کے خلاف موصول ہوئیں۔ جسٹس ایور نا ایین کی رائے حسب ذیل تھی:

"میری تجویز ہے کہ بطور آزمائش ان فوجداری مقدمات میں جو سیشن جج کی عدالت میں زیر سماعت ہوں، فریقین کے بیانات ہندوستانی میں قلم بند کیے جائیں اور دیوانی مقدمات میں قسمت مرافعہ متفرق کارروائی اور دیوانی عدالتوں کے احکام بھی فارسی کے رسم الخط میں ہندوستانی زبان میں لکھے جائیں۔"

"اس قسم کی تجاویز پر غور کرتے وقت ہماری عادات اور مقتضیات کو زیر غور نہیں لانا چاہیے۔ اور ہمارے ماتحت حکام کی خواہشات اور عادات پر تو بالکل ہی دھیان نہیں دینا چاہیے۔ میں تو

یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ یا تو ہمیں یہ ثابت کرنا چاہیے کہ فارسی زبان کو باقی رکھنا ایک معقول اور منصفانہ امر ہے اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کوئی دوسری زبان جس کے وہ زیادہ عادی ہیں اس کو اختیار کرنا چاہیے۔ اور اس سلسلہ میں ہمیں عارضی طور پر جو دقتیں پیش آئیں ان پر کوئی توجہ نہیں دینا چاہیے" [1]

اس ضمن میں جیمس ڈگ کا ارشاد بھی قابل ملاحظہ ہے:۔

"ان اعتراضات نیز دیگر محکم دلائل جو عدالتی کارروائی میں فارسی زبان کو استعمال کرنے کے جواز میں پیش کی جاتی ہیں ان کے علی الرغم تمام قانونی کارروائیوں کو دیسی زبان میں قلمبند کرنے کے سلسلہ میں جس سے عوام کی اکثریت ناواقف ہے۔ دلائل جس قدر نمایاں اور کثیر ہیں اور ملک کی مادری زبان کے نفاذ سے جو فوائد مترتب ہوں گے وہ اسی قدر ظاہر ہیں کہ زبان کی تبدیلی سے بے انتہا فائدہ پہنچنے کا یقین ہے"

---

[1] اپنے مقاصد کے حصول کے واسطے اسی قسم کے عزم صمیم کی ضرورت ہے افسوس ہے کہ پاکستان میں قومی زبانوں کے بارے میں ہم اس قسم کا جوش عمل کم محسوس کرتے ہیں۔

ان سب تجاویزات و آراء کی بنیاد پر انگریزنے بیک جنبش قلم فارسی زبان کو دفاتر سرکاری سے خارج کر دیا اور اردو دفتری و عدالتی زبان قرار پا گئی۔ اس سلسلہ میں جیسا کہ آجکل بھی دستور ہے۔ حکومت کی جانب سے طرح طرح کی ہدایات ماتحت عملہ کو جاری ہونے لگیں۔ مثلاً ۲۶ر اگست سنہ ۱۸۴۰ء کو ایک اردو سرکلر ممالک مغربی و شمالی (یو۔پی) کے صدر بورڈ آف ریوینیو نے جاری کیا جس کا مضمون حسب ذیل تھا۔

"صاحبان کمشنر کو لحاظ رکھنا چاہئے کہ سررشتہ کی جو روبکاریاں ہوں وہ اردو زبان میں لکھی جائیں۔ نہ یہ کہ سوائے ہندی مصادر اور روابط کے اور الفاظ فارسی ہوں یعنی ان کاغذات میں ایسی اردو لکھی جائے جیسے لوگ باہم کہتے ہیں" [۱]

ترویج اردو کے لئے سرکاری اور غیر سرکاری اقدامات

مختلف محکمانہ سرکلر اور بیانات کے علاوہ سرکاری سطح پر اردو کی ترویج و اشاعت کے واسطے اس وقت کی انگریزی حکومت نے متعدد اقدامات کئے مثلاً سنہ ۱۸۷۷ء تک یونیورسٹی کلکتہ کے زبان دانی کے امتحان میں اردو شامل تھی، اسی سال گورنمنٹ نے اردو کی ترقی کے واسطے جمع سرکاری

---

[۱] بحوالہ مقالہ عدالتوں میں اردو کا رواج از پروفیسر شیخ حیدر

سے کے سارا سرمایہ مہیا کرنے کا انتظام کیا۔ ترکیب یہ کی گئی کہ دیہات میں مدرسہ کھولنے کے واسطے زمینداروں سے جو سالانہ چندہ جمع کیا جاتا تھا۔ اس کی شرح میں اضافہ کر دیا۔

سنہ ۱۸۹۰ء میں مہاراجا بنارس نے چیمبر انسائیکلوپیڈیا کے اردو ترجمے کے لئے دس ہزار روپیہ منظور کئے۔ راجا بلبھ نرائن سنگھ نے بھاگلپور میں ایک مدرسہ انگریزی اردو کی تعلیم کے واسطے جاری کرایا... اخلاقی طور پر اردو کو فروغ دینے کا یہ طریقہ نکالا کہ اعلیٰ حکام سلطنت پبلک جلسوں میں اردو میں تقریر کرتے تھے۔ اگر انگریزی میں ہوتی تھیں تو ان کا ترجمہ اردو میں سنایا جاتا تھا[1]

راہ گریز

جب برطانوی استعمار نے ہندوستان کے ایوانہائے حکومت سے فارسی کو خارج کیا تو اسوقت مسلمانان ہند کو شدید روحانی صدمہ ہوا۔ یہ روحانی صدمہ آہستہ آہستہ مسلمانوں کے ہر شعبۂ حیات میں زوال کا پیش خیمہ ثابت ہونے لگا۔ ترویج اردو کی وجہ سے مسلمانوں کے آنسو وقتی طور پر تھم گئے تھے لیکن یہ شکل کچھ دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ بالآخر اردو کے خلاف سازشوں نے عملی شکل اختیار کرنا شروع کر دی۔ جس طرح قصیدے میں ایک خاص مرحلہ کے بعد شاعر ایک نیا مضمون باندھنے کے واسطے گریز اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح فارسی کے بعد اردو کے اخراج کی

---

[1] مقالہ اردو ہندی اختلاف از بیگم رشید احمد ص ۸۸-۸۹ رپورٹ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کلکتہ سنہ ۱۹۳۹ء

تدابیر انگریزی زبان کے نفاذ کی غرض سے ایسٹ انڈیا کمپنی اور پھر اس کے چالاک جانشینوں نے اختیار کرنا شروع کر دیں۔

زبان کے مسئلہ میں جن انگریزوں کے نام نمایاں ہیں ان میں لارڈ ولیم بینٹنگ کا نام سرفہرست ہے۔ ہیٹنگ اس ملک کے باشندوں کو سرے سے تعلیم دینے ہی کا مخالف تھا۔ اس کا منشا یہ تھا کہ ان میں خیالات کی ہم آہنگی نہ پیدا ہو جائے۔ ان مقاصد کے تحت اس کے انتیازات میں بہ حیثیت گورنر جنرل محض ایک ہی بات تھی۔ یعنی انگریزی بہ حیثیت کاروباری و عدالتی زبان رائج کرنا۔ ۲۹ ستمبر ۱۸۳۰ء کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بنگال گورنمنٹ کو لکھا دیسیوں کو انگریزی زبان حاصل کرنے کی زیادہ ترغیب دینے کے واسطے آپ نے اسے عوامی کاروبار کے جملہ شعبوں میں رائج کیا ہے۔ آپ نے ان دیسی شہزادوں اور معززین سے خط و کتابت انگریزی میں کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جن کے متعلق علم ہوا ہے کہ انگریزی سمجھ سکتے ہیں یا ان کے پاس ایسے اشخاص موجود ہیں جو انگریزی جانتے ہیں۔ عوامی اور عدالتی کاروبار میں اس زبردست تبدیلی سے آپ کو بہت سے فوائد کی توقع ہے۔ خصوصاً جج اور یورپین افسر اس زبان (انگریزی) سے بخوبی واقف ہونے کی وجہ سے، جن میں کارروائی مقدمہ یا معاملہ، مقدمہ چلتا ہے۔ دیسیوں کے کم سے کم پابند ہوں گے جن میں وہ گھرے رہتے ہیں۔[۱]

[۱] بحوالہ تاریخ التعلیم از میجر بی ڈی باسو۔ ص ۶۹

جہاں تک ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی تاریخ کا تعلق ہے اس بارے میں ارباب اختیار کا ذہن پہلی مرتبہ سنہ ۱۸۱۳ء میں منتقل ہوا جب کمپنی نے ایک لاکھ پونڈ سالانہ ہندوستانی رعایا کی تعلیم کے لیے مخصوص کیا اس وقت بعض انگریزوں کو خیال ہوا کہ ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم دی جائے اور انھیں عیسائی مذہب کی طرف رغبت دلائی جائے، لیکن لارڈ منٹو کی مخالفت کی وجہ سے یہ خیال شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ غالباً سنہ ۱۸۲۳ء میں راجا رام موہن رائے نے لارڈ اسمھرسٹ کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی تھی جس میں خاص طور پر اس امر پر زور دیا تھا کہ ہندوستان میں ایسا تعلیمی نظام قایم کرنا چاہیے جس میں ریاضی، فلسفہ، کیمیا، علم البدن اور دوسرے مفید علوم کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اب ہندوستانیوں نے انگریزی زبان کی سیاسی اہمیت کو تھوڑا بہت محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔

سنہ ۱۸۳۳ء کے منشوری قانون کی منظوری کے بعد حکومت ہند نے تعلیم عامہ کی جو جنرل کمیٹی مقرر کی تھی اس کے ارکان میں اس بات پر اختلاف ہوا کہ آیا کہ سرکاری امداد صرف ان مدارس کو دینی چاہیے جن میں مغربی علوم کی انگریزی زبان کے ذریعے تعلیم ہوتی ہے یا ان مدرسوں کو بھی دینی چاہیے جن میں صرف مشرقی علوم کی تعلیم کا انتظام ہے ان میں دو فریق ہو گئے۔ ایک کہتا تھا کہ انگریزی زبان کے ذریعہ سے علوم و فنون کی تعلیم دینے سے اہل ہند کو زیادہ اور حقیقی فائدہ ہو گا اور دوسرے فریق کا یہ دعویٰ تھا کہ فارسی، یا

سنسکرت کے ذریعہ قدیم علوم کی تعلیم زیادہ مفید ہوگی۔

لارڈ میکالے کی پالیسی

۱۸۳۵ء، میکالے کی تعلیمی یادداشت سے اس مسئلہ کا فیصلہ ہوگیا۔ اس کا خیال تھا کہ،

"مشرقی زبانیں جدید تمدّن کے خیالات سے عاری ہیں اور ان میں اتنی صلاحیت بھی نہیں ہے کہ وہ سائنس کے نظریوں کو پوری طرح ادا کر سکیں۔ برخلاف اس کے انگریزی زبان کو نہ صرف یہ کہ دنیا کی موجودہ زبانوں میں ادبی اعتبار سے بلند مرتبہ حاصل ہے۔ بلکہ وہ تمام حقیقی علوم و فنون کے خزانوں کی کنجی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ مدرسے جن میں مشرقی علوم کی تعلیم ہوتی ہے اور جنھیں حکومت امداد دیتی ہے بند کر دیے جائیں۔ ذریعہ تعلیم کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے میکالے نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ :-

"ہندوستان کی مقامی زبانوں میں علم و ادب نام کو بھی نہیں۔ چنانچہ ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو طے پایا کہ بجائے فارسی کے انگریزی زبان حکومت کی سرکاری زبان تسلیم کی جائے اور آئندہ سے صرف ان مدرسوں کو سرکاری امداد کے لائق سمجھا جائے جن میں انگریزی زبان کے ذریعے سے مغربی علوم کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہو۔"[۵]

۵۔ تاریخ ہند (عہد جدید) لارڈ ولیم بنٹنگ اور ملکی اصلاحیں صفحات ۳۳۶-۳۴۲

ڈاکٹر یوسف حسن خاں۔ دارالترجمہ حیدرآباد۔

لارڈ میکالے کی مندرجہ بالا یادداشت پر گورنر جنرل کونسل نے غور کیا اور اور سیکرٹری کے دستخطوں سے جو نوٹ لکھا گیا اس کے اقتباس حسب ذیل ہیں۔ برطانوی گورنمنٹ کا خاص مقصد یورپین لٹریچر اور سائنس کا احیاء ہونا چاہیے اور کہ جملہ سرمایہ جو تعلیم کی مد میں مختص ہو وہ دیسیوں میں انگریزی تعلیم پر خرچ کیا جائے۔ گورنر جنرل کو معلوم ہوا ہے کہ کمیٹی کی جانب سے ایک بڑی رقم مشرقی علوم کی بلند پایہ کتابوں کی چھپائی پر صرف ہوتی ہے لہذا ہز لارڈ شپ ہدایت دیتے ہیں کہ ان رقوم کا کوئی حصہ آئندہ اس کام کے واسطے استعمال نہ کیا جائے۔ [1]

اس سلسلہ میں مسٹر مینین لکھتے ہیں:

"فارسی زبان کے ساتھ کمپنی کے برتاؤ کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی مقامی زبانوں کے متعلق پالیسی سمجھ میں آجاتی ہے۔ یہ تصویر کا پہلا رخ تھا جس کا دوسرا رخ یہ تھا کہ کمپنی ملک میں زیادہ سے زیادہ زبانیں اور بولیاں ابھارنا چاہتی ہے۔ یہ بات کمپنی کی سازش کا خاص جز و تھی۔ کہ ہندوستانیوں کو اپنے خیالات کی نشو و نما کے واسطے کوئی ایک ذریعہ حاصل نہ ہو جائے۔ حقیقتاً ان کو بے شمار لیکن کمزور بے مایہ زبانیں اپنے خیالات کے اظہار کے واسطے مہیا کی گئی تھیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کے برطانوی حکمراں یہ چاہتے تھے کہ ہندو مسلمان زیادہ سے زیادہ ذریعۂ اظہار کے معاملہ

---

[1] ۸۸ - ۸۹ تاریخ التعلیم از میجر بی۔ ڈی باسو۔

میں اُلجھ جائیں

چنانچہ یہ ضروری سمجھا گیا کہ ہر گاؤں اپنی علیحدہ زبان کا نہ سہی تو علیحدہ بولی کا ضرور حامل ہو۔ یہی وہ طریقہ تھا جس کے ذریعے باوجود کان اور زبان کی موجودگی کے ہندوستانیوں کو بہرہ اور گونگا بنا دیا گیا۔

جہاں تک مقامی زبانوں کا تعلق تھا ان میں کوئی ایسی بات یا مواد موجود نہیں تھا۔ جو عوام کو بیرونی لٹیروں کی لوٹ مار کے خلاف ابھارتا۔ لہٰذا اس فرصت میں انگریزوں نے اچھی طرح اپنی حیثیت مضبوط کرلی۔

آج جو لسانی مسائل جنوبی ہند (بھارت)، مشرقی بنگال (مشرقی پاکستان)، یا برصغیر پاک و ہند میں ابھر رہے ہیں۔ ان کا انگریزوں کو پورا اندازہ تھا۔ حقیقتاً وہی ان مسائل کے موجب تھے۔" [1]

کسی بات کے بارے میں محض الزام لگا دینا کوئی معنی نہیں رکھتا تاوقتیکہ بیّن شہادتیں اس الزام کے جواز میں موجود نہ ہوں اس لیے انگریزوں کی انتہائی ذہانت اور چابک دستی کے ساتھ وضع کی ہوئی پالیسی کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ مثلاً ابتدائے عہد انگریزی میں کسی اصطلاحی ہندی کا سوال ارباب ذوق یا صاحبانِ اقتدار کے سامنے نہیں تھا۔ پہلی ہندی کتاب جس میں سے فارسی الفاظ خارج کیے گئے، للولال جی کی تحریر کردہ تھی۔ یہ کتاب ڈاکٹر گلکرائسٹ کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ چونکہ اس نئی ہندی زبان میں فارسی کے بجائے سنسکرت

الفاظ استعمال ہونا شروع ہوئے تھے، اس لئے ہندوؤں نے قدرتاً اس نئی ہندی کو ہندو کلچر اور تمدن کا ترجمان سمجھنا شروع کر دیا۔ اور وہ اس مصنوعی زبان کو پھیلانے میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ یہ لسانی پالیسی رنگ لائی اور فورٹ ولیم کے شاطروں نے

> "ہندی اور ہندوستانی دو زبانیں بنا کر ایک کے لئے پنڈت اور دوسری کے لئے مولوی منشی نوکر رکھ کر دو زبانوں کے لئے سامان درست کر دیا۔"[1]

مولوی عبدالحق کا بیان

اس تاریخی حقیقت کو بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

> "آجکل پروپیگنڈے کا زمانہ ہے اور پروپیگنڈے میں ہر قسم کی غلط بیانی جائز سمجھی جاتی ہے۔ ان باتوں کی تردید کرنا تضیع اوقات ہے۔ میں ان سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ جب انگریزی عہد میں فارسی کی جگہ اردو عدالتی دفتری اور تعلیمی زبان قرار دی گئی تو اس وقت یہ صاحبزادی (ہندی) کہاں تھیں۔ اس وقت کسی کے منہ سے نہ پھوٹا کہ اردو نہیں "ہندی" ہونا چاہئے۔"[2]

---

[1] "ہماری قومی زبان" (انگریزی) از ایم ایم ستین، صفحات ۲۱۱، ۲۱۳
[2] مقالہ "اردو ہندی کا اختلاف" از بیگم سید رشید احمد۔

کوئی کہتا کس منہ سے کوئی زبان ہوتی بھی ؟"

" ملک کی بدقسمتی کہ انگریزی تسلط کے بعد بعض اسباب کی بنا پر جس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ ہندی والوں کو ایک نئی قومیت کی سوجھی جس کی بنیاد قدیم تہذیب اور قدیم مذہب اور زبان پر تھی۔ اس نئی قومیت کے لئے نئی زبان کی ضرورت داعی ہوئی۔ کیونکہ قومیت کا رشتہ زبان ہی سے مضبوط ہوتا ہے۔ اب انھوں نے ان علاقوں میں جہاں ہندی بولیاں رائج تھیں۔ ایک نئی مصنوعی ہندی کو..... رفتہ رفتہ داخل کرنا شروع کیا اور اردو کو وہاں سے نکالنے کی تدبیریں کرنے لگے۔" لہ

جس نئی ہندی کا مولوی عبدالحق نے ذکر کیا۔ اس کے اجرا کے سلسلہ میں جناب کشن پرشاد کول لکھتے ہیں :

" اٹھارھویں صدی کے آخر میں انگریزی حکومت کی مصلحتوں نے فورٹ ولیم کالج میں پہلے پہل نئی ہندی کی بنیاد اسی طرح ڈلوائی کہ للولال جی سے "پریم ساگر" ایسی ہندی زبان میں لکھوائی جس کا تعلق نہ اردو ہی سے تھا نہ برج بھاشا سے۔ بلکہ کھڑی بولی اور ہندوستانی

لہ بحوالہ خطبۂ صدارت یوم اردو سالانہ جلسہ انجمن حمایت الاسلام سنہ ۱۹۴۱ ء

سے تھا۔ فرق یوں پیدا کیا گیا کہ اس میں سنسکرت کے لفظ کثرت سے داخل کئے گئے اور یہ قرار دیا گیا کہ جس زبان میں فارسی اور عربی الفاظ ہندی الفاظ کے مقابلہ میں کثرت سے ہوں وہ اردو ہے اور مسلمانوں کی زبان ہے۔ بنیاد تو نئی ہندی کی اس طرح پڑ گئی۔ لیکن بہت عرصہ تک یہ پنپی نہیں۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد اس نئی ہندی میں کتابیں لکھی جانی شروع ہوئیں اور جوں جوں ہندو اور مسلمانوں میں قومی اور سیاسی اختلاف بڑھتا گیا نئی ہندی اسی جوش میں ابھرتی گئی۔ فارسی اور عربی کے وہ لفظ جو زبان کے روزمرہ ہو گئے تھے، نکالے جانے لگے، اور ان کی جگہ سنسکرت کے بھاری بھاری لفظ داخل کئے جانے لگے"۔ [1]

اردو اور ہندی کا قضیہ کس نے شروع کیا

نئی ہندی کی کہانی آپ نے کشن پرشاد کول کی زبانی سُنی۔ انتہا پسند ہندوؤں نے یہیں تک بس نہیں کیا کہ ایک نئی زبان کو ترقی دینے لگے۔ بلکہ اس زبان کو مسئلہ بنا کر اردو کی مخالفت کا سامان مہیا کر دیا۔ ان ریشہ دوانیوں کو آہستہ آہستہ مسلمان عام طور پر سمجھنے لگے اور مسلمانوں کے مسلمہ قائد سر سید احمد خاں بھی اس ردِّعمل سے متاثر ہوئے

---

[1] بحوالہ "ادبی اور قومی تذکرہ" شائع کردہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ۔

لیکن یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ ہندی اور اردو کے اختلاف اُبھارنے والے سر سید احمد خاں تھے۔ مولوی عبدالحق نے بھی اس بارے میں بڑی تفصیل کے ساتھ وضاحت فرمائی ہے۔

"بعض اصحاب کا جو یہ خیال ہے کہ سر سید احمد خاں نے نیشنل کانگریس سے مخالفت کر کے ہندی اردو کا اختلاف پیدا کیا۔ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ یہ فساد سب سے پہلے سنہ ۱۸۶۷ء میں بنارس سے اٹھا۔ جہاں بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں اردو زبان و فارسی خط موقوف کرانے کی کوشش کی جائے۔ اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے"

"ہندوؤں کی اس قومی مجلس میں جو بابو فتح نرائن کے مکان پر بنارس میں قایم تھی، اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ جا بجا اس کے لئے کمیٹیاں، مجلسیں اور سبھائیں مختلف ناموں کی قایم ہو گئیں اور ایک صدر مجلس الہ آباد میں قایم کی گئی جس کے ماتحت تمام مذکورہ بالا مجلسیں اور سبھائیں تھیں۔" [۱]

---

[۱] خطبہ صدارت " اردو کانفرنس " علی گڑھ سنہ ۱۹۳۷ء صفحہ ۱۰۵

لسانی انتشار کے دیگر عوامل

مندرجہ بالا اقتباسات میں جن واقعات کی نشاندہی کی گئی ہے وہ فورٹ ولیم کالج کی تحریک کا لازمی نتیجہ تھے۔ فورٹ ولیم کی تحریک عیسائی مشنریوں کی لسانی خدمات کے بارے میں اہل علم دو طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک گروہ کے نزدیک اس کالج اور عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں سے اردو زبان کو بڑا فائدہ پہنچا۔ لیکن جن لوگوں نے ان لوگوں کی سامراجی پالیسیوں کو عمیق نظر سے دیکھا وہ فوراً بات سمجھ گئے۔ عیسائی پادریوں نے اپنے مذہبی عقاید پھیلانے کی غرض سے ابتداءً اردو سے خوب کام لیا اور آہستہ آہستہ انگریزی زبان پھیلانے اور مقامی زبانوں کو قومی زبان کے بالمقابل لانے کا کام بھی جاری رکھا۔ اردو زبان کی ترقی و اشاعت میں اس گروہ کی سرگرمیوں کو رام بابو سکسینہ نے بہت جامع انداز میں بیان کیا ہے:-

"عیسائی پادریوں کی تصانیف نے بھی نثر اردو پر ایک خاص اثر ڈالا۔ ان لوگوں نے عموماً اور خاص کر ان پادریوں نے جو سیرام پور واقع بنگال میں قیام پذیر تھے بائبل کا ترجمہ ملک کی دیسی زبانوں میں کر کے اس کی اشاعت عوام الناس میں بکثرت کی۔ اس کے علاوہ صدہا مذہبی چھوٹے رسالے اور کتابیں اردو میں شائع کیں۔ ہمارا خیال ہے کہ دیسی زبان میں اخبار نویسی کی ابتدا بھی اسی زمانے سے ہوئی سب سے قدیم ترجمے بائبل کے سنہ ۱۸۰۵ء سے سنہ ۱۸۱۴ء

تک شائع ہوئے وہ زیادہ تر اردو میں ہی ہوتے تھے۔[۱]

مرکزی اور صوبائی زبانوں کا مسئلہ انگریزوں کی نظر میں

جیسا کہ سابقہ صفحات میں ہم مختلف ماہرین لسانیات اور علمائے ادب کی تحریروں کے حوالے سے عرض کر چکے ہیں۔ کہ انگریزوں نے اپنے سامراجی مقاصد کے تحت زبان اور رسم الخط کے مسئلہ کو کافی الجھا دیا۔ اور اس انتشاری کیفیت میں اپنے اقتدار کی جڑیں مضبوط کیں۔ ذیل میں انڈین اسٹیوٹری کمیشن کا ایک اقتباس قابلِ غور ہے[۲]

"جو زبان عوام میں سب سے زیادہ رائج ہے وہ ہندوستانی ہے جس کے دو لکھنے کے طرز ہیں۔ ایک اردو اور دوسرا ہندی۔ اردو مسلمان حملہ آوروں کے کورٹ کی زبان تھی۔ مسلمان عام طور پر عربی رسم الخط اور فارسی زبان کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ہندو اس کے برعکس وہی زبان (یعنی اردو) بولنے کے باوصف سنسکرت کے حروف تہجی استعمال کرتے ہیں"

ابھی ہندوستانی کل ہندوستان میں بولی جانے والی زبان کی حیثیت سے بہت دور ہے۔ بطور مثال مدراس پریذیڈنسی میں جو زبان رائج ہے ایک مختلف الاصل خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اور تلنگو زبان کے ذریعے پیش ہوتی ہے۔ جو حیدرآباد ریاست میں بھی بولی جاتی ہے۔ تامل، کناری

---

۱ تاریخ ادب اردو۔ از رام بابو سکسینہ۔ مترجمہ مرزا محمد عسکری ص ۳۴، ۳۵

۲ اسٹیوٹری کمیشن رپورٹ جلد اول صفحات ۱۲۔۱۴ مطبوعہ لندن مئی سنہ ۱۹۳۰ء

دجو میسور کی خاص زبان ہے اور ملیسالم و بنگالی پانچ کروڑ بنگالیوں، مغربی آسام بہار اور اڑیسہ کی زبان ہے۔ مرہٹی بمبئی کے کچھ حصوں میں... صوبہ متوسط و برار اور حیدرآباد میں بولی جاتی ہے۔ پنجابی پنجاب اور کشمیر میں۔ گجراتی گجرات اور ریاست بڑودہ میں۔ راجستانی راجپوتانہ میں اور سینٹرل انڈیا میں۔ سندھی سندھ میں۔ وغیرہ وغیرہ۔ برما اور آسام کے پہاڑی علاقے۔ قطعی دوسری زبانوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مردم شماری کی رپورٹوں کے مطابق ملک میں دوسو بائیس بولیاں رائج ہیں، یہ کہنا کافی ہوگا کہ اگر کوئی شخص جس کی بات پورے ملک میں سمجھ لی جائے اس کو زیادہ سے زیادہ زبانوں پر حاوی ہونا پڑے گا۔" [۱]

انگریزوں کی مندرجہ بالا پالیسیوں کا بالآخر یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ ہندو قوم پرستی کا احیا ہوگیا اور کروڑوں ہندو قوم پرستی کے خوفناک بت کی پوجا کرنے لگے۔ شیواجی رانا پرتاپ ان کے ہیرو ہو گئے، فرقہ وارانہ بلوے لاکھوں انسانوں کے خون ناحق روزمرہ کا معمول بن گئے جن کی تفصیل محتاج بیان نہیں ہے۔ سرسید احمد خاں نے اس سلسلے میں خوب لکھا ہے:۔

"جب سے ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور ان کی شاہنشاہی ہندوستان کی باقی ماندہ نشانی ہے مٹا دیا جائے۔ اس وقت سے مجھ کو یقین ہوگیا کہ اب

ہندو مسلمان باہم متفق ہو کر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے۔ اپنے تجربے اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے اس کی ابتدا اسی سے ہے۔"

باب - ۳

اردو زبان کی اہمیت

گذشتہ ابواب میں ہم زبان ورسم الخط کی اہمیت ہندوستان میں فارسی زبان کے زوال اور اردو زبان کے عارضی عروج کی کہانی انگریزی پالیسیوں کی روشنی میں پیش کر چکے ہیں۔ اب قدرتی طور پر اردو زبان کی ہمہ گیری اور افادیت پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ جہاں تک اردو زبان کی اہمیت کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس کا احاطہ کرنا غیر ممکن ہے۔ مشہور شاعر وادیب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی اپنی مشہور تالیف کیفیہ میں اردو زبان کی تاریخی اہمیت مندرجہ ذیل امور پر قایم کرتے ہیں:-

۱- اردو کی بعثت سے پہلے پراکرت میں فارسی الفاظ کا وجود ثابت ہوتا ہے۔

۲- پنجاب کے باہر ہندوستان میں اسلامی حکومت سے پیشتر پراکرت زبانوں میں فارسی اور عربی کے الفاظ ملتے ہیں۔

۳- اردو زبان پنجاب میں پیدا ہوئی۔ [1]

۴- اردو کی پیدائش کے ذمہ دار ہندو اور مسلمان دونوں ہیں۔

---

[1] حاشیہ صفحہ ۱۸۱ پر ملاحظہ ہو

۵. کھڑی بولی کی توسیع مسلمانوں سے ہوئی
۶. اردو کی تدوین اور تنظیم دہلی میں ہوئی اور وہیں اس کو ادبی حیثیت ملی۔
۷. اردو کو ہندو اور مسلمان دونوں سمجھتے ہیں۔
۸. اردو کا پہلا شاعر امیر خسرو اور پہلا ناثر حضرت گیسو دراز ہیں۔
۹. اردو کی سب سے پرانی غزل جو ملتی ہے وہ ایک ہندوستانی تخلص برہمن کی ہے
۱۰. دہلی سے اردو دکن گئی ؎۔

ہندوستانی یا اردو زبان کا پتہ سترھویں صدی عیسوی سیاحوں، مبلغین اور تاجروں کی مراسلات، یادداشتوں سے بھی خال خال ملتا ہے۔ ایک انگریز سیاح جان فریر ٹوم کوریٹ نامی ایک انگلش فقیر کا ذکر کرتا ہے جو سنہ ۱۶۱۶ء میں ہندوستان میں موجود تھا۔ اور "انڈستان" زبان پر عبور رکھتا تھا۔ جان فریر اورنگ زیب کے عہد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے،

- دربار کی زبان فارسی ہے اور عوام انڈستان زبان بولتے

؎ و ۵ اردو کہاں پیدا ہوئی؟ اس پر دکن پنجاب۔ دہلی اور سرحد اور سندھ غرض سب کو دعویٰ ہے۔ اس ضمن میں ارباب دہلی و نواح دہلی کا دعویٰ زیادہ وزنی ہے۔ اردو زبان کی بنیاد کھڑی بولی ہے جس کا ذکر امیر خسرو اور ابوالفضل نے دہلوی زبان کے نام سے کیا ہے۔ اردو افعال و حروف کی ساخت اسی زبان سے ملتی جلتی ہے اور ان ہی شواہد کی بنیاد پر گریرسن نے اسی کو اردو زبان کی اصل قرار دیا ہے۔

ہیں جس کا کوئی باضابطہ رسم الخط نہیں ہے۔"

"جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا کاروبار بڑھنے لگا اور حکومت و سلطنت کے تقاضوں نے مجبور کیا تو سنہ ۱۶۷۷ء میں کورٹ آف ڈائریکٹرز نے ایک مراسلہ قلعہ سینٹ جارج (مدراس) کو لکھا کہ جو ملازمین ہندوستانی زبان سیکھیں گے ان کو ۲۰ پونڈ بطور انعام دیے جائیں گے۔"

"جنگ پلاسی سنہ ۱۷۵۷ء کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے اعلیٰ ملازمین کو تیس روپے ماہوار منشی الاؤنس دینا منظور کیا۔ تاکہ منشی رکھ کر وہ ہندوستانی اور فارسی کی تعلیم حاصل کریں۔" [۵]

مسلمان اور اُردو اردو زبان اگرچہ برِصغیر پاک و ہند کے جو باشندوں کی مشترکہ زبان رہی ہے اور اب بھی اپنی سخت جانی کی بنا پر ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس زبان کا مسلمانوں کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے۔ بات یہ ہے کہ فارسی کے بعد اردو وہ واحد زبان ہے جس میں اسلامی علوم و فنون کا بے پناہ سرمایہ موجود ہے۔ جناب اکبر علی خاں علی حیدری صدر ایجوکیشنل کانفرنس اجلاس کلکتہ سنہ ۱۹۱۶ء نے بالکل صحیح فرمایا:

---

[۵] "بنگال اُس دور اس کا عہد" از محمد عتیق صدیقی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سنہ ۱۹۶۰ء صفحہ ۴۷ ـ ۴۸

مختلف صوبوں کی تعلیمی اور مردم شماری کی رپورٹوں کے پڑھنے اور عام حالات و واقعات کے دیکھنے سے مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی اشاعت اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں ایک خاص مناسبت ہے۔ جن جن مقامات میں اردو زیادہ رائج اور شائع ہے اسی قدر وہاں کے مسلمان زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ شائستہ اور ترقی یافتہ نظر آتے ہیں۔ اور قومی و ملکی معاملات میں سرگرم اور مستعد معلوم ہوتے ہیں اسی طرح جس نسبت سے اردو مختلف مقامات میں داخل ہوتی جاتی ہے اسی نسبت سے وہاں کے مسلمانوں کا جمود ٹوٹتا جاتا ہے۔ اور ان میں وسعت نظر اور احساس قومی پیدا ہوتا جاتا ہے۔" [1]

اُردو زبان کی وسعت مشہور فرانسیسی مؤرخ گارساں دتاسی کے نام بمبئی کے ایک پادری ریورینڈ براؤن کرنے ایک خط میں تحریر کیا کہ "میں بطور گواہ اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ ہندوستان کے ہر حصہ میں اردو زبان وسعت کے ساتھ مفید ثابت ہوتی ہے واضح رہے کہ میں نے راس کماری سے لے کر ہمالیہ تک اور گنگا کے دہانے سے لے کر دریائے انڈس تک سفر کیا ہے"

۔ سنہ ۱۸۷۰ء کی تعلیمات کی سرکاری رپورٹ پڑھنے سے

---

[1] بحوالہ رپورٹ اجلاس ایجوکیشنل کانفرنس کلکتہ سنہ ۱۹۱۶ء

معلوم ہوتا ہے کہ نئے قواعد کے مطابق اودھ کے تمام اضلاع
کے مدارس میں طلباء کو اردو پڑھائی جاتی ہے۔ رپورٹ کے
الفاظ یہ ہیں :۔ تجربہ سے پتہ چلا ہے کہ بہ نسبت ہندی کے
اردو زیادہ مفید اور مقبول ہے۔" [۱]

دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر بتروس نے گارسان دتاسی کے نام اپنے خط مورخہ
۱۹ دسمبر سنہ ۱۸۷۱ء اردو زبان کی وسعت مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کی ہے:

"ہندوستانی زبان نے دو تین سال سے ایسی اہمیت حاصل
کرلی ہے جو اس سے پہلے نہ تھی۔ یہ بہار اور مغربی صوبوں کی
یعنی راج محل سے لے کر ہردوار تک کی سرکاری زبان بن
گئی ہے۔ ہردوار ہمالیہ کے دامن میں ایک قصبہ ہے۔ مزید
برآں یہ زبان سارے ہندوستان میں سمجھی جاتی ہے۔ اور کم
سے کم چار کروڑ اشخاص اسے روزمرہ کے طور پر استعمال کرتے
ہیں۔ اب انگریزی حکومت نے اسے عدالتوں اور سرکاری اخبار
میں جاری کر دیا ہے (از مولوی عبدالحق) بحوالہ کتاب مرحوم
دہلی کالج (۱۹۴۵ء)

اردو زبان کے خلاف برادرانِ وطن کی جدوجہد

جیسے جیسے انگریز شاطروں کی گہری چالیں کامیابی سے ہمکنار ہونے لگیں۔

---

[۱] مقالات۔ گارسان دتاسی سنہ ۱۸۷۱ء ص ۹۹۔۱۰۰

بنارس کے فرقہ پرستوں کی سرگرمیوں میں بھی زور پیدا ہونے لگا۔ سر سید احمد خاں کے خلاف خصوصی سب وشتم کا سلسلہ محض اس جرم میں شروع ہوگیا کہ انھوں نے انڈین ایسوسی ایشن کے توسط سے مشرقی علوم کی ایک یونیورسٹی قایم کرنے کی درخواست دلوائی تھی۔ ابھی یہ بات ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی کہ الہ آباد کے بابو سرودھا پرشاد منڈل کی قیادت میں علی الاعلان ہندی کے حق میں ہنگاموں کا آغاز ہوا۔ اردو کو مسلمانوں کے حاکمانہ اقتدار کا مظہر گردانا گیا۔ ٹھیک اسی زمانے میں دیانند سرسوتی نے پراچین دھرم کے احیا کے عنوان سے ہندوؤں میں قوم پرستی کا ایک نیا طوفان کھڑا کر دیا۔ انگریزوں نے سیاسی مصالح کے تحت بظاہر اس ہنگامہ آرائی سے بے تعلقی کا اظہار کیا اور اس طرح یہ فتنہ بڑھتے بڑھتے ایک طوفان کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ کیفیت انگریزوں کی عین منشا کے مطابق تھی۔ کیونکہ ان حالات کا کسی نہ کسی شکل میں مسلمانوں پر اثر پڑتا تھا۔ مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کے دلی تکدر کا ایک سبب جنگ آزادی سنہ ۱۸۵۷ء بھی تھی جس کو بمشکل دس سال کا عرصہ گزرا تھا۔

سنہ ۱۸۷۱ء تک بنگال اور بہار میں اردو کی بنیادیں اکھیڑ دی گئیں۔ سنہ ۱۸۷۲ء میں سی پی کے علاقہ میں ناگری رسم الخط جاری ہوا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ یو-پی میں بھی ناگری کے حق میں میدان تیار کیا جانے لگا۔ اس نازک مرحلہ پر سر سید علیہ الرحمۃ نے مردانہ وار آگے بڑھ کر، اردو ڈیفنس انجمن کے ذریعہ زبردست مقابلہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طوفان وقتی طور پر ٹل گیا۔ سنہ ۱۸۹۸ء میں سر انٹونی میکڈانلڈ کے دور میں یہ مسئلہ پھر اٹھایا گیا۔ یہ شخص مسلمانوں کا بڑا دشمن تھا۔ سر سید علیہ الرحمۃ

جیسی فولادی قوت دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ قوم پر مایوسی اور ہراس کی کیفیت طاری تھی۔ لیکن :۔

مُردے از غیب بروں آید و کارے بکند

کے مصداق نواب محسن الملک قائد قوم بن کر ابھرے اور بڑی عظیم جد وجہد کے بعد اردو رسم الخط کو بحال رکھوانے میں کامیاب رہے۔ ٹھیک ان ہی ایام میں پنجاب میں بھی اردو کے خلاف ایک بڑا ہنگامہ کھڑا کیا گیا۔ لیکن خوش قسمتی سے مسلمانان پنجاب نے اکابر علی گڑھ کے ساتھ اتحاد کر کے اس خوفناک سازش سے مکمل خلاصی حاصل کرلی۔ ذرا بدلی ہوئی شکل میں ایسی ہی ایک کوشش سندھ میں بھی ہوئی۔ سندھ میں تحریک کا رخ یہ تھا کہ سندھی زبان ناگری رسم الخط میں لکھی جائے۔

مندرجہ بالا مختصر روداد سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زبان کی آڑ میں مسلمانان ہند کو نقصان پہنچانے کی کس طرح جد وجہد ہو رہی تھی۔ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ نے سب سے پہلے سنہ ۱۹۱۱ ء میں اس اہم مسئلہ کی نزاکت پر غور کیا۔ سنہ ۱۹۱۹ ء میں اقلیتوں کے تحفظات میں بھی اُردو کے مسئلہ کو نمایاں حیثیت دی گئی اور پاکستان کی جنگ تو سچ پوچھئے دو بنیادوں پر لڑی گئی۔

(۱۔) اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کے واسطے ایک علیحدہ خطۂ ملک کا حصول، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو۔

(۲) اور یہ کہ اس خطۂ ملک کی زبان کا اردو ہونا۔ سنہ ۱۹۳۵ ء میں پراونشل مسلم لیگ یو۔پی کے صدر نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں فرمایا تھا

"اردو کو اس اعلیٰ مرتبہ سے جو اسے ہندوستان کی

اور زبانوں کے مقابلہ میں حاصل ہے۔ گر اودیسے کی کوشش سن کر بے حد مایوسی ہوتی ہے۔"

اس سلسلہ میں انگریزوں کی شہ پر برادرانِ وطن کے کردار اور برطانوی حکومت کی پالیسی کی تفصیل ہم یوپی کے باب میں بیان کریں گے۔ کیونکہ یہ صوبہ قیام پاکستان اور اردو ہندوستانی کشمکش کا سب سے بڑا مرکز رہا ہے۔

باب ۔ ۴

صوبہ بنگال

گذشتہ ابواب میں ہم مجموعی طور پر رسم الخط کی اہمیت انگریزوں اور برادرانِ وطن کی معاندانہ روش تاریخی روشنی میں پیش کر چکے ہیں۔ ذیل میں برصغیر پاک و ہند کے چند مشہور صوبوں کی لسانی سیاست پیش کرتے ہیں جو انگریزوں کی لسانی پالیسیوں کا مدتوں ہدف بنے رہے۔ ان صوبوں میں سابق صوبۂ بنگال کا نام سرفہرست ہے۔

(۱) صوبۂ بنگال (۲) صوبۂ بہار (۳) صوبۂ یوپی (۴) صوبہ پنجاب (۵) صوبہ سندھ (۶) راجستھان (۷) دکن اور دیگر پاکستانی صوبے۔

قدیم تاریخ بنگال کی تاریخ کا پتہ تین ہزار سال قبل مسیح تک ملتا ہے اور برصغیر پاک و ہند کی بعض قدیم دستاویزات میں بھی اس علاقے کے حوالے ملتے ہیں۔ ایک قبیلہ جو بنگ کہلاتا تھا ایک زمانے میں یہاں آباد تھا اور لفظ بنگلہ اسی سے بنا ہے۔ ابوالفضل نے اپنی مشہور تصنیف "آئین اکبری" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ فارسی میں بنگلہ کو بنگالہ کہا جانے لگا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں بنگال میں سامی نسل کے لوگ داخل ہونے لگے تھے۔ حال ہی میں راجشاہی کے ایک مقام پہاڑ پور میں خلیفہ ہارون الرشید (۸۰۵ - ۷۸۶) کا ایک سکہ

دریافت ہوا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عرب یہاں تجارت اور اسلام کی تبلیغ کرنے میں مصروف تھے۔ سامی اقوام کی آمد کے بعد افریقہ کے زنگیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور پندرھویں صدی میں زنگی نسل کے کئی سلاطین نے بنگال میں حکومت و سلطنت سنبھالی۔

صوبہ بنگال مسلم تہذیب و تمدن کا ہمیشہ مرکز رہا ہے، اب سے ۴۔۵ نسل پہلے بنگال کے اکابر علماء و فضلاء برصغیر پاک و ہند کے عام مسلم دانشوروں کے طرز پر سوچتے تھے۔ ان کا انداز فکر تقریباً یکساں تھا۔ لیکن کمپنی کے دور حکومت نیز برطانوی دور اقتدار میں وہ پالیسیاں اختیار کی گئیں کہ عوام و خواص کے ذہنی سوتے خشک ہو گئے۔ ان پالیسیوں کا رُخ قدرتی طور پر مسلمانوں کے خلاف خصوصاً شدید تھا۔ کیونکہ انگریزوں نے اقتدار اعلیٰ مسلمانوں سے ہی حاصل کیا تھا انگریزی دور کا جائزہ لینے سے قبل ہم مختصراً مسلم دور حکومت میں مقامی زبانوں کے پھلنے پھولنے کی داستان پیش کرتے ہیں۔ تاکہ حالات و واقعات کی رفتار کا مطالعہ کرنے میں آسانی ہو جائے۔

مسلم دور حکومت میں بنگلہ زبان و ادب کی ترقی

بنگلہ زبان کی اصل آریاؤں کی روزمرہ زبان پراکرت کی مشرقی قسم ہے جس سے برعظیم پاک و ہند کے شمال و مغرب کے علاقوں میں اردو، پنجابی اور سندھی زبانیں پیدا ہوئیں۔ اس زبان میں ایسے الفاظ ۲۵۔۳۰ فی صد سے زیادہ نہیں جن کی اصل سنسکرت ہے۔ نویں صدی سے لیکر بارھویں صدی عیسوی تک

بنگلہ زبان آگے بڑھتی رہی تاآنکہ ۱۲۰۱ء میں ہندوؤں کی حکومت ختم ہوئی۔ (بحوالہ مقالہ بنگلہ ادب از جناب سید احمد رسالہ المعارف لاہور)

تیرھویں صدی عیسوی کے ابتدائی دور میں پٹھانوں کی حکومت بنگال میں باقاعدہ قایم ہوگئی اور بنگلہ ادب ان ہی پٹھان حکمرانوں کی سرپرستی میں پروان چڑھنے لگا۔ حاکموں کی زبان فارسی تھی اس کا اثر مقامی زبانوں پر بھی پڑا

شاہی دربار سے الگ صوفیائے کرام بھی عرصہ دراز سے بنگال میں اسلام اور قرآن کریم کی تبلیغ کا کام انجام دے رہے تھے، ان کی زبان عربی اور فارسی تھی۔ چنانچہ عربی اور فارسی کے ہزاروں الفاظ سے یہاں کی آبادی دن بدن مانوس ہوتی چلی گئی۔ پہلے پہل یہاں کے ادیبوں اور فن کاروں نے اسلامی ادب کے شہ پاروں کو ترجمہ کی شکل میں پیش کیا اور پھر رفتہ رفتہ وہ طبع زاد داستانیں لکھنے لگے۔

پٹھانوں کے دور حکومت میں جتنی کتابیں لکھی گئیں ان کے ناموں ہی کی فہرست پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ فارسی اور عربی سے اس وقت کی بنگلہ کتنی متاثر ہوئی۔ شاہی جنگ نامہ، قیامت نامہ، مقتل حسین، امیر حمزہ (زبینا بانی)، (ربوسار سوال)، راحت القلوب، دقایق کنایۃ المسلمین، سراج القلوب، نشاط نامہ، ابلیس نامہ، نور قندیل)۔ یہ صرف چند کتابوں کے نام ہیں۔ اس دور کی پوتھیوں کی تعداد ۱۳۵ تک پہنچتی ہے۔ زبان کم و بیش ایک جیسی ہے۔ عربی اور فارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں۔ بعض پوتھیاں عربی رسم الخط میں اعراب کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ بنگلہ کی

کتابیں عموماً دیوناگری رسم الخط میں بائیں طرف سے شروع ہوتی ہیں، محمد خاں کی مشہور تصنیف "مقتل حسین" اسی قسم کی پوتھی ہے۔ کتاب کا آغاز "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کی جگہ "اللہ بھروسے" سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد کتاب کا نام اور اس کے نیچے حمد و نعت ہے۔

"جن ہندو ادیبوں نے پوتھیاں لکھی ہیں انھوں نے بھی عربی اور فارسی الفاظ فراخ دلی سے استعمال کئے ہیں۔"

"اس زمانے میں جب پوتھیاں کثرت سے لکھی گئیں، سنسکرت اور بنگلہ کے ساتھ عربی اور فارسی کی تعلیم ضروری سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ کم و بیش تمام اچھے شاعر اور ادیب ان زبانوں سے واقفیت رکھتے تھے"۔ [1]

مسلمانوں کی فتح بنگال سے قبل ہندو بنگالی زبان کو ذلیل اور ناپاک ارواح خبیثہ کی زبان سمجھتے تھے۔ لیکن جب مسلمانوں نے اس کو اپنے سایہٗ عاطفت میں لیا اور ان کی تشویق و ہمدردی کی وجہ سے ان کے دربار کے بعض علمائے سنسکرت نے اس زبان سے بعض اہم کتابوں کا ترجمہ بنگلہ زبان میں کیا۔ تو یہاں کے ہندو راجاؤں نے بھی بنگالی مؤلفین کی تالیف طلب شروع کی۔ اور ہندو علماء نے بنگلہ زبان میں زیادہ دلچسپی لینا شروع کر دی۔

پروفیسر ڈی سی سین لکھتا ہے:۔

"بنگالی ادب کے دوسرے مورخین نے ثابت کیا ہے کہ اگر مسلمان

---

[1] گنا بچہ - بنگال کا پوتھی ادب، ص ۲۹ - ۲۱۔ مقالہ مرتبہ جناب حسن احمد اشک

صوبۂ بنگال میں نہ آتے تو بنگالی زبان نہ تو ہندو راجاؤں کے
درباروں میں جگہ پاتی اور نہ اس کے ادب کو ترقی اور وسعت
اور علمی حیثیت حاصل ہوتی"

کچھ حضرات کی تحقیق ہے کہ بنگلہ زبان کی سرپرستی اور ترقی میں ابتدا ہی سے مسلمانوں کا ہاتھ رہا ہے۔ مسٹر این این لا لکھتے ہیں:

"یہ مسلمانوں کا طفیل تھا کہ بنگالی زبان آج ہندوستان کی
زبانوں میں علمی لحاظ سے اس قدر ممتاز ہے"

"بنگال کے فرماں رواؤں کی کوششیں صرف اسلامی علوم کی ترقی ہی تک محدود نہیں رہیں بلکہ ان کی علمی سرپرستی دوسری طرف بھی منعطف ہوئی جس کا جاننا اہل بنگال کے لئے خصوصیت کے ساتھ دلچسپ ہوگا۔ انھیں یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ ان کی زبان کی ادبی اور علمی ترقی ان کی کوشش سے نہیں ہوئی بلکہ یہ درجہ مسلمانوں کی بدولت نصیب ہوا۔ اول اول ان کی دلچسپی شوقیہ تھی، اور کچھ اس وجہ سے کہ اس کا تعلق سنسکرت سے ہے جسے ہندو قوم بہت عزیز رکھتی ہے، جس سے مسلمانوں کو اکثر تعلق رہتا تھا، پہلے پہل بنگال کے مسلمان حکمرانوں نے رامائن اور مہابھارت کی طرف توجہ دی اور ان کی سرپرستی میں ان دونوں کتابوں کے ترجمے بنگالی زبان میں ہوئے"

ایسی کتابوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جن کے ترجمے فارسی اور سنسکرت

لہ مقالہ بنگالی زبان اور ادب پر فارسی کا اثر۔ از سلطان احمد بھوئیاں روزنامہ جنگ ۲۵ دسمبر ۶۵ء

سے مسلمان حکام کی سرپرستی میں بنگالی سے ہوئے۔ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ پہلے سنسکرت کے دلدادہ برہمن اور ہندو راجا بنگالی زبان کو حقارت سے دیکھتے تھے۔ لیکن اس کے بعد یہ بات نہ رہی۔ ہندو راجاؤں نے بھی مسلمان بادشاہ اور حکام کی دیکھا دیکھی بنگالی مصنفین کی قدر کرنا شروع کی۔ پھر درباروں میں بنگالی ملک الشعرا کا رکھنا ایک فیشن ہو گیا۔ [1]

مسٹر بی چودھری بنگالی ادب کی داستان میں لکھتے ہیں، کہ بنگالی زبان جو بلحاظ اصل کے ہر دلعزیز ہے اور اس میں زیادہ تر جو جمہوریت کی شان پائی جاتی ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بنگالی اہل علم کا تعلق اسلام سے رہا ہے

مسلم بنگلہ

بنگالی زبان کے متعلق غور و فکر کرتے وقت ہم لوگ اکثر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ مسلمان جو بنگلہ بولتے تھے وہ زبان عربی۔ فارسی سے زیادہ قریب تھی اور فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ اس بنگلہ کو مسلم بنگلہ کہتے تھے۔ ہندوؤں کی سنسکرت آمیز بنگلہ اور مسلم بنگلہ کے سلسلہ میں ڈاکٹر انعام الحق لکھتے ہیں:۔

---

[1] اقتباس ایڈریس محمد اکبر علی نذر علی حیدری صدر اجلاس کانفرنس کلکتہ سنہ ۱۶ ۱۹ء

این این لا کی کتاب کا ترجمہ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے اہتمام سے شائع ہو گیا ہے۔ مترجمین اخلاص حسین ایم اے اور سیدہ سلطان فاطمہ بھی ایم اے ہیں۔

"بنگالی نظم و نثر میں سنہ ۱۸۰۰ء سے جو انقلابی رُجحان شروع ہوئے تھے وہ سنہ ۱۸۵۷ء میں اچھی طرح قایم ہو گئے' اور چونکہ نیا ادب زیادہ تر ہندوؤں کا تخلیق کردہ تھا۔ اس لئے اس میں لامحالہ ان کے اصلی قومی اثرات داخل ہو گئے' اور وہ ہندو روایات اور ہندو فلسفہ و ہندو ضمنیات سے بھرا ہوا ہے۔ مگر روایتی ہندو مذاق مسلمان دماغوں میں ذرہ برابر بھی نہیں سما سکا۔"

"مسلم بنگالی یا دوبھاشی بنگلہ ویسی ہی زبان ہے جیسی کہ معیاری بنگالی۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں دوبھاشی بنگلہ کی تحریک جس کی غایت یہ تھی کہ بنگالی سے سنسکرت الفاظ نکال دیئے جائیں۔ اور بنگالی کو اردو سے قریب تر کر دیا جائے زیادہ کامیاب نہیں ہوئی" لہ

مسلمان بنگالی پرانی روایات کی پابندی کرتے ہوئے نظموں اور گیتوں کی دنیا میں بسے ہوئے تھے۔ بنکم چند چیٹر جی نے بنگالی زبان کا ڈھانچہ ہی بدل دیا۔ مسلم بنگلہ کے پھلنے پھولنے کی تاریخ بھی عجیب و غریب ہے۔ مسلم بنگلہ ہگلی، ہاوڑا۔ ۲۴ پرگنہ، کلکتہ، فرید پور، باقرگنج، باریسال اور جیسور کے علاقہ میں پروان چڑھی۔ بات یہ تھی کہ یہی وہ علاقے ہیں جہاں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی تحریکوں نے زور مارا۔ تیتو میر شہید اور دادو میاں ان ہی علاقوں کے باشندے تھے۔ ان لوگوں کی تحریکوں کو فرائضی اور وہابی تحریکوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن جب یہ دور شروع ہوا

اس وقت تک ہندو بنگالی اپنی مادری زبان کی نشو ونما میں سبقت لے جا چکے تھے۔ کیونکہ سیاسی وجوہ کی بنا پر انگریز ہندو بنگالیوں کو مسلمانوں کے مقابلے میں ہر طرح بڑھا رہا تھا، یہی وہ طرزِ عمل تھا جس کا قدرتی ردِ عمل مسلمانوں میں ابھرا۔ اور ان کو اپنی جداگانہ حیثیت کا احساس ہوا اور اس طرح مسلمان بنگالیوں نے اپنی زبان میں عربی فارسی اور اُردو کے الفاظ بڑی تعداد میں داخل کرنا شروع کر دیئے۔ اور اس طرح اچھا خاصہ مذہبی ادب پیدا ہو گیا۔

وارن ہیسٹنگز پہلا انگریز تھا جس نے بنارس کے پنڈتوں کو ادب سنسکرت کے خزانے کھولنے اور ہندو شاستروں کو سمجھنے میں مدد دینے پر راضی کیا۔ اس نے ہال ہیڈ۔ اینڈرسن ہیملٹن جیسے ماہرانِ فن اور علمی ذوق رکھنے والے انگریزوں کو ہندو شاستروں کو ترتیب دینے کی ترغیب دلائی۔[2]

فورٹ ولیم کالج کا قیام

وارن ہیسٹنگز کے بعد بنگالی زبان اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مسائل سے جن انگریزوں نے حقیقتاً دلچسپی لی ان میں لارڈ ولیم بنٹنک اور لارڈ ویلزلی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ فورٹ ولیم کے جس مدرسے اور کالج کی بنیاد کلائیو کے دَور یعنی

---

[1] صفحہ ۳۲۳۔ بنگالی ادب۔ از ڈاکٹر انعام الحق ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی

[2] وارن ہیسٹنگز از کپتان ایل۔ جے۔ ٹراٹر۔ ترجمہ۔ ص ۱۳۲۔

سنہ ۱۷۵۷ء میں پڑی تھی اور جس کے جاری رہنے کا مسئلہ سنہ ۱۷۷۴ء میں طولانی مباحثہ کا مرکز بن گیا تھا۔ ۱۰ر جولائی سنہ ۱۸۰۰ء کو باقاعدہ قایم ہو گیا اس کالج کی تاریخ مسلمانان پاک و ہند کے واسطے بڑی دردانگیز یادوں کی حامل ہے۔ کیونکہ یہی وہ تاریخ ہے جب شیر دکن سلطان ٹیپو کے جام شہادت نوش کرنے کے سال بھر بعد اس کی خوشی میں پہلی سالگرہ منائی گئی۔ قیام کالج کی دستاویز کی پیشانی پر حسب ذیل عبارت درج ہے :

"ہز لارڈشپ (ویلزلی) کے حکم خاص سے اس (دستاویز) پر یہ رسمی سنہ ۱۸۰۰ء کی تاریخ ڈالی گئی جو میسور کے دارالسلطنت سری رنگاپٹم میں برطانوی افواج کی شاندار اور فیصلہ کن فتح کی پہلی سالگرہ کی تاریخ تھی" ؎۱

جب کورٹ آف ڈائریکٹرز نے اس کالج کے قیام کی مخالفت کی تو ویلزلی نے ایک پرائیویٹ خط لکھا کہ :

"کالج کو قایم رہنا ہوگا ورنہ سلطنت ختم ہو جائے گی۔"

مسلم بنگلہ زائنصنی تحریک کا اثر کہئے یا انگریزوں اور برادران وطن کی سیاسی چالیں سمجھئے۔ بہرحال ماضی قریب کی بنگالی نسل کو عربی اور فارسی زبانوں سے اور اس کے بعد اردو عربی سے گہری محبت تھی۔ اور آج بھی وقتی لہروں کو چھوڑ

؎۱ گل کرائسٹ اور اس کا عہد عتیق صدیقی صفحات ۳۷-۱۰۴۔ نیز ملاحظہ ہو ہند کے حکمراں لارڈ ویلزلی از کپتان ایل۔ جے۔ ٹراٹر ص ٦٦

کر اسی جذبے کے تحت کم از کم عربی کی حد تک بنگالی متحد اور ہم خیال ہیں۔
جناب محمد امین عباسی چڑیا کوٹی بیان کرتے ہیں:

"میرا اپنا ذاتی تجربہ قیام پاکستان سے پہلے اکیس سالہ قیام سے ہوا کہ بنگال کے مسلمان عربی زبان کے بعد اسی زبان اردو کو مذہبی زبان سمجھتے ہیں۔ ان میں کوئی مولوی اس وقت تک مولوی نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ اردو زبان نہ جانے اور اس میں بات چیت نہ کرسکے۔ اس وجہ سے ہزاروں بنگالی ہر سال یو۔پی میں تحصیل عربی علم کے لئے محض اس وجہ سے آتے تھے کہ زبان اردو بھی سیکھ لیں ورنہ بنگال میں ان کی کوئی عزت نہ ہوتی تھی۔ اور نہ وہ مولوی سمجھے جاتے تھے۔ یو۔پی میں وہ صرف اس وجہ سے آتے تھے کہ اپنے ملک میں رہ کر ان کو اردو زبان سیکھنے کا کوئی ذریعہ نہیں ملتا تھا مدارس عربیہ بنگال میں ذریعہ تعلیم زبان اردو تھی۔"[1]

اصل یہ ہے کہ مسلمانان بنگال عرصہ دراز سے فارسی اور عربی زبانوں سے رابطہ قایم کئے ہوئے تھے، اس لئے ان کا اردو کے ساتھ دستِ تعاون بڑھانا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ بنگلہ زبان کے قدیم پوتھی ادب میں فارسی زبان کا اس کثرت سے استعمال ہوا ہے کہ آج حیرت ہوتی ہے۔ جناب علی احمد صاحب

---

[1] کتاب تعلیم و تعلم۔ مرتبہ سید الطاف علی بریلوی ص ۱۰۳

لکھتے ہیں :-

"سب سے پہلے ایک پوتھی "خیرالبشر" کا ذکر کروں گا۔ شیخ نصرالدین نے اسے لکھا ہے۔ نور محمدی کی پیدایش یعنی کائنات کی ابتدا سے لے کر قیامت تک کے حالات اس میں بیان کئے گئے ہیں۔ قیامت کے متعلق مسلمانوں کے عقیدوں کا تفصیلی بیان ہے۔ کتاب حسب معمول حمد و نعت سے شروع ہوتی ہے اور اس کی زبان ایسی ہے کہ فارسی عربی یا اردو جاننے والے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس پوتھی میں صرف ۹ لفظ بنگلہ کے ہیں اور باقی ۲۷ لفظ عربی کے ہیں"

بنگالی پوتھی ادب کی ابتدا کے بارے میں ابوالمکارم محمد سلیم اللہ فہمی کا ارشاد ہے کہ :-

"بنگال میں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت قایم ہونے سے پہلے بھی پوتھیوں کا رواج تھا۔ لیکن مسلمانوں کے ہاتھ میں طاقت نہ تھی اور اسلامی تہذیب و تمدن کا گرویدہ طبقہ اپنے ادب میں اپنے مذاق کی چیز دیکھنے کا متمنی تھا چنانچہ اس طبقہ نے پوتھی ادب کے دامن میں پناہ لی۔ برہمنی نظام حکومت اور اس زمانہ کی سنسکرت سے بھرپور زبان کے خلاف جس میں اسلامی روایات کی کوئی جھلک نہ تھی۔ یہ تحریک گویا ایک طرح کا روحانی احتجاج تھا۔ جب مسلمانوں کی حکومت کا دور شروع ہوا تو ان کی آرزوئیں پوری ہوئیں۔ وقت اور گزرا تو ان کے دلوں میں یہاں کی بل کھاتی ہوئی ندیوں اور سدابہار ہریالی نے جوش پیدا کر ہی دیا تھا۔ اس پر یہاں کے باعمل علما اور صوفیائے کرام نے ان کے دلوں کو اسلام کی روشنی سے منور کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ادیب اپنے مذہب اپنی روایات اور اپنے اصول زندگی کو عوام تک پہنچانے لگے۔ انھوں نے اسلامی موضوعات

کو عوام کی صاف اور سادہ زبان میں نظم کرنا شروع کر دیا۔ خیال اور انداز فکر تو اسلامی تھا ہی مقامی زبان کو بھی ان موضوعات کے لئے اپنا دامن وسیع کرنا پڑا۔ فارسی اور عربی کے الفاظ اور محاورات بلا تکلف استعمال کئے گئے۔ اکثر پوتھیاں ایسی ہیں جن کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ فارسی اور عربی سے لفظی ترجمہ کیا گیا ہے۔ لیکن یہ اصل سے بہت قریب ہیں۔ خاص طور سے چاٹگام ڈھاکہ اور نواکھالی میں جو پوتھیاں لکھی گئی ہیں ان میں فارسی اور عربی کی اکثریت نمایاں ہے[1]۔ خود صوبہ بنگال میں پچاس ساٹھ سال پیشتر زبان بنگلہ عربی فارسی دونوں میں لکھی جاتی تھی۔ چنانچہ میں نے خود سینکڑوں کتابیں زبان بنگلہ کی عربی حروف میں چھپی ہوئی دیکھی ہیں داستان امیر حمزہ پوری آٹھ دس جلدوں میں بنگلہ زبان میں عربی حروف میں چھپی ہوئی دیکھی ہے۔ پھر اس کے بعد سیاسی انقلاب پیدا ہوا اور ہندو بنگالیوں کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ اگر یہی لیل و نہار رہے تو یہ صوبہ بھی پنجاب کی طرح اردو کا مرکز ہو کر رہ جائے گا۔ لہٰذا ہندو بنگالیوں نے زبان کی طرف اپنی توجہ منعطف کی پہلے زبان کو حتی الوسع عربی و فارسی الفاظ سے پاک کیا اور اس کی جگہ پر سنسکرت الفاظ بھرنے شروع کئے۔ اور تمام ملک ایسی کتابوں کی تصانیف میں منہمک ہو گیا جن میں سنسکرت الفاظ کی بہتات تھی۔ سینکڑوں دل چسپ ناول ایسی بنگلہ زبان میں لکھے گئے اور شائع ہونے لگے۔ جن میں سنسکرت الفاظ بجائے عربی فارسی کے بھرے ہوئے تھے، اور بتدریج اس اقتدار کے جو ان کو ملک میں حاصل ہو چکا تھا۔ ایسے

---

[1] کتابچہ بنگالی پرٹی ادب ص ۱۴ - ۱۵

نصاب مدارس ابتدائیہ میں داخل کئے گئے جس میں اپنے مذہب اور کلچر کو پوری طرح داضح کیا گیا تھا۔ چنانچہ اسّی پچاسی برس کی سعیٔ مسلسل سے زبان بنگلہ سر سے پاؤں تک بالکل بدل گئی۔ مسلمانوں کی غفلت کا یہ عالم تھا کہ ٹیکسٹ بک کمیٹی میں وہ کتابیں منظور کرالی جاتی تھیں۔ جن میں کھلے الفاظ میں مذہب اسلام پر حملے ہوتے تھے باوجود یکہ اس کے ممبر مسلمان بھی تھے، لیکن ان میں کون اس زحمت کو گوارا کرتا کہ پہلے اس کو ایک نظر دیکھتا بلکہ رجماً بالغیب اس کو منظور کرلیتے تھے۔ کچھ دنوں بعد ملک میں شورش پیدا ہوئی اور قتل و خون ریزی کی نوبت آئی۔ چونکہ اصولاً ہر زبان کا لٹریچر اسی قوم پر حکومت کرتا ہے، اس لئے تمام اسی رنگ میں رنگ گئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی اور عہد ملکہ وکٹوریہ کی تعلیمی سرگزشت

مسلم دور حکومت میں بنگلہ زبان کی جو سرپرستی ہوئی اس کی مختصر داستان آپ نے پڑھی۔ اب برطانوی اقتدار کی آمد آمد شروع ہوتی ہے۔

سنہ ۱۶۰۰ء میں پہلی مرتبہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے شہنشاہ جہانگیر سے سورت کے مقام پر اپنی تجارتی کوٹھی کھولنے کی اجازت حاصل کی یہ اجازت کچھ عرصے کے بعد واپس لے لی گئی۔ لیکن سنہ ۱۶۱۲ء میں دوبارہ دیدی گئی۔ سنہ ۱۶۱۵ء میں سر طامس رو جہانگیر کے دربار میں آیا۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے واسطے مراعات حاصل کرنے کے واسطے تین سال تک دہلی میں مقیم رہا۔ پانچویں مغل بادشاہ کے دور میں ایک انگریز ڈاکٹر کی خدمات کے صلہ میں کمپنی کو تجارتی سہولتیں حقیقی معنی میں حاصل ہوگئیں۔ اس لحاظ سے سنہ ۱۶۵۰ء وہ سال تھا جب ایسٹ انڈیا

کمپنی بغیر ٹیکس ادا کئے تجارت کرنے لگی۔ اس کے دفاتر ہگلی، سورت اور دیگر مقامات پر قایم ہو گئے۔ کمپنی نے کلکتہ کی بنیاد سنہ ۱۶۹۰ء میں ڈالی

کمپنی کی تعلیمی کہانی

ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستانیوں کی تعلیم سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، اس کی غرض تو صرف نفع کمانا تھا۔ لیکن حکومت اور سلطنت کے تقاضے بہرحال مجبور کرتے ہیں۔ لہذا کمپنی کو بھی اپنے برطانوی، پرتگیز یوریشین ملازموں کے واسطے سب سے پہلا اسکول سنہ ۱۶۷۰ء میں بمقام مدراس کھولنا پڑا سنہ ۱۶۹۸ء میں جب تاج برطانیہ نے کمپنی کو تجارتی سرگرمیاں جاری رکھنے کے معاہدے کی تجدید کی تو اس میں ایک شق اس مضمون کی رکھی گئی کہ تبلیغ کرنے والوں کو ہر ایک فیکٹری میں ملازم رکھنا لازمی ہوگا۔ نیز انگلستان سے جو بھی جہاز پانچسو ٹن وزنی روانہ ہوگا اس میں ایک پادری ضرور سفر کریگا۔ اس ضابطہ کے تحت فیکٹریوں کے مزدوروں اور سپاہیوں کے واسطے اسکول کھولنے کا حکم دیا گیا۔ اس قسم کے اسکول سنہ ۱۷۱۸ء میں بمبئی اور کلکتہ میں کھولے گئے۔ بعد ازیں تنجور و کانپور میں کھولے گئے۔ یہ تعلیمی سرگرمیاں بہت محدود پیمانہ پر تھیں۔ سنہ ۱۷۷۳ء میں پہلا سیکنڈری اسکول مدراس میں کھولا گیا۔ مسٹر پرنگل اس کے نگراں تھے۔ اس اسکول میں فرنچ اور انگریزی اور دیسی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا تھا۔ کمپنی نے سنہ ۱۸۰۰ء میں بمقام کلکتہ فورٹ ولیم کالج قائم کیا اور سنہ ۱۸۱۸ء میں سینٹ جارج کالج مدراس کی بنیاد رکھی۔ ان اداروں کا مقصد یہ تھا کہ کمپنی کے ملازمین ہندوستانی زبانیں سیکھ سکیں۔ بقول میجر باسو سنہ ۱۸۲۴ء میں دو لاکھ روپے ان اداروں پر صرف کئے جاتے تھے۔ مدراس میں دو اسکولوں

میں دیسی زبانوں کے ذریعے تعلیم دی جاتی تھی۔ جو بعد کو انگریزی میں تبدیل کردی گئی سنہ ۱۷۸۱ء میں وارن ہیسٹنگز نے جو خود بنگالی اور فارسی زبانوں سے واقف تھا۔ کلکتہ مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ اس مدرسہ کی تعلیمی زبان عربی تھی۔ اور مدت درس ۷ سال۔ مضامین فلسفہ، مبادیات قرآن، قانون، جیومیٹری اور گرامر وغیرہ تھے۔ سنہ ۱۷۸۴ء میں کمپنی کی حکمرانی پر برطانوی تاج کی نگرانی قائم ہو گئی۔ سنہ ۱۷۹۱ء میں جون ناتھن ڈنکن نے بمقام بنارس سنسکرت کالج قایم کیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۲۴ء میں آگرہ، دہلی اور کلکتہ میں علوم مشرقیہ کے کالج قایم ہوئے۔ کلکتہ ایجوکیشنل پریس نے سنسکرت، عربی اور فارسی کی بہت سی کتابیں چھاپیں۔ نیز عربی، سنسکرت اور فارسی سے ترجمے بھی کرائے۔ یہ ترجمے طالب علموں کے واسطے کارآمد تھے۔ لیکن یہ پالیسی زیادہ دن تک نہیں چل سکی۔

بنگالی مشنری اسکول

سیرام پور مشنریوں کا تعلیمی اور تبلیغی مرکز تھا۔ انھوں نے سنہ ۱۸۱۵ء میں پندرہ اسکول قایم کئے۔ نیز ایک پرنٹنگ پریس بھی قایم کیا جس نے نمایاں خدمت انجام دی۔ سیرام پور کالج کا قیام سنہ ۱۸۱۸ء میں عمل میں آیا۔ ایک اخبار سماچار درپن نامی بھی جاری ہوا۔ اس کے علاوہ لندن مشنری سوسائٹی نے چھتیس پرائمری اسکول قایم کئے۔ کیپٹن اسٹیورٹ چرچ مشنری سوسائٹی نے دس ورناکیولر اسکول قایم کئے۔ سنہ ۱۸۲۰ء میں بشپ کالج قایم ہوا۔ سنہ ۱۸۳۰ء میں الیگزنڈر اسکاچ نے مشنریوں کی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع کردیا۔ اس نے ایک دفعہ بیان کیا کہ

۔ مغربی تعلیم کی ہر ایک شاخ ہندوستان کے کسی نہ کسی اثر کو متبادل طور

پر زائل کرے گی۔ ۵

<u>ذریعہ تعلیم کا مسئلہ</u>:۔ اوائل انیسویں صدی سے انگریزوں کے سامنے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ ممالک محروسہ بنگال، مدراس اور بمبئی میں کون سی زبان یا زبانیں اختیار کی جائیں جن زبانوں میں انتخاب ہونا تھا وہ عربی، فارسی سنسکرت اور انگریزی تھیں۔ عوامی تعلیمی کمیٹی میں اورینٹلسٹوں کی اکثریت تھی۔ اور ایچ ٹی پرنسپ ان کے قائد تھے۔ یہ صاحب اس زمانہ میں بنگال کے محکمۂ تعلیمات کے سکریٹری بھی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانی انگریزی علوم اور سائنس کے خلاف ہیں۔ اس لئے مغربی علوم کو عام علاقائی زبان میں پیش کرنا مفید ہوگا۔ چنانچہ عوام میں دلچسپی پیدا کرنے کے واسطے وظائف تعلیمی کا بندوبست کیا گیا۔ فارسی عربی اور سنسکرت میں مغربی علوم کے ترجمہ کا کام زور شور سے شروع کیا گیا۔ دوسرا گروہ اینگلس کا تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ تعلیم انگریزی زبان میں دی جائے۔ ان دونوں گروہوں میں دو باتوں پر اتفاق تھا

(۱) مقامی زبانیں چونکہ نامکمل ہیں اس لئے ان کو ذریعۂ تعلیم نہ بنایا جائے۔ صرف تین زبانیں اس مرتبے کی اہل ہیں

(۱) عربی (۲) فارسی (۳) سنسکرت

(۲) گورنمنٹ کو چاہئے کہ تعلیم صرف اعلیٰ اور متوسط طبقہ تک محدود

---

۵ تاریخ التعلیم (انگریزی) از پی۔ این۔ راوت ص ۲۰۸

رکھے۔ کیونکہ تعلیمی خرچ برداشت سے باہر ہو جائے گا۔

جب یہ کشمکش جاری تھی اس دوران میں ۱۰ر جون سنہ ۱۸۳۴ء کو لارڈ میکالے وارد ہندوستان ہوا اور جنرل کمیٹی کے صدر کے منصب پر فائز ہوا۔ اس شخص کے خیالات عجیب و غریب تھے۔ اس کا خیال تھا کہ عربی و فارسی کی ترویج و اشاعت پر جو روپیہ صرف ہوا وہ بے کار گیا۔ اس کے خیال میں گورنمنٹ ان اداروں کو حکماً بند کرنے کی مجاز تھی۔ کلکتہ مدرسہ چونکہ اسلامی علوم سے وابستہ تھا۔ اس لئے اس مدرسہ پر خصوصی نظر پڑی وہ ہندو کالج اور کلکتہ مدرسہ کا مقابلہ کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ مدرسہ جاری رکھنا مناسب نہیں ہے وہ انگریزی زبان کو بہترین ذریعۂ تعلیم قرار دیتا ہے۔ لارڈ میکالے کی تجاویز کے بارے میں جنرل کمیٹی میں زبردست ہنگامہ ہو گیا اور کمیٹی دو حصوں میں بٹ گئی۔ لیکن بالآخر لارڈ میکالے کو بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی اور لارڈ ولیم بنٹنگ نے مندرجہ ذیل سفارشات ایک رزولیوشن کی شکل میں منظور کر لیں۔ جو درج ذیل ہیں:

(۱) برطانوی گورنمنٹ کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں یورپین لٹریچر اور سائنس کی ترقی ہو۔

(۲) مشرقیات کے ادارے بند نہ کئے جائیں اور ان اداروں سے وابستہ افراد کو حسب سابق تنخواہ اور طلباء کو وظائف ملتے رہیں۔

(۳) آئندہ مشرقی علوم پر کتابیں چھاپنے کا سلسلہ بند کر دیا جائے۔ کیونکہ سابق میں کافی رقم غیر مناسب طور پر خرچ کی جا چکی ہے۔

(۴) جو رقم مندرجہ بالا تجویز کے نتیجہ میں بچے وہ ہندوستان میں انگریزی لٹریچر اور سائنس کے فروغ پر خرچ کی جائے اور ذریعۂ تعلیم انگریزی ہو

لارڈ ولیم بنٹنگ کے ریزولیوشن مورخہ ۷ مارچ کا متن حسب ذیل ہے:

گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی یہ رائے ہے کہ حکومت برطانیہ کا بڑا مقصد اہل ہند میں یورپین لٹریچر اور سائنس کی اشاعت کرنا ہے اور جس قدر رقوم مقاصد تعلیم کے لئے مخصوص ہیں وہ صرف انگریزی تعلیم پر صرف ہونی چاہئے۔ ہز لارڈشپ کا یہ منشا نہیں ہے کہ دیسی تعلیم کے کسی ایسے کالج یا مدرسے کو توڑ دیا جائے جس کے فوائد سے دیسی لوگوں میں تمتع حاصل کرنے کا شوق پایا جاتا ہے۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل طلبا کو زمانۂ تعلیم میں وظائف دینے کا عمل قابل اعتراض خیال کرتے ہیں ان کی رائے میں یہ ان علوم کی تشویق کی مصنوعی ترغیب ہے اور جب زیادہ مفید علوم کی تعلیم دی جائے گی تو یہ خود بخود ان پر سبقت لے جائیں گے۔ اس لئے وہ ہدایت کرتے ہیں کہ آئندہ کسی طالب علم کو کسی قسم کا کوئی وظیفہ نہ دیا جائے اور جب کبھی مشرقی تعلیم کے کسی پروفیسر کی جگہ خالی ہو تو اس کی رپورٹ گورنمنٹ کو کی جائے اور ساتھ ہی یہ بتایا جائے کہ جو جماعت اس کے زیر تعلیم تھی اس میں طلبا کی کیا تعداد ہے اور اس جماعت کی کیا حالت ہے۔ تاکہ گورنمنٹ اس کے جانشین کے

تقرر پر غور کر سکے۔

ہز لارڈ شپ بہ اجلاس کونسل کو یہ اطلاع ملی ہے کہ کمیٹی نے رقم خطیر مشرقی کتب کے طبع کرنے میں صرف کی ہے۔ ہز لارڈ شپ بہ اجلاس کونسل ہدایت کرتے ہیں کہ آئندہ ان رقوم کا کوئی جز اس کام میں نہ لایا جائے۔

ہز لارڈ شپ بہ اجلاس کونسل ہدایت فرماتے ہیں کہ وہ تمام رقوم جو ان اصلاحات کی رو سے کمیٹی کے قبضے میں آئیں وہ آئندہ دیسی لوگوں میں انگریزی زبان کے ذریعے سے انگریزی علم و ادب اور سائنس کی اشاعت میں صرف کی جائیں۔

اس ریزولیوشن پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ مسٹر ہنری ٹامس پرنسپ ممبر گورنر جنرل کونسل اور میکالے میں سخت مکالمے ہوئے۔ تعلیمی کمیٹی کے صدر مسٹر شیکپیئر نے بطور احتجاج استعفیٰ دیدیا اور اس کی جگہ لارڈ میکالے کا تقرر ہوا جو خود ہی ریزولیوشن کی اصل روح کا منادی تھا۔ لہٰذا کمیٹی نے اس ریزولیوشن کی تعمیل ایسے عجیب طریقے سے کی کہ مشرقی تعلیم کا خاتمہ ہی ہو گیا۔ اس ریزولیوشن پر اس طرح عمل ہوا کہ مشرقی مدارس کا زور کم کر دیا گیا ان کی گرانٹ چھین کر انگریزی جماعتوں کی امداد پر صرف کی گئی۔ دیسی زبان کی تعلیم کے لیے جداگانہ جماعتیں جہاں کہیں بھی تھیں توڑ دی گئیں اور اس تعلیم کو انگریزی کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا۔ وظائف تعلیمی بند کر دیئے گئے۔ اس بات پر سخت ناراضگی پھیلی اور لارڈ آکلینڈ نے ۱۸۳۹ء میں طے کیا کہ لارڈ بنٹنگ کے ریزولیوشن سے قبل جو جو رقمیں جن مشرقی علوم کے واسطے مخصوص

تھیں وہ سب ان کو دی جائیں اور انگریزی تعلیم کے لئے مزید رقم کی ضرورت ہو تو اس کے لئے جدید منظوری لی جائے صفحات ۲۱، ۲۲ کتاب مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو ہند (۱۹۴۵ء)

دراصل لارڈ میکالے انگریزی کلچر، تہذیب و تمدن زبردستی ہندوستانیوں کے سر تھوپنا چاہتا تھا۔ ادھر تو یہ فیصلے ہو رہے تھے ادھر صوبہ بمبئی میں دیسی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنا دیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ سنسکرت اور انگریزی کو بھی خاص اہمیت دی گئی۔ لیکن جب سر ارکن پری پریسیڈنٹ بورڈ مقرر ہوئے تو انھوں نے انگریزی ذریعہ تعلیم قرار دینے کی پرزور حمایت کی اس مسئلہ پر بڑی بحثیں ہوئیں۔ گرچہ ۵ر اپریل سنہ ۱۸۴۸ء کو فیصلہ ہوا تھا کہ ابتدائی اور سیکنڈری اسکولوں میں مادری زبان ذریعہ تعلیم ہوگی اور ہائر سیکنڈری میں انگریزی کو یہ مقام حاصل ہوگا۔ لیکن آہستہ آہستہ انگریزی زبان ہی چھا گئی جو حکمرانوں کی زبان تھی اور ترقی یافتہ سمجھی جاتی تھی۔ یہی انگریزوں کا منشا تھا۔ ۱۸۲۹ء میں جس قسم کے حالات تھے اس کے تحت لارڈ آکلینڈ نے بہرحال طے کیا کہ انگریزی اور دیسی زبان کی مشترکہ تعلیم کا جو اصول اس وقت رائج ہے وہی مناسب ہے اور کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔

سنہ ۱۸۵۴ء میں سر چارلس وڈ بورڈ آف کنٹرول کے چیئرمین تھے، ذریعہ تعلیم کے بارے میں سر چارلس کے مراسلہ میں کہا گیا کہ اچھی کتابوں کی عدم موجودگی کے سبب دیسی زبانیں ذریعہ تعلیم قرار نہیں دی جا سکتیں اس لئے مجبوراً انگریزی ذریعہ تعلیم قرار دی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ صرف انگریزی

زبان کے ذریعہ تعلیم دینا نقصان دہ ہے اس لئے ساتھ ساتھ دیسی زبانوں کا استعمال بھی ضروری ہے۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں ہنٹر کمیشن نے سفارش کی کہ ابتدائی تعلیم کے مرحلوں سے انگریزی کو بالکلیہ خارج کر دیا جائے اور انگریزی تعلیم تیرہ سال کی عمر سے شروع کی جائے۔

یہ وہ تاریخی پس منظر ہے جس کی روشنی میں ہمیں مسلمانان بنگال وبہار بالخصوص اور دیگر صوبوں کی سیاست تعلیمی اور تمدنی حالت کو بالعموم دیکھنا چاہیئے۔ ورنہ ہم ان عوامل کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے جن کے اثرات بد ہم آج تک محسوس کر رہے ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر ہم سب سے پہلے اگلے باب میں بنگالی زبان کے سلسلے میں انگریزوں کی پالیسی کے مسئلہ کو لیتے ہیں۔

بنگلہ زبان اور انگریز

مسلمان بنگلہ تیرھویں صدی سے عربی رسم الخط میں موجود تھی۔ انگریزوں نے اس جاندار علمی و لسانی سرمایہ کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ بادی النظر میں ان کے اس اقدام کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں:

(۱) ہندوؤں کو عیسائیت کی طرف مائل کرنا

(۲) مسلمانان بنگال کا ماضی قریب نیز ہندوستان کے دیگر صوبوں سے لسانی و ذہنی رشتہ منقطع کرنا۔

پروفیسر شبیر احمد نے اس نکتہ کو خوب سمجھا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ان کارروائیوں سے انگریزوں کا مقصد کیا تھا۔ اگر ان کا مقصد

بنگالی زبان کو ترقی دینا تھا، تو بنگالی زبان تو پہلے ہی سے ایک اچھے خاصے ادب کی مالک تھی۔ جو عربی رسم الخط میں تحریر تھا۔ ذرا سی مدد سے وہ ادب کہاں سے کہاں جا پہنچتا۔ نہ اس میں الفاظ کے ہجے مقرر کرنے پڑتے اور نہ اظہار خیال کے لئے الفاظ کی ترتیب و تنظیم میں کوئی دشواری پیش آتی۔ ہر چیز پہلے سے موجود تھی۔ اور اس پر طرہ یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں اسے استعمال کر رہے تھے۔ اگرچہ ہندوؤں میں وہ زیادہ مقبول نہیں تھی تو انگریزوں کی کوششوں سے ہو جاتی اور اس طرح سے ایک بنگالی لٹریچر جس کی ابتدا تیرھویں صدی شمسی میں ہوئی تھی قایم رہتا۔ بلکہ اس وقت تو وہ لٹریچر ہندوستان کی تمام جدید زبانوں کے لٹریچر سے قدیم ترین ہوتا۔ لیکن انگریزوں نے ان تمام باتوں کو نظر انداز کرکے ایک نئے لٹریچر کی جو خیالات۔ طرز ادا اور رسم الخط سب کے لحاظ سے بالکل نیا تھا بنیاد ڈالی اس کی ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ انگریز ہندوؤں کو عیسائی بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ لیکن جب تک ہندوؤں کی زبان و ادب اور خیالات ایک ایسی جماعت سے مشترک رہتے جو دنیا کی تنہا موحد جماعت تھی، اس وقت تک انگریزوں کے تثلیثی عقاید کا اثر جن کی بنیاد بت پرستی اور توہم پرستی سے کچھ زیادہ نہیں تھی، ان پر نہیں پڑ سکتا تھا اس لئے انگریزوں نے سوچا کہ سب سے پہلے ہندوؤں کو زبان، خیالات اور قومیت کے تصور سے مسلمانوں سے جدا کر دو تاکہ ان کو عیسائی بنانے کا کام آسان ہو جائے اور برطانوی حکومت کی بنیادیں مضبوط ہو جائیں۔ یہ بات جارج اسمتھ کے اس بیان سے بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ بنگالی ادب کا ہر ورق عیسائیت کا مبلغ تھا۔ [۱]

بنگالی کو ایک ادبی زبان بنانے کا مقصد یہ تھا کہ ہندو بنگالیوں کو ایک قوم بناکر پورے ہندوستان سے الگ کر دیا جائے۔

ایک دوسرا مصنف ہیمیٹن اپنی کتاب بایوگرافیکل اسٹڈیز ان ماڈرن انڈین ایجوکیشن کے صفحہ ۱۲۳ پر عیسائی مبلغ الیگزنڈر ڈف کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :-

"یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مشنری نے ورناکیولر زبانوں کے متعلق مناسب اور دانشمندانہ رویہ اختیار کیا۔ لیکن یہ صرف ایک حد تک صحیح ہے۔ کیونکہ اس نے ان بولیوں کو جدید علوم اور عیسائیت پھیلانے کے لئے استعمال تو کیا لیکن اس کا مقصد یہ تھا کہ بنگال پر انگریزی تہذیب کو جلد سے جلد مسلط کر دیا جائے اور انجام کار ہندوستان کو مکمل طور پر اپنے قدیم تہذیبی ورثہ سے کاٹ دیا جائے۔

مندرجہ بالا مقاصد کے حصول کے واسطے کون کون سے حربے اور طریقے اختیار کئے گئے۔ وہ تاریخ کا ایک المناک باب ہیں۔

سرزمین بنگال قدرتی مناظر، سرسبز و شاداب جنگلوں، ندی نالوں سے بھرپور ہے۔ یہاں کے باشندے محنتی، جفاکش، مذہبی خیالات کے حامل ہونے کے ساتھ لوک گیتوں اور رقص و سرود کے بھی رسیا ہیں۔ بنگلہ بولی بھی اسی کیفیت سے پوری طرح متاثر ہے۔ جو لوگ بنگلہ زبان سے ناواقف ہیں، وہ بھی ریڈیو، ٹیلویژن پر بنگلہ گیتوں کو سننے کے دوران وجد میں آجاتے ہیں۔ چنانچہ

ؔ مقالہ عربی رسم الخط میں بنگالی زبان از پروفیسر شبیر احمد۔ العلم، کراچی

پروفیسر شبیر احمد نے بنگالی زبان کی شیرینی گھلاوٹ اور بے ساختگی پر تبصرہ کرتے ہوئے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ

"بنگالی زبان جو عوام بولتے ہیں ایک بہت میٹھی زبان ہے سننے والوں کو بھی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ عورتوں کی زبان پر اس کے الفاظ زیادہ دل کش معلوم ہوتے ہیں۔ اس زبان کو سنسکرت کے الفاظ کی بھرمار سے سادھو بھاشا بنا دیا گیا ہے۔ یعنی ایک ایسی زبان جس میں ہندوؤں کے مذہبی عنصر کوٹ کوٹ کر بھر دیئے گئے ہوں۔"[۱]

یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہوا۔ عیسائی مشنریوں نے اپنی تبلیغ بنگالی زبان میں شروع کر کے اس زبان کے تحریری مواد میں تیزی کے ساتھ اضافہ کیا۔ یہ جذبۂ ہمدردی اور جوش بے وجہ نہ تھا۔ کمپنی کے خیال میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ فارسی کے بجائے انگریزی ریاستی زبان قرار پائے اور بنگالی بنگال کے رہنے والوں کی زبان رہے ۱۸۳۵ء میں فارسی کے بجائے انگریزی بنگال میں رائج کی گئی۔ اس طرح بنگالیوں میں فارسی پڑھنے کی بہت حد تک ہمت شکنی کی گئی اور ساتھ ہی ساتھ انگریزی کی مزید قبولیت ہوئی۔ نیز بنگالی کو سنسکرت آمیز بنانے کے واسطے میدان صاف کیا گیا انگریزوں نے بنگالی کو سنسکرت آمیز بنانے کی کوششیں اس زبان سے ہمدردی کے تحت نہیں کیں اور نہ ہی یہ کوششیں اس واسطے کی گئیں کہ

---

[۱] العلم۔ کراچی اپریل تا جون ۱۹۶۰ء

اس طرح فارسی کو زوال ہو بلکہ ان کا خیال تھا کہ بنگالی عوام سنسکرت آمیز بنگالی کے مقابلے میں یقیناً انگریزی کو اپنا سکیں گے،" لے

ریاستی زبان کی تبدیلی مس میو کی نظر میں

ریاستی زبان کی تبدیلی اور فارسی کی تعلیم کی ہمت شکنی، نیز بنگلہ کو سنسکرت آمیز کرنا ایسی ناپاک کوششیں تھیں جن کے المناک نتائج برآمد ہوئے اور مسلمانوں کو نسل در نسل نقصانات اٹھانا پڑے۔ مس میو نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "مدر انڈیا" میں اس حقیقت کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔

"ایک چھوٹا سا بیج بویا گیا اور اس کے پھل سے ہم متمتع ہو رہے ہیں۔ یہ عدالتوں کی زبان کی تبدیلی تھی، فارسی کی جگہ انگریزی رائج کر دی گئی۔ ہندوستان کی تعلیم کو مغربیت کا رنگ دینے کے لئے یہ لازمی عمل تھا۔ بظاہر یہ تبدیلی معمولی معلوم ہوتی تھی اور اس کے نتائج بھی معمولی دکھائی دیتے تھے۔ لیکن مسلمانوں نے اس تبدیلی پر سخت احتجاج کیا اور فی الواقع یہ ان کے لئے سخت بربادکن تبدیلی تھی؟" لے

تبدیلی زبان کی پالیسی کے نتائج

اب ایک طرف تو بنگلہ زبان کو سنسکرت آمیز کر کے غیر اسلامی خیالات و افکار کا مخزن بنایا گیا۔ دوسری طرف مسلمانوں کو مالی اعتبار سے تباہ کرنے کی کامیاب سازشیں کی گئیں۔ جوں جوں بڑے بڑے

لے پاکستان کی قومی زبان از جناب ایچ ایم متین صفحہ ۱۸۱

خاندانوں کی مالی حالت کمزور ہونا شروع ہوئی۔ اسی تناسب سے ان کو اپنی آل اولاد کو تعلیم دلانے کی سکت کم ہونے لگی اور جب تعلیم کم ہوئی تو مسلمانوں کے بچوں پر اعلیٰ حکومتی عہدوں کے دروازے بند ہونا شروع ہو گئے۔ ویسے بھی انگریز عام تعلیم کے خلاف تھے۔ کیونکہ امریکہ میں تعلیم عام کرنے کی وہ قیمت ادا کر چکے تھے۔ لہٰذا ایسی غلطی اپنے مقبوضات میں دہرانا نہیں چاہتے تھے، ایک مرتبہ جب ایک انگریز سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو اس نے معصومیت کے ساتھ کہا

"اگر دیسیوں کو تعلیم کی ایسی ہی خواہش ہے تو وہ حصول تعلیم کے لیے انگلستان آ سکتے ہیں"[۱]

انگریزوں کا عوامی تعلیم سے اجتناب بڑی دور اندیشی پر مبنی تھا ایک مرتبہ لارڈ ایلن برا نے دوار کا ناتھ ٹیگور سے کہا۔

"آپ تو اس بات سے واقف ہیں کہ اگر دیسیوں کو تعلیم دینے میں یہ لوگ کامیاب ہو جائیں تو پھر ہم تین ماہ سے زیادہ اس ملک میں نہیں رہ سکتے۔"

اس پر دوار کا ناتھ نے کہا کہ۔

"تین ماہ تو زیادہ ہیں تین ہفتوں سے زیادہ نہیں رہ

۱۔ بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی سنہ ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء از عبداللہ ملک صفحہ ۱۵۴ مجلس ترقی ادب لاہور مطبوعہ ۱۹۶۷ء

سکے" اور یہ اس کا کہنا بالکل درست تھا۔" [۱]

عوامی تعلیم کے ضمنی مسئلہ سے قطع نظر ہم دوبارہ اپنے موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ کمپنی کی پالیسیوں کے نتیجے میں مسلمانوں کی تعلیمی زبوں حالی ضرب المثل بن گئی تھی۔ سرعبدالرحیم لکھتے ہیں۔

"ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورِ حکومت میں بھی آج سے تین نسل پیشتر بنگال کا زیادہ حصہ مسلمان جاگیرداروں اور زمینداروں کے قبضے میں تھا۔ اور انتظام دیوانی مسلمان افسروں کے ہاتھ میں مثلاً دیوان، مفتی، قاضی، مولوی، صدرِ اعلیٰ، صدرامین اور کوتوال علاوہ محرروں اور نقل نویسوں کے سب مسلمان ہوتے تھے۔ تعلیم کا رواج تھا اور میں یہ کہنے کو تیار ہوں کہ اس زمانے میں زیادہ تعلیم یافتہ افراد کا شمار تھا۔ ہر باوقعت مسلمان اپنے مکان کے ساتھ ساتھ ایک مکتب اور ایک مدرسہ رکھتا تھا۔ ان مدرسوں سے عربی فارسی کے ماہرین پیدا ہوتے تھے جو عدالتوں میں وکیل اور منصف کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیتے تھے۔ میں نے ان مدرسوں کو تباہ شدہ حالت میں دیکھا ہے۔"

فوجی اقتدار حاصل کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی اولیں پالیسی یہ ہوئی کہ اس نے مسلمانوں کو فوج میں بھرتی کرنا بند کر دیا۔ دیوانی اور پولیس کے انتظامات کی تفصیل پر مسلمان افسروں کی مدد سے عبور حاصل کرنے کے

---

[۱] معاشی تاریخ ہند جلد دوم (ترجمہ) ص ۲۲۷۔ از رامیش دت

بعد کورٹ آف ڈائرکٹرز کے اختلاف آرا کے باوجود کمپنی نے اپنی پالیسی یکایک تبدیل کر دی اور بنگالی و انگریزی کو اردو و فارسی کے بجائے عدالتوں میں جگہ دی۔ یہ تبدیلی سیاسی بنا پر ہوئی۔ جس کے لیے انتظامی اسباب بھی موجود تھے۔" [۱]

مسٹر کیئر ہارڈی لکھتا ہے :-

"میکس ملر نے تعلیم کے متعلق سرکاری کاغذات اور مشنریوں کی رپورٹوں کی بنیاد پر دعویٰ کیا ہے کہ برطانوی اقتدار سے قبل بنگال میں اسی ہزار مدرسے تھے۔ گویا آبادی کے چار سو افراد پر ایک مدرسہ کا اوسط تھا۔ (بحوالہ صفحہ ۱۶ "ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں ہندوستان میں تعلیم کی تاریخ" از بسجر بی ڈی باسو سیکنڈ ایڈیشن۔ ماڈرن ریویو آفس کلکتہ)"

ہندوؤں نے وقت کی تبدیلی کو بر وقت سمجھ لیا۔ چنانچہ کپتان ٹرنر نے پارلیمنٹ کے روبرو شہادت پیش کرتے ہوئے کہا (۲۲ مارچ سنہ ۱۸۳۲ء) :

"کلکتہ کے ہندوؤں نے انگریزی سیکھنے میں بے پناہ دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور اس کے لئے اخراجات برداشت کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔" [۲]

ایک اور ہم عصر انگریز ایس۔ سی بریل کا بیان ہے کہ :-

---

[۱] خطبہ صدارت سر عبدالرحیم اجلاس کانفرنس ۱۹۲۶ء ... دہلی

[۲] کتاب بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء از عبداللہ ملک صفحات ۱۹۹ - ۲۲۶۔

"کچھ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جیسے جیسے مسلمانوں کی حکومت کمزور پڑرہی تھی، ہندوؤں میں احیا ہو رہا تھا۔ یہ صورت حال پورے ہندوستان میں رونما ہو رہی تھی لیکن بنگال میں ہندوؤں کے احیاء کی رفتار زیادہ تیز تھی۔ اس لئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بنگال میں انگریزوں کے مددگار اور حامی کلیتہً ہندو یا ان کے گماشتے تھے۔"[1]

مندرجہ بالا حالات میں مسلمانوں کا ملی وجود قائم رکھنے اور علمی اداروں کے اخراجات چلانے کا واحد ذریعہ وقف جائدادیں تھیں۔ چونکہ بنگال میں صدیوں تک مسلمانوں کو اقتدار اعلیٰ حاصل رہا ہے نیز مسلسل جنگی خدمات کے سلسلے میں ان کو برابر جاگیریں بطور انعام ملتی رہیں اس لئے کمپنی کے دور اقتدار کے کافی عرصے بعد بھی مسلمانوں میں کمال درجہ خوش حالی اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا مسلمانوں کی یہ سربلندی انگریزوں کو سخت ناگوار ہوئی۔ انھوں نے مسلمانوں کا زور توڑنے کے واسطے خواہی نخواہی ان کی پشتینی زمینداریوں اور وقف جائدادوں کو ضبط کرنا شروع کر دیا۔

سنہ ۱۸۲۸ء میں ایک اور قابل ذکر معرکہ پیش آیا۔ سنہ ۱۷۹۳ء میں جب لارڈ کارنوالس نے بندوبست استمراری قائم کیا تو لاخراج (معافیات) زمینوں کی نسبت انھوں نے کلکٹروں کو یہ ہدایت کی تھی کہ وہ ایسی اراضیات کے حقوق کی وجوبیت

---

[1] بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جدوجہد آزادی سنہ ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء از عبداللہ ملک صفحات ۱۵۹ تا ۲۲۶

کی بابت تحقیقات کریں، اور اگر ان کی وجوبیت کے بارے میں کوئی شک عائد ہو تو ان کی نسبت باضابطہ استغاثہ دائر کیا جائے اور عدالت کے ذریعہ سے تحقیقات عمل میں آئے اس پر اگر قابضان اراضی مذکور اپنا واجب حق عدالت میں ثابت نہ کر سکیں تو کلکٹر بذریعہ ڈگری عدالت اس اراضی کو گورنمنٹ کے قبضے میں لے لیں۔ لیکن اس بات کی صاف ہدایت تھی کہ ایسی اراضیات کے کسی قابض کو اس وقت تک ان سے محروم نہ کیا جائے گا جب تک کہ ان کے استحقاق کی نسبت عدالت کے ذریعے تحقیقات عمل میں نہ آجائے۔ اور بذریعہ آخری ڈگری عدالت وہ استحقاق غیر واجب نہ ٹھیرایا جائے۔

دفعہ ۱۵۔ آئین بابت سنہ ۱۷۹۳ء کی رو سے یہ قاعدہ مقرر ہوا تھا۔ اس کے بعد بذریعہ دفعہ ۲ بابت ایکٹ سنہ ۱۸۱۹ء بعض اہم امور میں تبدیلی کی گئی۔ مگر مندرجہ بالا شقیں بدستور قائم رہیں لیکن دفعہ ۳، احکام بابت سنہ ۱۸۲۸ء میں عدالتی کی تحقیقات اور ڈگری کی شرط بالکل اٹھا دی گئی اور کلکٹر کی رائے پر سب امور کا انحصار رہا۔ اب تین کام ایک ہی عہدہ دار کی ذات میں جمع کر دیئے گئے یعنی کلکٹر ہی اس بات کی تجسس کرے کہ کون سی اراضی معافیات میں ہے جس پر لگان وصول نہیں ہونا چاہئے۔ کلکٹر ہی گورنمنٹ کی طرف سے ایسی اراضی کے قابضوں پر استغاثہ دائر کرے اور وہی جج بن کر اس استغاثہ کا فیصلہ بھی کرے۔ اگر کسی فریق کو کلکٹر کے فیصلہ پر اعتراض ہو تو وہ کمشنر کے اجلاس میں اپیل کرے۔ جس کا فیصلہ سوائے ان مقدمات کے جو اپنی مالیت کے اعتبار سے پریوی کونسل میں جا سکیں، ناطق اور آخری ہوگا [1]

---

[1] سوانح عمری راجہ رام موہن رائے ص ۱۵۶۔۱۵۷

مندرجہ بالا قوانین کا مسلمانوں کے اوقاف پر نیز دوسری متعلقہ الاضیات زمینداری پر بہت برا اثر پڑا۔ راجہ رام موہن رائے کی قیادت میں مسلمان بعض معاملات پریوی کونسل تک لے گئے لیکن جب حکومت دھاندلی پر اتر آتی ہے تو اس ہی کی قائم کردہ عدالتیں کس طرح انصاف کر سکتی ہیں۔ مسلمانان بنگال کو من حیث القوم تباہ کرنے میں جن ہتھیاروں سے کام لیا گیا، اس کا اقبال مشہور مصنف سر ڈبلو ڈ ہنٹر نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"آخر کار سنہ ۱۸۲۳ میں مجلس قانون ساز اور محکمہ منتظمہ نے مل کر ایک بہت بڑی کوشش کا آغاز کیا جس کے ماتحت خاص عدالتیں مقرر کی گئیں۔ اور آئندہ اٹھارہ سال تک تمام صوبے میں مخبر۔ جھوٹے گواہ اور خاموش مگر مستقل مزاج افسران واگذاری گشت کرتے رہے۔"

واگذاری کے مقدمات پر ۲۸ لاکھ پونڈ خرچ کرنے کے بعد حکومت کی مال گزاری میں تین لاکھ پونڈ سالانہ کا اضافہ ہوا۔ یعنی ساٹھ لاکھ پونڈ کا سوا پانچ فی صد سالانہ کے حساب سے اس رقم کا بہت بڑا حصہ ان زمینوں سے حاصل ہوتا ہے جو مسلمانوں یا اسلامی اوقاف کے پاس معافی کی حیثیت سے ہیں۔ اس سے جو ابتری اور نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہوئے وہ ہمیشہ کے لئے دیہاتی دستاویزات میں ثبت ہو چکے ہیں۔ سینکڑوں پرانے خاندان تباہ ہو گئے اور مسلمانوں کا تعلیمی نظام جس کا دارومدار ان ہی معافیات پر تھا بالکل تہ و بالا ہو گیا۔ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ۱۸ سال کی اس مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد

کئے قصلہ مٹ گئے۔

بہائے واگزاری کے افسر جنہوں نے قانون کو نافذ کیا تھا رحم کرنا جانتے ہی نہیں تھے، ان دنوں کا خوف و ہراس اب تک بہت سے لوگوں کو یاد ہے اس سے ہمارے خلاف نفرت وحقارت کی ایک شدید وجہ پیدا ہو گئی ہے اس وقت سے کسی شخص کا عالم دین ہونا جو ہندوستانی نوابوں کی نظر میں بڑا قابل عزت اور منفعت بخش پیشہ تھا بنگال میں ہمیشہ کے لئے بند ہے۔

انگریزوں کی مسلمان دشمنی

انگریزوں کو مسلمانوں سے ازلی دشمنی تھی دنیا کے ہر خطے میں مسلمانوں کا انگریزوں سے مقابلہ رہا ہے۔ ہندوستان میں تو انھوں نے براہ راست مسلمانوں سے قبضہ واقتدار حاصل کیا تھا، اس لئے لارڈ ایلن برا نے اپنی پوری قوم کی پالیسی مسلمانوں کے متعلق صاف صاف بیان کردی ہے:

"میں اس عقیدے سے چشم پوشی نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کی قوم اصولاً ہماری دشمن ہے۔ اس لئے ہماری حقیقی پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کی رضاجوئی کرتے رہیں"

مسلمانان بنگال کو انگریزوں کی مختلف تعلیمی پالیسیوں سے جو نقصان پہنچا اس کا اندازہ بھی ڈاکٹر ہنٹر کی زبان سے بخوبی ہو سکتا ہے وہ لکھتا ہے:-

"سنہ ۹۲-۱۸۹۰ء میں ہمارے اسکولوں میں ایک مسلمان کے مقابلہ میں دس ہندو تھے۔ اور یہ نسبت اب پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے۔ لیکن اس زیادتی کی وجہ ہمارے ضلع

کے سرکاری اسکول اور دیگر امدادی ادارے ہیں۔"

بات یہ ہے کہ ہمارا طریقۂ تعلیم مسلمانوں کے تین ایسے رجحانات کو جو سراسر طبعی ہیں بالکل نظرانداز کردیتا ہے، اول یہ کہ ذریعہ تعلیم بنگال کی دیسی زبان (بنگالی) ہے، جس سے تعلیم یافتہ مُسلمان نفرت کرتے ہیں اور ماسٹر ہندو جن کو ساری مسلمان قوم حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ بنگالی اسکول ماسٹر جب اپنی دیسی زبان اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں گفتگو کرتے ہیں تو وہ مسلمانوں کے لئے بھی ایسی ہی اجنبی ہے جیسی ہمارے لئے۔ پھر اس کے عاجزانہ اور بزدلانہ طور طریق اس قابل نہیں کہ مسلمان بچوں میں ضابطہ قائم رکھ سکے۔ ابھی چند دن ہوئے ایک مسلمان زمیندار نے ایک انگریز افسر سے کہا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس بات پر مجبور نہیں کرسکتی کہ اپنے بچوں کو بنگالی اسکول ماسٹر کے پاس بھیجے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے دیہاتی اسکول اس قابل نہیں کہ یہاں مسلمان ان زبانوں کو حاصل کرسکیں جو زندگی میں قابل عزت جگہ کے حصول اور مذہبی فرائض کی بجاآوری کے لئے ضروری ہیں۔ ہر شریف مسلمان کا فرض ہے کہ وہ تھوڑی بہت فارسی جانتا ہو لیکن فارسی وہ زبان ہے جو ہمارے اضلاع کے اسکولوں میں بھی نہیں پڑھائی جاتی۔"[1]

---

[1] اَور ہیپی انڈیا ص ۱۹۳ بحوالہ خطبہ صدارت مولانا حسین احمد مدنی شعبۂ مدارس اسلامیہ پنجاہ سالہ جوبلی سنہ ۱۹۳۷ء نمبر ۲۵

ایک اعلیٰ افسر لکھتا ہے کہ "کیا اس کے بعد بھی یہ کوئی تعجب کی بات ہے کہ مسلمان اس طریقے سے پرہیز کر رہے ہیں جو ان کے طبعی رجحانات کے لئے کوئی رعایت نہیں رکھتا۔ نہ اس تعلیم کا کوئی بھی انتظام کرتا ہے۔ جس کو وہ اپنے لئے بے حد ضروری سمجھتے ہوں۔ بلکہ جو قطعی طور پر ان کے مفاد کے خلاف ہے اور ان کی جماعتی روایات کے بالکل برعکس ہے۔"

ڈاکٹر ہنٹر نے شریف بنگالی مسلمان کی منجملہ اور نشانیوں کے ایک نشانی اس کی فارسی دانی بتائی تھی۔ اب ابتدائے انگریزی اقتدار کے وقت جو لوگ فارسی داں تھے وہ قدرتی طور پر اردو داں بھی شمار ہونے لگے۔ یہی سبب ہے کہ بنگال میں اردو کی جڑیں خاصی گہری بنیادوں پر قائم ہو گئیں۔ اور اردو زبان کا مسئلہ کم از کم مسلمانوں کی حد تک قطعاً متنازعہ فیہ مسئلہ نہیں رہا تھا۔ لیکن سول سروس کے چالاک دماغ نے بڑی خوبصورتی اور چالاکی کے ساتھ دو محاذ قائم کر دیئے۔ مولانا سید سلیمان ندوی رقمطراز ہیں:-

"اس میں شبہ نہیں کہ بنگال میں بنگالی کی اہمیت صوبے کی مقامی بولی کی حیثیت سے زیادہ ہے۔ پھر بھی یہ بھولنا نہیں چاہیے کہ اردو کی پرورش میں اور ملک کو ایک مشترکہ زبان کے بخشنے میں بنگال کا حصہ کم ہے۔ اور جہاں اردو کے بڑے بڑے شاعروں نے جنم لیا ہے۔ اور شہرت کے بال و پر پیدا کئے ہیں اور شعرائے لکھنو کے مقابلے میں میدان مارے ہیں اور ان دیوانوں پر تنسیخ کا قلم پھیرا

ہے۔ عبدالغفور نساخ اور نواب سید محمد آزاد کے نام اُردو ادب میں یادگار ہیں اور آج بھی وحشت کی شاعری سے لکھنؤ اور دہلی کی ادبی محفلیں مانوس ہیں۔"

"عجیب بات ہے کہ جب انگریزوں نے اپنی تعلیمی رائے بدلی تو اس سرزمین کو اپنے اس بچے سے جس کو اس نے گودوں میں پالا تھا ایسی بیگانگی ہو گئی کہ اب بنگال اور اردو دو متضاد چیزیں ہیں۔" ؎

بنگالی اور اردو کے سلسلے میں شیر بنگال مولوی فضل الحق کی صاحبزادی رئیس بیگم کا بیان قابل غور ہے:۔

"انگریزی حکومت سے پہلے بھی بنگال میں ہندو مسلمان اور دوسرے لوگ آباد تھے۔ اس وقت سرکاری زبان فارسی تھی اور مسلمان ہندو اور دوسرے لوگ عربی، فارسی ملی ہوئی اردو بنگالی بولا کرتے تھے۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح بنگال کے باشندوں کی ثقافتی زبان عربی ملی ہوئی فارسی تھی۔ بعد میں اردو ہندوستان کے لوگوں کی زبان بنی جس میں بنگال کے لوگ شامل تھے۔ راجہ رام موہن رائے ان میں سے ایک تھے۔ ضلع فرید پور میں موضع رام پور کے عبدالغفور نساخ اور ان کے برادر خورد نواب عبداللطیف بنگالی مسلمانوں کے ممتاز لیڈر اور اردو

کے مشہور شاعر تھے۔ ان کے صاحبزادے مشہور شاعر رضا علی وحشت کے استاد تھے۔ انگریزوں کے عہد سے پہلے مسلمانوں نے بنگالی کو ایک مقامی بولی کی حیثیت سے ترقی دی تھی اور اس میں عربی اور فارسی کے بے شمار الفاظ شامل تھے۔ ثبوت کے لئے آپ مسلمانی بنگالی انگلش ڈکشنری دیکھ سکتے ہیں۔ جو ۱۹۳۲ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی تھی اس لغت میں عربی اور فارسی کے چھ ہزار الفاظ ہیں۔ جو انگریزوں کے ابتدائی عہد میں بھی بنگال کے لوگ عام طور پر استعمال کرتے تھے۔ تحریک پاکستان کے بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد یہ تھا کہ اسی بنگالی اور اسی اردو کا تحفظ کیا جائے گا"۔ [1]

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انگریزوں اور برادران وطن کی کوششوں کے نتیجہ میں مسلمانان بنگال کا ہر شعبۂ حیات بری طرح متاثر ہوا۔ بعض مفکرین ادب کا یہ خیال ہے کہ زبانیں بنانے سے نہیں بنتی ہیں بلکہ قدرتی عوامل کے تحت وجود میں آتی ہیں اور ترقی کرتی ہیں۔ مثلاً ہمارے مشہور صاحب نظر ادیب و شاعر جناب ماہر القادری کا ارشاد ہے:-

---

[1] بحوالہ روزنامہ جنگ کراچی ۲۰ر نومبر ۶۹ء

"زبان کے سلسلے میں ایک اصولی بات راقم الحروف عرض کر دینا چاہتا ہے۔ وہ یہ کہ دنیا کی زبانوں کے بنانے میں کسی حکومت یا ادارے کی کوشش کا کبھی دخل نہیں رہا زبانیں فطری طور پر عوام کے ذوق اور ضرورت کے مطابق آپ ہی آپ بنتی چلی گئی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ معیاری زبانیں بن گئیں۔ ہاں علم و ادب کی ترقی میں حکومتوں اور قومی تنظیموں کا ہاتھ رہا ہے"۔ [۵]

مولانا ماہر القادری ایک صاف ستھرے، بے داغ معاشرے اور منصف مزاج حکومت کے.... قدرتی دھاروں کا ذکر کر رہے ہیں۔ ایسے ماحول میں تو بے شک زبانوں کی ترقی قدرتی عوامل کے تحت ہوتی ہے۔ لیکن جب متعصب حکومتیں برسر اقتدار آجاتی ہیں تو وہ سب کچھ ہونا ممکن ہو جاتا ہے جو نہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ بنگال میں مسلمان بنگالیوں کے ساتھ جو ڈرامہ گزشتہ پچاس ساٹھ سال کے دوران ہمارے سامنے کھیلا گیا وہ کوئی ڈھکی چھپی کہانی نہیں ہے۔ جناب فضل احمد کریم فضلی لکھتے ہیں:-

"یہ بات اپنی جگہ تو ٹھیک ہے کہ ایک زندہ زبان خود بخود بنتی اور بدلتی رہتی ہے بنائی اور بدلی نہیں جاتی لیکن بنگال کا تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ زبان ایک حد تک بنائی اور بدلی بھی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ ابتدائی مدارس سے انتہائی مدارج تک رفتہ رفتہ پڑھائی جائے۔ پچاس ساٹھ برس میں ایسا انقلاب آسکتا ہے کہ وہ لوگ

جن کے دادا پر دادا اس زبان کے سخت مخالف ہوا کرتے
تھے، اس کو اس حد تک اپنانے لگے ہیں کہ اس کے لئے جان
دینے کے لئے بھی تیار ہو جائیں۔ باوجودیکہ اس مصنوعی زبان
اور ان کی اپنی زبان میں خلیج بدستور قایم رہے اس تجربے
کی کامیابی سے ہمیں بھی بڑا مفید سبق مل سکتا ہے۔[1]

سرسیّد اور بنگال:۔ بہرحال ہندوؤں میں انگریزوں کی ترتیب شدہ اس شدھ بھاشا نے رفتہ رفتہ احساس برتری اور مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا کر دیا۔ جب سرسید کا اثر بنگال تک پہنچا اور وہاں کے مسلمان عربی تعلیم کی طرف مائل ہونے لگے تو میدان ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس وقت تک بقول ہنٹر مسلمان اپنے بچوں کو ہندوانی بنگلہ سکھانا کفر سمجھتے تھے۔ مگر اب مسلمان بچے یہی زبان سیکھنے پر مجبور ہوئے۔ ہندوؤں کا تو چونکہ سنسکرت سے ایک مذہبی اور ذہنی رابطہ تھا اس لئے ان پر اس زبان کا سیکھنا اتنا گراں نہ تھا جتنا مسلمانوں پر۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخری حصے میں یہ سوال بہت اہمیت اختیار کر گیا کہ بنگال کے مسلمان اردو کو اپنی زبان قرار دیں۔ یا بنگلہ کو۔ اس پر کئی سال تک زور و شور کی بحثیں ہوتی رہیں اور بڑی تکل کے بعد بنگلہ کے حق میں فیصلہ ہوا۔[2]

---

[1] مقالہ بنگلہ کو عربی رسم الخط میں لکھنے کا رواج از فضل احمد کریم فضلی۔ جنگ ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۰ء

[2] یہ دونوں اقتباس روزنامہ جنگ کراچی میں شائع شدہ مقالات سے ماخوذ ہیں

باب ۔ ۵

بنگال سے اردو فارسی کا خاتمہ

گارسان دتاسی کی زبانی

فارسی کے بعد جب اردو سرکاری زبان قرار پائی تو اس زبان نے زبردست ترقی کی۔ لیکن سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کے کلچر، تمدن اور معاشرت کی امین زبان سیاسی آویزشوں کا شکار ہونے لگی۔ انگریزوں کی شہ پر برادران وطن بھی اس زبان کی بیخ کنی میں مشغول ہو گئے۔ بنارس سے جو تحریک اردو کے خلاف اٹھی اس کی ہولناکیوں کو عوام المسلمین اگرچہ پورے طور پر نہیں سمجھ سکے تھے۔ لیکن بعض دور بین شخصیتیں حقیقت حال کو بخوبی سمجھ چکی تھیں تاہم حکومت وقت کی مصلح کے خلاف اظہار رائے کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس دور میں مسلمانوں کے قلب و دماغ پر جو گذری وہ کیفیات ہندوستان سے ہزاروں میل دور ایک فرانسیسی ادیب قلم بند کر رہا تھا۔ یہ ایک قیمتی ریکارڈ ہے جس کا مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو۔

- بابو شیو پرشاد نے جو پتھر پھینکا ہے وہ مسلمانوں کے سر پر بہت زور سے لگا ہے۔ کچھ عرصہ سے مسلمانوں کو کچھ امید پیدا ہو چلی تھی لیکن اب ان کی امید کا درخت جس کی شاخیں کچھ سرسبز ہو رہی تھیں، پھر سے خشک ہونے لگا اور درخت کی بیدمجنوں

کی طرح شاخیں زمین کی طرف جھکی چلی جارہی ہیں"۔[1]

معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ بابو شیو پرشاد کی تحریک کے انتظار میں تھی، چنانچہ مسٹر جی کیمبل لفٹننٹ گورنر بنگال نے سنہ ۱۸۷۱ء میں اس اردو کے خلاف جو سنہ ۱۸۳۹ سے سرکاری حیثیت کی حامل تھی وار کردیا۔ مسٹر کیمبل کی سرکاری یادداشت یا حکم کے تفصیلی اقتباسات ملاحظہ ہوں،

"فارسی زبان جو ہندوستان کے سابق حکمرانوں کی زبان تھی، سرکاری زبان کی حیثیت سے میرے ہندوستان آنے سے قبل ہی ترک کردی گئی تھی۔ میری خدمت کے ابتدائی ایام میں اس بات کی پورے طور پر کوشش کی گئی کہ سرکاری قوانین میں اس غیر صحیح النسب دوغلی زبان (اردو) کے الفاظ مستعمل نہ ہوں۔ جو فارسی انشا پردازوں کو بہت عزیز تھے۔

کتابوں میں چاہے اس زبان کے متعلق کوئی کچھ لکھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان دہلی کے دربار اور لشکر کی زبان ہے نہ کہ ملک کی مروجہ زبان۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اس زبان کی تعلیم کو جو ہمارے مدرسوں میں دی جاتی ہے پوری طرح بند کرادوں۔

میری دانست میں سارے بنگال کی بھی ایک مشترکہ بنگلہ

---

[1] مقالات گارساں دتاسی۔ جلد اول شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ص ۱۲۹

زبان پائی جاتی ہے اگرچہ بطور عملی اور تحریری زبان کے بنگالی زبان ابھی حال ہی میں وجود میں آئی ہے اس لئے بول چال کی بنگالی اور تحریری بنگالی میں فرق کو گوارا کرنا ہوگا۔ بنابریں میں ناظم تعلیمات کو حکم دیتا ہوں کہ :-

اخراج اردو کے واضح احکام

(۱) اردو زبان ہمارے مدرسوں اور تعلیمی اداروں سے قطعی برخاست کی جا چکی ہے۔

(۲) ناظم تعلیمات اور مہتمان تعلیمات کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اس بات کا اطمینان کرلیں کہ ہمارے مدرسوں میں کوئی ایسی کتاب تو نہیں پڑھائی جاتی جو ملک کی اصلی اور خالص زبان (بنگالی) میں نہیں لکھی گئی ہے جس کے متعلق اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔

"(۳) اس قسم کی کتابیں جو جانچ کے بعد نصاب میں شامل کی جائیں ان کی فہرست مجھے بھیجی جائے۔ مجھے اس میں مطلق شبہ نہیں ہے کہ صوبجات شمالی و مغربی (یو۔ پی) میں ہندی اور ہندوستانی کی جو کتابیں شائع کی جا رہی ہیں ان میں کارآمد کتابیں ضرور مل جائیں گی۔ اگر روزمرہ کی ہندوستانی میں کلاسیکی کتب کی کمی ہے تو اس کو اس طرح پورا کیا جا سکتا ہے کہ ہندی کی کتب کو فارسی رسم الخط میں چھاپ دیا جائے جس کے متعلق میں ذکر کر چکا ہوں۔ لیکن بنگال میں

کتابیں کثرت سے موجود ہیں۔ اگر ان کتب کو علیحدہ کر دیا جائے جن میں سنسکرت کا عنصر غالب ہے یا جن کی عبارت مصنوعی ہے تو بھی ایسی کتابیں ہمارے پاس بچ جائیں گی جو مروجہ بنگالی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ اور جن سے ہماری مقصد برآری ہو سکتی ہے۔

(۴) اگر تعلیمات کے کسی شعبہ میں ایسی کتب موجود نہ ہوں جو مروجہ زبان میں لکھی گئی ہوں تو اس کے متعلق مجھے خاص رپورٹ بھیجنی چاہیے۔ ایسی کتب کی فراہمی اور طباعت کا انتظام کرایا جائے گا۔

میں نے اور جو کچھ ہدایات دی ہیں ان کی تعمیل تمام سرکاری عہدیداروں پر عاید ہوتی ہے۔ تاکہ وہ اپنے دفاتر میں سوائے مروجہ زبان کے دوسری زبان کا استعمال نہ ہونے دیں انگریزی زبان اس سے مستثنیٰ ہے۔ انگریزی زبان جو دفاتر میں استعمال ہوتی ہے، وہ علیٰ حالہ رہے گی۔ مجھے توقع ہے کہ ہائی کورٹ کو بھی دعوت دی جائے گی کہ وہ اس بارے میں ہمارا ہاتھ بٹائے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ہائی کورٹ کے جج میری طرح دیسی زبان کے موجودہ غلط استعمال کے خلاف ہوں گے۔"

مسٹر کیمبل کی مندرجہ بالا تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بااختیار شخص نے

اسباب ظاہری کی عدم موجودگی کے باوصف اردو زبان کو ختم کرنے کے احکام بڑی بے دردی کے ساتھ نافذ کر دیئے۔ کتابیں موجود نہیں پڑھنے پڑھانے والوں کی اکثریت ہر قسم کی تبدیلی کے خلاف۔ لیکن حاکمانہ مصلحت ..... اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے؟ ہمارے سامنے بھارت میں بھی اردو کے خلاف ہندی اسی دھاندلی کے ساتھ مسلط کی گئی ہے"

مسٹر کیمبل نے اپنے احکام کی تعمیل میں اسپین کے ان عیسائیوں کی روایت سامنے رکھی جنھوں نے ظلم و جبر کر کے آٹھ سو سالہ اسلامی حکومت اندلس کی سرکاری زبان عربی کا خاتمہ کیا تھا۔ انھوں نے پولس سے تعلیمات کی نگرانی کا کام لیا نیز نظام تعلیم میں بھی اپنی جہالت کا قلم پھیرا۔ ملاحظہ ہو۔

> حاکمان پولس ناظم و مہتمم تعلیمات کے فرائض انجام دینے لگے

مسٹر کیمبل نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ وہ تعلیم عامہ کے سلسلے میں مروجہ زبان میں تبدیلی کرنا چاہتے تھے، موصوف نظام تعلیم میں بھی انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک دوسری قرارداد کے ذریعہ سے جو اتنی ہی عجیب و غریب ہے جیسی کہ زبان والی قرارداد جس کی نسبت اوپر طویل ذکر کیا جا چکا ہے

موصوف نے یہ فیصلہ کیا کہ بنگال اور بہار کے مدارس کے معائنہ کا کام تعلیمات کے مہتمموں کے ہاتھ سے نکال کر کلکٹر اور مجسٹریٹوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ اب ناظم تعلیمات کی حیثیت محض محرر کی رہ جائے گی۔[1]

---

[1] مقالات گارساں

جس بنگلہ زبان کی ترویج و اشاعت کے واسطے اتنا ہنگامہ برپا تھا اس کی نثری حیثیت اس قدر کمزور تھی کہ ملکی مفاد کے برخلاف اس کو مکتبوں اسکولوں کالجوں اور کورٹوں میں رائج کرنا ایک طرح کا پاگل پن ہی قرار دیا جا سکتا تھا سوانح راجہ رام موہن رائے کا مصنف لکھتا ہے۔

"ان کے زمانہ میں پہلے بنگلہ زبان میں نثر کا رواج نہ تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے لئے دو تین نثر کی کتابیں لکھی گئیں مگر ان کی زبان بالکل بے محاورہ تھی اور کسی نے ان کی تقلید نہ کی۔"[۱]

پروفیسر شبیر احمد نے بنگالی زبان کے مختلف رجحانات کا بخوبی مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے وہ بھی گارسان دتاسی کے بیانات کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ :-

"سنہ ۱۸۰۲ تک دستاویزی ثبوت ملتا ہے کہ مسلمانوں میں عربی رسم الخط میں بنگالی زبان رائج تھی، اور انگریزی حکومت یہ کوشش کر رہی تھی کہ ان کی جگہ صرف ایسے اسکول کھولے جائیں جن میں سرکاری بنگالی زبان اور رسم الخط سکھایا جاتا ہو۔ اور مسلمانوں کو بھی انھیں میں تعلیم دی جائے۔"[۲]

"بنگالی زبان کا موجودہ سنسکرتی رسم الخط بالکل نیا ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس کے وجود کا پتہ سنہ ۱۷۷۸ سے پہلے کسی جگہ نہیں ملتا

---

[۱] سوانح راجہ رام موہن رائے صفحہ ۱۴۲۔ از منشی نتھو رام مطبوعہ ۱۸۹۳۔ جموں کشمیر۔

بنگالی زبان کی تاریخ لکھنے والے عموماً اس سوال کو گول کر جاتے ہیں"
"سب سے پہلی کتاب جو موجودہ بنگالی حروف میں لکھی گئی وہ
ہینتھل براسی ہال ہڈ کی لکھی ہوئی بنگالی گرامر تھی۔ یہ کتاب اس
نے انگریزی میں لکھی تھی۔ لیکن مثالیں بنگالی رسم الخط میں تھیں یہ
کتاب سنہ ۱۷۷۸ء میں چھپی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ
حروف اسی سال یا اس سے کچھ پہلے تیار کئے گئے"[۱]

لارڈ میو کا رزولیوشن سنہ ۱۸۷۱ء
اور مسلمانان بنگال

سنہ ۱۸۷۱ء تک بنگال و بہار، یو۔پی و پنجاب غرض ہر جگہ ہر شعبہ حیات بالخصوص تعلیم کے میدان میں مسلمانوں کی پستی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ حکومت بھی اس کیفیت پر چونک پڑی۔ کیونکہ اراکین حکومت میں کچھ سمجھ دار انگریزوں نے محسوس کیا کہ اگر یہی لیل و نہار رہے تو ہندو اس قدر طاقتور ہو جائیں گے کہ سنبھالے نہ سنبھل سکیں گے چنانچہ لارڈ میو کے دور میں ۷ر اگست سنہ ۱۸۷۱ء کو یہ ہدایت جاری ہوئی کہ تمام سرکاری مدارس اور کالجوں میں مسلمانوں کی دیسی علمی زبانوں کو بیش از بیش اور باقاعدہ تقویت دی جائے ..... یہ کہ گرانٹ ان ایڈ سے مسلمانوں کی مدد کی جائے تاکہ وہ اپنے مدارس جاری .....

---

[۱] "العلم" بابت اپریل تا جون سنہ ۱۹۵۸ء صفحہ ۳۴

کرنے کے قابل ہوں اور یہ کہ مسلمانوں کے متعلق دیسی لٹریچر پیدا کرنے کے سلسلے میں زیادہ امداد اور تقویت دی جائے لارڈ میو نے میونسپل بورڈ سے دریافت کیا تھا کہ۔

"آیا وہ اپنے تعلیمی نظام کے بنیادی اصولوں کو توڑے بغیر کچھ عام تدابیر مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق اختیار کر سکتی ہیں، اور آیا یونیورسٹی کورس میں عربی اور فارسی لٹریچر کو زیادہ تقویت و امداد دی جا سکتی ہے۔"

لارڈ میو کے مندرجہ بالا استفسار کا یہ المناک انجام ہوا کہ لارڈ ڈفرن کی طرف سے ۱۵ر جولائی سنہ ۱۸۸۵ء کو اعلان کیا گیا کہ

"ہز اکسیلنسی بہ اجلاس کونسل کو اس بات کا یقین بمشکل دلایا جا سکے گا کہ اس قسم کے لٹریچر کے پیدا کرنے کی اب بھی ضرورت باقی ہے؟"

لارڈ ڈفرن نے مندرجہ بالا اعلان کیوں کیا؟ بات یہ ہے کہ لارڈ موصوف کو اندیشہ تھا کہ کہیں مسلمانوں میں دوبارہ زندگی پیدا نہ ہو جائے۔ اور وہ ظالم غاصبوں سے حساب نہ کرنے لگیں۔ چنانچہ لارڈ موصوف کا بیان ہے کہ

"ہم کو اس خصوص میں اس حد سے تجاوز کرنے کے لئے کوشش کرنے میں محتاط رہنا چاہئے جس پر قبل ازیں ہم پہنچ چکے ہیں؟"

سنہ ۱۸۸۲ء میں لارڈ رپن نے تعلیمی کمیشن مقرر کیا۔ اس نے نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کے میموریل کے جواب میں صوبہ بنگال کے متعلق رائے دی:

"بمقابلہ دوسرے مقامات کے یہاں پر آبادی کے مسلمان عنصر کے لئے جداگانہ وسیع انتظامات کی بابت درخواست کرنے کے متعلق خفیف وجوہ ہیں کیونکہ

مسلمانوں کی کثیر تعداد کاشتکار پیشہ ہے جو اپنے ہندو ہمسایوں کی بنگالی زبان بولتے ہیں۔"

گویا کمیشن نے فیصلہ کیا کہ چونکہ مسلمان۔ بنگالی "ہی بولتے ہیں اس لئے ان کے بچوں کو جداگانہ عربی فارسی اور دینیات کی تعلیم دینے کا سوال ہی سرے سے قابل غور نہیں ہے۔ یہ بات اس زمانہ کے مسلمان دانشوروں کو سخت ناگوار گذری۔ چنانچہ محمد بدیع العالم کلکتوی نے مسلمانوں کے سب سے بڑے تعلیمی پلیٹ فارم آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس[۵] سے اعلان کیا۔

قابل احترام اور لائق کمیشن کی اس رائے کے خلاف میں اپنی مودبانہ لیکن پر زور صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں۔ کیونکہ بنگال میں اگرچہ مسلمان کاشتکاروں کی بڑی تعداد ہے تاہم متوسط درجہ کے مسلمان شرفا کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے اور اس طبقہ کے مسلمانوں نے تقسیم بنگال کی پنج سالہ مدت میں جو عارضی طور سے ان کو نصیب ہوئی تھی، بوجہ حالات کی مساعدت کے تعلیم اور ملازمت میں حیرت انگیز ترقی کی اس لئے کمیشن کا یہ ریمارک بہت سخت ہے۔ یہ دلیل کہ مسلمانان بنگال اپنے ہندو ہمایوں کی۔ بنگالی زبان "بولتے ہیں اس لئے صحیح نہیں کہ مسلمانان مدراس بھی تامل، تلنگو بولتے ہیں، لیکن اردو زبان کو جب کہ تعلیم کا ذریعہ اختیار کیا گیا تو انھوں نے قابل اطمینان اور امید افزا ترقی کی۔ خود بنگال میں جہاں فارسی زبان

---

[۵] رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ اجلاس ۱۹۱۳ء لکھنؤ۔ یوپی۔

عدالتی زبان تھی، مسلمانان بنگال جن کو اب کاشتکار کہہ کر ذلیل کیا جاتا ہے، اسلامی گورنمنٹ کی ملازمت میں اور برٹش حکومت کے اندر ۹۰ فی صد فائز تھے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ اور بنگال

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ سرسید علیہ الرحمۃ نے سنہ ۱۸۸۶ء میں قایم کی تھی۔ یہ ادارہ مسلمانوں کی پسماندگی دور کرنے کی غرض سے قایم ہوا تھا۔ کانفرنس نے بنگالی مسلمانوں کے مسائل کو آل انڈیا پلیٹ فارم پر رکھنے کی غرض سے تین اجلاس ڈھاکہ اور کلکتہ میں منعقد کئے۔ نیز اقطاع ملک کے اجلاسوں میں مسلسل بنگالی مسلمانوں کی تعلیمی بہبود کی تجاویز پاس کیں اور گورنمنٹ پر برابر زور دیا کہ ان پر عمل بھی کرے۔ اجلاس کلکتہ سنہ ۱۸۹۹ء اجلاس ڈھاکہ سنہ ۱۹۰۶ء سابق صوبۂ بنگال کی تعلیمی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایجوکیشنل کانفرنس نے یہ مسائل کس طرح عوام اور خواص کے سامنے پیش کئے ان کا اندازہ ان تقاریر کے اقتباسات سے ہو سکے گا جو ہم بطور نمونہ مشتے از خروارے پیش کر رہے ہیں۔

مسلمانان بنگال کے تعلیمی مسایل تقریر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اجلاس کانفرنس ۱۹۰۸ء

اس سلسلہ میں سب سے اول کلکتہ مدرسہ کا ذکر کروں گا جو اس نظام تعلیم میں بطور مرکزی درسگاہ کے ہے اور جس کے اصولوں کا بہت کچھ بنگال کے مسلمانوں کی تعلیم پر اثر پڑا۔ یہ مدرسہ سنہ ۱۷۸۱ء میں قایم ہوا۔ اور گورنر جنرل وقت نے اس کو قایم کیا تھا۔ اس زمانہ کی تاریخ سے

جو اصحاب واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ اس زمانہ میں گو مسلمانوں سے عنان حکومت چھن گئی تھی، تاہم گورنمنٹ میں ان کا اثر تھا۔ عدالتوں کی زبان فارسی تھی۔ جو فوجداری اور شہادت کا قانون جاری تھا وہ شرع محمدی کے مطابق تھا اس لئے گورنمنٹ کو ایسے عہدیداروں کی ضرورت تھی جن کو شرع محمدی کا علم ہو اور جو عدالتوں کی کارروائی سے واقف ہوں۔ ایسے عہدیدار پیدا کرنے کے لئے عربی زبان کا علم لازمی تھا اور عدالتوں کی زبان فارسی تھی اس لئے اس مدرسہ میں عربی اور فارسی کی تعلیم کا خاص انتظام کیا گیا جب تک فارسی اور شرع محمدی کا رواج عدالتوں میں رہا اس مدرسہ کے تعلیم یافتہ گورنمنٹ میں بااثر اور بااقتدار رہے۔ اور اس مدرسہ کا وجود مسلمانوں کے لئے نفع رساں رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ گورنمنٹ کی حالت اور ضرورتیں بدل گئیں۔ بجائے فارسی کے عدالتوں کی زبان انگریزی اور بنگالی ہوگئی اور بجائے شرع محمدی کے وہ قوانین جاری ہوگئے جن کے لئے نہ صرف زبان انگریزی کی تعلیم ضروری ہوگئی بلکہ پوری واقفیت کے لئے انگلستان کے قوانین اور طرز گورنمنٹ کے متعلق معلومات لابدی ہوگئیں۔ نیز گورنمنٹ کے عہدوں کے لئے وہ امتحانات لازمی ہو گئے جن کے پاس کرنے کے لئے اعلیٰ تعلیم انگریزی اور یورپین لٹریچر ضروری ہوگئے جب ان تبدیلیوں کی وجہ سے شرع محمدی کی تعلیم اور فارسی زبان کے علم کی ضرورت نہ رہی تو کلکتہ مدرسہ کے نصاب میں دینیات کی تعلیم اور زیادہ کردی گئی اور گو کچھ عرصہ سے اس میں کچھ کچھ انگریزی تعلیم بھی شروع کردی گئی ہے لیکن رفتہ رفتہ ان انقلابات کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ اس مدرسہ کے تعلیم یافتہ بجائے زمانے

کی ضرورتوں کے موافق باثر عالم اور معزز گورنمنٹ کے عہدہ دار ہونے کے محض مسجد کے ملا رہ گئے۔

جب انگریزوں اور برادران وطن کی سازش طشت از بام ہوگئی تو مسلمانوں کی آنکھیں کھلنا شروع ہوئیں اور مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ نے حالئ مستقبل میں پیش آنے والی قومی تباہی کے خلاف جد و جہد کا آغاز کیا لیکن طوفان پورے شباب پر آچکا تھا۔ چنانچہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ اس انقلاب عظیم کی داستان بیان کرتے ہوئے ہم مولوی عبدالکریم مرحوم اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز کلکتہ کی ایک تقریر پیش کرتے ہیں۔ یہ تقریر برصغیر پاک وہند کی مشہور تعلیمی جماعت کے سالانہ اجلاس میں ہوئی تھی اور چونکہ یہ تقریر کانفرنس کے ایک رزولیوشن کے سلسلے میں تھی لہٰذا اولاً رزولیوشن کی نقل پیش کی جاتی ہے

رزولیوشن

اس کانفرنس کی رائے میں جو تعلیم بنگال کے مدارس میں دی جاتی ہے مسلمان نوجوانوں کی صحیح تربیت کے لئے کارآمد و مفید نہیں اور بنا بریں اس کانفرنس کی رائے میں ان مدارس کے نصاب تعلیم میں ضروری تغیر و تبدل کرنے کے لئے گورنمنٹ سے درخواست کی جائے [1]

تقریر مولوی عبدالکریم اجلاس کانفرنس سنہ ۱۸۹۹ء

مسلمان بنگالیوں کی مادری زبان	"موجودہ تعلیم بنگلہ کی اصل حقیقت اگر میں بیان کرنا چاہوں تو ضرورت ہوگی کہ اس کی ابتداء سے تمام اصلیت کو

[1] رپورٹ کانفرنس کلکتہ ۲۸ر دسمبر سنہ ۱۸۹۹ء

دُھراؤں بلکہ اس کی تفصیل مجھ کو اس بات پر مجبور کرے گی کہ میں زمانۂ گذشتہ کی طرف پلٹوں اور بوجہ احسن ظاہر کر دوں کہ کیونکر زبان بنگلہ ہمارے مسلمانوں کے لئے ضروری ہو گئی اور کس طرح فارسی زبان جو بالکل شائع (رائج) ہو رہی تھی، اُٹھ گئی اور پھر زبان بنگلہ و انگریزی اس کی قایم مقام بن گئی۔ اور باوجود ہماری اصل زبان نہ ہونے کے بنگلہ ہمارے تمدّنی و معاشی نظم ونسق میں دخل ہو گئی اور ضروریات خانگی کا انجام اور سررشتہ ریاستہائے بنگالہ کا مدار ٹھیر گئی مگر چونکہ اس انقلاب کی وجہ متعلق بہ تاریخ ہے اس لئے اس وقت میں اس کے دھرانے کی ضرورت نہ سمجھ کر فقط اتنا کہدینا کافی سمجھتا ہوں کہ اب زبان بنگلہ گویا ہماری مادری زبان ٹھیر گئی ہے اور اسی زبان سے ملکی، مالی، خانگی سررشتہ زمینداری و عدالت سرکاری میں بڑی بھاری اعانت لی جاتی ہے۔ اس لئے ہم مسلمانوں کو اس کا سیکھنا ضروری اور لابدی ہو گیا ہے۔

بنگال کا نظام تعلیم سنہ ۱۸۹۹ء

ملک بنگالہ میں جو اسکول یا پاٹھ شالے تعلیم بنگلہ کے لئے ہیں اس کے چار حصے کئے گئے۔ ایک لوئر پرائمری۔ دوسرا اپر پرائمری۔ تیسرا مڈل ورناکیولر۔ چوتھا نارمل اسکول کے امتحان۔ پہلے تین قسم کے اکثر ملک کے اندرونی حصے یعنی قریوں میں ہیں۔ اور نارمل اسکول فقط چند ضلعوں اور شہروں میں۔

بنگلہ حروف تہجی کے مسلمان بچوں پر مضر اثرات

جس وقت مسلمان بچے حروف تہجی بنگلہ ورد زبان کرتے ہیں اور اپنا پہلا قدم پرائمری پاٹھ شالا میں رکھتے ہیں اس وقت سے اس کا سادہ اور سریع الانفعال اثر پذیر دل کا سامعہ

بجز حکایات رام و لچھمن، رادھا کرشن اور کچھ نہیں سنتا۔ چھوٹی چھوٹی درسی کتابیں جو بغرض تعلیم اور درستگی خو پڑھائی جاتی ہیں وہ بھی تمام خیالات خام اور دیوتاؤں اور اُنکی بیویوں کی عشق بازیوں کے قصے اور دیگر واقعات سے بھری ہوئی ہیں۔ جس وقت مسلمان لڑکا ایک درجہ سے دوسرے درجے میں ترقی کرتا ہے اور جماعت ادنیٰ سے اعلیٰ تک پہنچتا ہے اس وقت سے اس کی طبیعت ان عقائد اور اطوار و رسوم کی مشارکت سے جن کو ان کی کتابیں تعلیم دیتی ہیں خوگر ہوتی جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جو باتیں مسلمان لڑکے اس تعلیم (زبان بنگلہ میں) سے سیکھتے ہیں اور جن سے آیندہ کی طرز زندگی درست کر سکتے ہیں وہ اکثر مخالف عقائد اور خلاف اسلام ہیں۔ یہ پابندی تعلیم اسکول ان کو اپنے مذہب کی توہین اور اپنے عقائد اسلام کے مخالف مضامین کو مجبوراً حفظ کرنا پڑتا ہے۔ کبھی بھولے سے بھی ان کو اپنے دین اسلام کے بزرگ اور سچے اور پاک لوگوں کی حالت تو درکنار نام تک سننے کی نوبت نہیں آتی۔ ان کا کمال علم اس پر سمجھا جاتا ہے کہ وہ بخوبی رامائن کو موزوں پڑھ سکیں اور مہابھارت کے مضامین کے سمجھنے پر قادر ہوں۔ نوین چندر اور بنکم بابو کہ جنھوں نے مسلمانوں کی ہجو کرنے اور ان پر بیجا تہمت تراشنے اور ان کے سچے واقعات کو بدل کر دکھانے اور مسلمانوں کے اخلاق پر سخت حملہ کرنے اور انھیں شرمناک گالی دینے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ان کی کتابوں سے استفادہ کرنا گویا ان کے لئے باعث فخر اور ان کا مبلغ علم سمجھا جاتا ہے۔

اس قسم کی تعلیم ہے کہ جس کو زمانہ تعلیم اور مدت تاثر عن الرذائل ہے ہمارے مسلمان بچے ہندو متعصب استادوں کی شاگردی سے حاصل کرتے

ہیں۔ ان میں کتنی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اگر میں سرسری طور سے پندرہ برس یا اس کے قریب قریب زمانے کے تعلیمی نتائج کے حساب کو دیکھوں تو بخوبی ظاہر ہو جائے گا کہ ہزارہا مسلمان زادے اس تعلیم کی بدولت اپنے مذہب اور دین اور اخلاق اسلام سے کوسوں دور پڑے ہوئے ملیں گے۔ ہمارے بنگالہ میں بہت سے مسلمان اس خراب تعلیم کی بدولت اپنے مذہب کو ترک کر چکے ہیں اور اپنی مرضی سے آج کل کا نیا برہمو مذہب اختیار کر لیا ہے۔ ایسے واقعات اکثر ضلع رنگ پور، جلپا گوڑی، راج شاہی اور میمن سنگھ یا ایسے مقامات میں جہاں فارسی اردو کی تعلیم زمانہ کے غیر مناسب حالات کی وجہ یا اس طریقہ تعلیم کے نتائج بد سے جو ہندو کے موافق ہے بالکل زوال میں آگئی ہو دیکھا گیا ہے۔ وہ مختصر یا برائے نام مذہبی تعلیم جو مسلمان والدین اپنے بچوں کو قبل اس کے کہ وہ پاٹھ شالاؤں میں بھیجے جائیں دیتے ہیں وہ اس قدر کافی نہیں ہوتی کہ آیندہ پاٹھ شالا کے خراب اثروں کو روک سکے۔

اس قسم کی تعلیم بذریعہ ان درسی کتابوں کے جو ہر سال بنگال کے چار لاکھ مسلمان لڑکوں کو دی جاتی ہے۔ اتنا بڑا نقصان وہ اثر قومیت پر ڈالتی ہے کہ جس کے باعث مسلمان والدین اپنے لڑکوں کو اسلامی نام دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ مجھ کو چند ایسے مقامات کی خبر ہے جہاں مسلمانوں کو اپنے بچوں کا ہندوانی نام رکھنے میں غیرت نہیں آتی ہے۔

مسلمانوں کو تنبیہ جو صحیح ثابت ہوئی

مسلمان بعد از وقت اپنی غلطیوں کو محسوس کرنے لگے کہ انھوں نے ایسے وقت انگریزی کا پڑھنا اپنے اوپر

ضروری نہیں گردانا جس وقت کل ہندو اس میں ہاتھ ڈال چکے تھے۔ اس وقت اگر ہم بنگلہ زبان کی تیز رفتار ترقی کے ساتھ شریک ہونے اور اس میں اپنے علمی خزائن اور قومی ملفوظات کو داخل کرنے سے غافل رہیں تو ہم کو ایک دن ضرور کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔ اس بات کا اندازہ کرنا نہایت ہی مشکل ہے کہ ایک خراب لٹریچر جو ایک طرف مسلمان سے نوجوان اسکول جانے والے لڑکوں کے دل میں نفرت اور دوسری طرف ہندوؤں سے الفت پیدا کر دیتا ہے، کہاں تک خطرناک اثر ان کے دماغ پر ڈال سکتا ہے۔ زمانۂ ماضی میں تو ہماری قوم کے سربرآوردہ حضرات صرف نتائج تعلیم بزبان انگریزی، اور ان کا کیا اثر مسلمانوں پر مترتب ہو سکتا ہے، ان ہی دونوں باتوں پر فضول بحث کیا کرتے تھے۔ ان کی نظر ورناکیولر تعلیم کی اہم ضرورت اور مشکلات پر نہیں پہنچتی تھی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم کو اس بری حالت کی طرف جو بدقسمت موجودہ ورناکیولر تعلیم کے ہم کو پہنچی ہے آنکھیں بند کیے ہوئے نہیں رہنا چاہیے

مسلمان بنگلہ سیکھنے میں پیچھے رہ گئے

جس طرح مسلمان انگریزی زبان کے سیکھنے میں میدان مقابلہ سے بہت پیچھے رہے اسی طرح زبان بنگلہ میں پوری دستگاہ پیدا کرنے میں وہ ہندوؤں سے بدرجہا دور افتادہ رہے۔ جس کا نتیجہ جیسا برا ہونے والا تھا ویسا ہوا۔ ملازمت اور خدمات گورنمنٹ جس طرح ہندوؤں کے قبضے میں کلیتہً رہی اسی طرح بنگلہ زبان میں نصاب کے انتخاب کرنے کا حق بھی تمام تر ہندوؤں کو رہا۔[1]

---

[1] اجلاس کانفرنس ۱۹۳۹ء

مسلمانانِ بنگال کی انفرادیت

مسلمانانِ بنگال کی اس دردناک تعلیمی حالت کے باوصف مسلمانان بنگال نے اپنی انفرادیت قایم رکھی چنانچہ شیر بنگال مولوی فضل حق نے اجلاس ایجوکیشنل کانفرنس کلکتہ کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا:

"آج سے تھوڑے عرصے پہلے بنگال باوجود اپنی تعلیمی پسماندگی اور معاشی افلاس کے اسلامیان ہند کی بیداری و ترقی کی تحریک میں قائدانہ حصہ لے رہا تھا جو اس سے ظاہر ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد ڈھاکہ میں پڑی۔

ڈاکٹر ابوظفر محمد طاہر کھیرڑی بازار نے "یوم اقبال" پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

پورے ہندوستان میں جتنے علما، ہوں گے صرف مشرقی بنگال اس سے زیادہ علما، پیش کرسکتا تھا۔ اس کے باوجود کیا کوئی ہے جو ایک ہی عالم کا نام پیش کردے۔ جسے عالمگیر شہرت حاصل ہو"

سوال یہ ہے کہ آخر یہ صورت کیوں اور کیسے پیش آئی؟

مندرجہ بالا اقتباس میں جو سوال اٹھایا گیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانانِ بنگال کو زبردستی لسانی پالیسیوں کا شکار بنایا گیا۔ اب مرض اتنا بڑھ چکا ہے کہ کوئی غیر معمولی تبدیلی ہونا یا کرنا آسان کام نہیں ہے۔ بہر نوع ہمیں کوئی نہ کوئی مناسب راہ ڈھونڈنی پڑے گی۔ اس لئے کسی نہ کسی راہ پر چلنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ قومی زندگی میں تعطل حرام ہے۔ جناب بدرالدین احمد لکھتے ہیں:-

"مسلمان بنگلہ تو بگڑی ہوئی بنگالی میں اردو فارسی اور عربی الفاظ کی

آمیزش سے وجود میں آئی ہے۔ .... ایک بات مسلمان بنگالی کے حق میں کہنا ضروری ہے وہ یہ کہ بنگالی کی یہی شکل ہے جو ان مسلمان بچوں کی سمجھ میں نسبتاً آسانی سے آجاتی ہے۔ جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ یہ ان کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس زبان میں مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے مذہب سے متعلق مواد منتقل کیا جائے اور ابتدائی کتابوں میں موقع بموقع داخل کیا جائے۔"

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس برادرانِ بنگال کی طرف سے ان قومی مرحلوں پر غافل نہیں تھی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۳ء کے اجلاس آگرہ میں مندرجہ ذیل رزولیوشن پاس ہوا۔

"کلکتہ یونیورسٹی کے متعدد امتحانات میں چونکہ ملکی زبان (بنگالی) لازمی کردی گئی ہے اور بنگالی دو آٹھ یا زبانوں کی قریب قریب درسی کتب اور وہ کتابیں جن کی سفارش کی گئی ہے۔ ہندوؤں کے قصص مذہبی اور روایات سے پُر ہیں۔ اور مسلمان طلبا کی مذہبی اور قومی روایات کے منافی ہیں اس لئے یہ کانفرنس کلکتہ یونیورسٹی کے حکام کو ایسی کتابوں کے مقرر کرنے کی طرف متوجہ کرتی ہے جو اس خصوص میں مسلمان طلبا کی ضروریات پورا کر سکیں۔

مسلمانوں نے بنگلہ زبان و ادب کی شاہی دور ہی تک خدمت نہیں کی تھی بلکہ آخر وقت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس زبان کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا جانے لگا۔

جنگ پلاسی میں نواب سراج الدولہ کی شکست کے بعد مسلمانوں کی تاریخ کا ایک شاندار باب ہی ختم نہیں ہوا بلکہ جملہ شعبہ ہائے حیات کے دروازے

ان پر بند کر دیے گئے۔ لیکن اس دور میں ایک قابل ذکر واقعہ یہ پیش آیا کہ پہلی مرتبہ نثر میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔ میر مشرف حسین (۱۸۴۸ تا ۱۹۱۱ء) پہلا اہم مسلمان مصنف گذرا ہے جس نے رقت دلی اور بلند شدہ حوادث کربلا لکھ کر لوگوں کو متاثر کیا۔ اسی زمانے میں کیقباد، شہادت حسین، عبدالکریم شاہتیاد ساد وبھی لکھے گئے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر شہید اللہ مرحوم اور جسیم الدین کی تصانیف خاص قدر و قیمت کی مالک ہیں۔ قاضی نذرالاسلام نے تو خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔

باب - ٦

بنگلہ ایک قومی زبان .... قیام پاکستان کے بعد

سنہ ۱۹۴۷ء میں مسلمانان پاک و ہند کی مشترکہ جد و جہد کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور دنیا کی ایک عظیم الشان نظریاتی اسلامی حکومت پاکستان معرض وجود میں آئی۔ اب تک ہم انگریزوں کی لسانی پالیسی اور بنگال کا تفصیلی ذکر کرتے رہے۔ اس طویل سرگزشت میں بنگلہ زبان کے ماضی بعید اور ماضی قریب کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ فارسی عربی اور اردو زبانوں کا مسلمانان بنگال سے جو تاریخی تعلق رہا ہے اس کی تفصیل بھی پیش کی جا چکی ہے۔ نیز یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انگریزوں نے لسانی انتشار انگریزی زبان کے فروغ کے واسطے پیدا کیا تھا۔ لیکن سنہ ۴۷ء کے بعد صورت حال یکسر تبدیل ہو گئی جس کی تفصیل پیش کرنا اگرچہ ہمارے موضوع سے باہر ہے تاہم تسلسل بیان کی خاطر ہم ملک فیروز خاں نون، محمد علی بوگرہ مرحوم اور آخر میں اپنے سابق صدر پاکستان کے بیان پیش کرتے ہیں۔ ان بیانات اور واقعات کی روشنی میں اہل الرائے اور صاحبان عقل و دانش کو اپنی راہ متعین کرنے نیز قومی پروگرام پر عمل کرنے کا موقع مل سکے گا۔ محمد علی بوگرہ مرحوم کی تقریر ایک طویل ڈرامے کا ڈراپ سین سمجھئے جس کی تفصیل لاحاصل ہے جو انھوں نے ۷ مئی سنہ ۱۹۵۴ء

کو دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں فرمائی۔ مرحوم کے الفاظ یہ تھے :۔

"میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ میں یہ ترمیم پیش کرتا ہوں کہ رپورٹ کے سولھویں باب کے بعد حسب ذیل نیا باب شامل کر دیا جائے۔"

جمہوریت کی زبان

۲۵۶ (۱) جمہوریت کی سرکاری زبان اردو بنگالی نیز وہ صوبائی زبانیں ہونی چاہئیں۔ جن کی بابت متعلقہ صوبائی مجالس قانون ساز کی سفارش پر صدر مملکت ایسی زبان ہونے کا اعلان کر دیں،

(۱) پارلیمنٹ کے ارکان کو انگریزی کے علاوہ اردو اور بنگالی میں تقریر کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

(۲) دستور کے نفاذ سے بیس سال کے عرصے تک مندرجہ بالا دفعہ کی تصریحات کے باوجود انگریزی زبان جمہوریت کے ان تمام سرکاری مقاصد کے لئے استعمال ہوتی رہنی چاہیے۔ جن کے لئے وہ دستور کے نفاذ سے فوراً پہلے استعمال ہوتی تھی۔

(۳) مرکزی ملازمتوں کے امتحانات کے لئے تمام صوبائی زبانوں کو مساوی درجہ حاصل ہونا چاہیے

(۴) ثانوی مدارس میں عربی، اردو اور بنگالی کی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے، تاکہ طلبا اس زبان کے علاوہ جو ذریعہ تعلیم ہو ان میں سے ایک یا دو زبانیں لے سکیں۔

(۵) مملکت کو ایک مشترک قومی زبان کو ترقی دینے کی تمام تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

(۶) دستور کے نفاذ کے دس سال بعد ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو انگریزی کا بدل تجویز کرنے کے بارے میں سفارش کرے۔

(۷) مندرجہ بالا دفعات کی تصریحات کے باوجود وفاقی مجلس قانون ساز دستور کے نفاذ کے بیس سال کی مدت ختم ہونے کے بعد از روئے قانون ان مقاصد کے لئے جن کی قانون میں صراحت کر دی جائے گی انگریزی زبان کے استعمال کے بارے میں انتظام کر سکتی ہے۔

بنگلہ کے قومی زبان کے مسئلہ پر محمد علی بوگرہ مرحوم کی تاریخ ساز ترمیم پڑھنے کے بعد اس دور کی ایک اور بڑی شخصیت ملک فیروز خاں نون کی تصریحات اور تاثرات بھی قابل ملاحظہ ہیں۔ ملک صاحب ایک مرنجاں مرنج آدمی ہیں ان کا فلسفہ ع "باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی" کے مصداق ہے۔ ملک صاحب نے زبان کے مسئلہ پر اپنے خیالات کے اظہار کا آغاز فرانسیسی پارلیمنٹ کے زبان کے تنازعہ کی مثال سے کیا ہے فرماتے ہیں:

"مدتوں اس مسئلہ پر زبردست تحریک چلتی رہی کہ فرانسیسی کو پارلیمنٹ کی زبان کے طور پر قبول کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ بالآخر کتاب آئین میں اسے متبادل زبان کے طور پر شامل کر لیا گیا۔ اور چونکہ فرانسیسیوں کی انا کی تسکین ہو چکی تھی۔ لہٰذا اس کے بعد کسی ممبر نے جو اپنے خیالات کو پارلیمنٹ کے دردسرے

ارکان تک پہنچانے کا خواہشمند ہوتا تھا، فرانسیسی زبان میں تقریر نہیں کی اور بیشتر ارکان انگریزی بولنے لگے۔ پاکستان کی آزادی کے بعد میں کراچی میں نئی مرکزی اسمبلی کا رکن مقرر ہوا تو یہ نظریہ میرے لئے نہایت کارآمد ثابت ہوا بنگال کے نمائندے بنگالی میں تقریر کرنے پر مصر تھے جسے ہم مغربی پاکستان کے لوگ سمجھنے سے معذور تھے۔ اس وقت میں نے اصرار کیا کہ بنگالی کو متبادل زبان کے طور پر قبول کر لیا جائے اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اسمبلی نے اس تجویز کی تائید میں قانون منظور کر لیا۔ اس کے بعد سے شاید ہی کسی بنگالی رکن نے کبھی بنگالی زبان میں تقریر کی ہو۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ آپ اگر لوگوں کی انا کی تسکین کر دیں تو مخالف بھی دوست بن جاتے ہیں۔

ایک تاریخ ساز فیصلہ بنگلہ قومی زبان بنتی ہے

میرا خیال ہے کہ نئے وزیراعظم بھی مجھ پر اسی قدر اعتماد کرتے تھے لیکن وہ چونکہ بنگالی تھے اور آزادی سے پہلے متحدہ بنگال کے وزیراعظم رہ چکے تھے اس لئے انھیں اپنے خیال کے مطابق مشرقی پاکستان پر ہر طرح کے فیصلے لاگو کرنے کا زیادہ حق حاصل تھا۔ اس طرز فکر کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے بحیثیت وزیراعظم اپنے پہلے دورۂ ڈھاکہ میں زبان کے مسئلہ پر ایک نہایت دیانتدارانہ لیکن سیاسی اعتبار سے عاجلانہ اور ناقابل قبول تقریر کر دی۔ اس تقریر کے بعد لسانی تحریک شروع ہو گئی اور طلبا میں خلفشار پیدا ہو گیا۔ میں نے کسی غیر آئینی طریقہ کار کی سفارش نہیں کی اور نہ خود کوئی غیر آئینی طریقہ اختیار کیا بلکہ انتظامی اختیارات پر اپنی گرفت پہلے سے مضبوط کر دی

مشرقی پاکستان میں ہر مسلمان بچہ کلام پاک پڑھنا جانتا ہے اور وہ عربی

رسم الخط میں ہوتا ہے۔ لیکن بنگالی زبان دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے مغربی پاکستان میں اردو کا رسم الخط بھی عربی کی طرح ہے۔ لیکن مشرقی پاکستان میں بچہ کو دو رسم الخط جبراً سیکھنے پڑتے ہیں۔ ایک عربی اور دوسرا دیوناگری۔ میں نے اس وقت کے وزیر اعلیٰ مسٹر نورالامین سے اس مسئلہ پر تبادلہ خیال کیا اور انھوں نے یہ تسلیم کیا کہ بچوں کے والدین سے اگر استصواب کرایا جائے تو وہ سب کے سب بنگالی رسم الخط ترک کرنے اور بچوں کو ایک رسم الخط یعنی عربی سکھانے کے حق میں رائے دیں گے۔ بنگالی اردو رسم الخط میں لکھی جا سکتی ہے اور اس امر کے متعدد تاریخی شواہد موجود ہیں کہ شیر شاہ سوری کے زمانے میں یہ تجربہ بھی ہوا تھا۔ لیکن نورالامین سیاسی اسباب کی بنا پر اس بارے میں کوئی قدم اٹھانے پر راضی نہ ہوئے۔ میں یہ جانتا تھا کہ ہندو عربی رسم الخط کو ناپسند کرتے ہیں۔ ۴۲ کروڑ بیس لاکھ کی آبادی میں ہندوؤں کی تعداد تقریباً اسی لاکھ ہے۔ تاہم ان کے پاس دولت ہے اور صوبائی اسمبلی میں ووٹوں کی فیصلہ کن تعداد ان ہی کے ہاتھوں میں مرکوز ہے۔ اس کے علاوہ بیشتر درسی کتابیں اس وقت تک کلکتہ سے چھپ کر آ رہی تھیں اور جہاں مفادات موجود ہوں وہاں ان کو توڑنا سخت مشکل ہوتا ہے۔ میرے لئے یہ اطلاع دلچسپی کا موجب ہوئی کہ صوبے میں سو سے زیادہ پرائیوٹ اسکولوں میں ڈیڑھ سو سال سے اردو پڑھائی جا رہی تھی لیکن سرکاری اسکولوں میں ایسا کوئی انتظام نہ تھا۔ چونکہ وہاں ایسے اسکول بہت کم ہیں جن میں تعلیم کا ذریعہ اردو یا انگریزی ہو، لہذا مغربی پاکستان کے سرکاری ملازم مشرقی پاکستان میں اپنا تقرر کراتے وقت نہایت پس و پیش

کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے بچوں کی تعلیم میں شدید دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں، بڑی بیوی نے اس ضرورت کا احساس کرتے ہوئے ڈھاکہ میں ایک بہت بڑا مدرسہ طالبات کے لیے قایم کیا جو اب بھی ان کے نام سے قایم ہے اور مشرقی پاکستان کے بہترین تعلیمی اداروں میں شمار ہوتا ہے اس اسکول میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اور دوسری زبان اردو یا بنگالی میں سے کوئی بھی منتخب کرلی جا سکتی ہے۔

غرض پاکستان کے لسانی مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں بڑی طول طویل بحث و مباحثہ کے بعد سنہ ۱۹۵۶ کے قانون اساسی میں بنگلا اور اردو کو مملکت کی آیندہ زبانیں قرار دیا گیا تھا۔ جب یہ قانون معطل ہو گیا اور سنہ ۱۹۶۲ء میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے مملکت کو ایک نیا آئین عطا کیا تو اس میں ان زبانوں کو ملک کی قومی زبان قرار دیا گیا۔

اس فیصلہ کے بعد کسی بحث اور غور و خوض کی قطعی گنجائش باقی نہیں رہی بلکہ قوم کے سامنے صدق دلی کے ساتھ اس قومی فیصلہ پر عمل درآمد کرنے کا مسئلہ ہے۔ غالباً سنہ ۱۹۷۲ء تک آئین کے تقاضوں پر حقیقی معنی میں عمل ہو سکے گا۔

قوموں کی زندگی میں کوئی قانون کوئی ضابطہ اٹل نہیں ہوتا۔ بلکہ حسب ضرورت مناسب ترامیم ہوتی رہتی ہیں۔ چونکہ زبان کا مسئلہ بڑا نازک ہے اس پر قوم کے مستقبل کا دار و مدار ہے اس لئے ہمارے اکابر برابر اس مسئلہ کے علمی پہلوؤں پر غور و فکر کرتے رہے ہیں۔ اس ضمن میں صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے خیالات قومی جذبات کے حامل ہیں۔

پاکستان میں زبان کا مسئلہ

سابق صدر پاکستان کی نظر میں

ہمارے ملک میں زبان کا مسئلہ ہموار اور یکساں نظام تعلیم کی راہ میں سخت رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ کمیشن نے دونوں قومی زبانوں یعنی بنگلہ اور اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی حمایت کی ہے اس نے دو رسم الخطوں کے مسئلہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن ان دشواریوں کو بیان نہیں کیا جو دو زبانوں اور دو رسم الخطوں کے ہونے سے ایک ابھرتے ہوئے معاشرے کو پیش آ سکتی ہیں جبکہ اس معاشرے کا ایک ہی نصب العین اور ایک ہی مقدر ہو اور وہ متحد ہو کر ایک قوم بن جانے کا خواہشمند بھی ہو زبان کے مسئلہ کو لازماً ایک علمی اور سائنسی مسئلہ کے طور دیکھنا چاہیے بدقسمتی سے یہ ایک بڑا خطرناک سیاسی مسئلہ بن گیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ کوئی شخص بھی اس ڈر سے کہ کہیں اس کے الفاظ کے غلط معنی نہ لیے جائیں اس مسئلہ پر بات کرنا نہیں چاہتا۔ ہمارے اربابِ عقل و دانش جن کو اس مسئلہ سے سب سے زیادہ دلچسپی ہونا چاہیے تھی مصلحتاً اس سے کنارہ کش رہے۔ کیونکہ ان میں اس مسئلہ سے دوچار ہونے کی اخلاقی جرات نہیں ہے۔ ان کا رویہ یہ رہا ہے کہ بس اس مسئلہ کو سیاسی رہنماؤں ہی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اس کا حل تلاش کریں اور اس کے نتائج کو بھگتیں اور وہ خود آرام سے پیچھے بیٹھ کر اس حل کو تنقید کا نشانہ بنائیں۔ مجھ پر یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ دو قومی زبانوں کے ہوتے ہوئے ہم ایک قوم والی مملکت کبھی نہیں بن سکتے ہماری حیثیت کئی قوموں والی مملکت ہی کی رہے گی۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا

جائے کہ میں اس حیثیت کے خلاف کوئی حجت پیش کر رہا ہوں۔ میں تو فقط ایک حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں جس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ ایک زبان کو پورے ملک پر مسلط نہیں کیا جا سکتا۔ نہ تو بنگالی ہی پورے پاکستان کی زبان بن سکتی ہے اور نہ اردو ہی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بجا و درست ہے کہ اگر عوام یعنی مشرقی اور مغربی دونوں صوبوں کے عوام ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل جانا چاہتے ہیں۔ تو انھیں ایک دوسرے کی بات سمجھنے کیلئے کوئی نہ کوئی ذریعۂ اظہار لازمی طور پر ہونا چاہئے۔ ایسا ذریعہ اظہار تیار کرنے کے لئے ہمیں بنگالی اور اردو کے مشترکہ عناصر کو یکجا کرنا ہوگا اور ایک مشترکہ رسم الخط کے ذریعہ انھیں پڑھنے اور پھولنے پھلنے کا موقع دینا ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام مدتوں میں جا کر پورا ہوگا۔ لیکن جوں جوں دونوں صوبوں کے عوام ذہنی طور پر ایک دوسرے کے قریب آتے جائیں گے اور ایک دوسرے سے واقفیت بڑھتی جائے گی۔ ایک قومی ذریعہ اظہار خود بخود پیدا ہو کر کوئی صورت اختیار کرے گا میں اس خیال کو کسی پر مسلط نہیں کر سکتا۔ میں تو بس یہی کر سکتا ہوں کہ یہ مسئلہ آپ کے سامنے پیش کر دوں اور اس پر زور دوں کہ اگر ہم اپنی قومی سالمیت اور یک جہتی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو اس مسئلہ کا حل ضروری ہے۔ ؎

سابق صدر پاکستان مارشل محمد ایوب خاں سے ہماری قوم کو لاکھ اختلاف صحیح لیکن ان کا مندرجہ بالا تبصرہ بہر صورت قابل غور ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زبان کے مسئلہ کو محض علمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ دفتری زبانوں کی بنیاد پر کسی قوم و برادری کے واسطے سرکاری ملازمتوں کے کھلنے اور بند

ہونے کا مسئلہ بھی اُبھرتا ہے۔ نیز قوم اور برادریوں کی ذہنی صلاحیتوں کے بروئے کار آنے یا مضمحل ہو جانے کا سوال پیدا ہوتا ہے؟

ساتھ ہی ساتھ ہم کو یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ چھوٹے بڑے یونٹوں اور برادریوں کے نسبتاً چھوٹے چھوٹے مسائل کی خاطر خدانخواستہ پوری ملت کی تباہی کے اسباب مہیا نہ ہو جائیں۔ جہاں تک پاکستانی علاقائی بولیوں کا تعلق ہے ان سب میں ایک بات مشترک ہے اور وہ ہے ان کا اسلامی پیغام سے متاثر ہونا۔ ان بولیوں میں اسلامی روح فارسی اور عربی الفاظ اور لٹریچر کے اثر سے پہنچی۔ جہاں جہاں مسلمانوں کا قدم پہنچا وہاں عربی کے قدم جمے پھر فارسی نے اپنا مجلسی مقام حاصل کیا اور یہ لسانی تعلق آہستہ آہستہ مقامی بولیوں پر اثر پذیر ہوتا گیا۔ چنانچہ پنجابی زبان میں عربی، پشتو اور اردو کے بے شمار الفاظ ذرا بگڑی ہوئی شکل میں موجود ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ روزمرہ کی گفتگو میں آپ اگر پنجابی زبان نہ بھی جانتے ہوں تب بھی مطلب سمجھ جائیں گے۔ اسی وجہ سے اس زبان کو اردو سے بہت قریب سمجھا جاتا ہے۔ اب ذرا پشتو، سندھی اور بلوچی زبانوں کا مطالعہ کیجئے۔ ان سب میں یہ قدر مشترک پائی جائے گی۔ اردو اور بنگلہ کا بظاہر رسم الخط علیحدہ ہے، روح اور ساخت بھی علیحدہ ہی ہے لیکن یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ان دونوں بڑی زبانوں میں بھی ایک بات واحد ہے، اور وہ عربی اور فارسی الفاظ کا موجود ہونا ہے۔ جناب مخمورؔ اکبرآبادی اپنی عالمانہ کتاب "اردو زبان اور اسالیب" میں اس حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں:۔

بنگالی زبان اور اہل بنگال پر مسلمانوں کے معاشرتی اثرات

" معاشرت میں گھل مل جانے کے بعد عربوں کی زبان کا مقامی بولی پر اثر پڑنا لازمی تھا۔ یہ اثر پڑنا شروع ہوا، پڑتا رہا اور صدیوں کی مدت میں جڑ پکڑ گیا۔ چنانچہ یہ کہنا تمام و کمال صحیح نہیں، ہے کہ اسلامی تمدن پٹھان فاتح اپنے ساتھ بنگال میں لائے۔ عرب سیاحوں تاجروں نے نواکھالی اور چاٹگام کے باشندوں میں اسلامی تمدن کے جلب و قبول کے لئے زمین تیار کر دی تھی، فقرا اور مشایخ کی مشنری خدمت و ایثار نے اس باب میں سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ عرب قوم کی نمایاں جسمانی خصوصیتیں، لمبا قد، چوڑا سینہ، پتلی کمر اس کے علاوہ بعض کرداری علامتیں، خموشی، سنجیدگی، بے دردی، خونخواری، آج بھی ساحلی اضلاع کے مسلمانوں میں نمایاں ہیں، جو نسل اور خون کا صاف پتہ دیتی ہیں، آواز اور لہجہ کو دیکھئے تو عربی کا جیسا قاری بنگال میں میسر آتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے کسی حصہ کو نصیب نہیں: ناموں کی ترکیب آج بھی صاف عربی نمونے کی ہے۔ عبدالمحمود، ابوالمکارم سلیم اللہ، ابوالفضل حکیم اللہ، عبدالاول اور شمس النہار وہاں کے عام پسند نام ہیں۔

بنگلہ زبان

چنانچہ بنگلہ میں بھی بے شمار الفاظ عربی زبان کے در آئے، جو مسخ شدہ اور اصل صورت میں موجود ہیں۔ اور پہچانے جاتے ہیں۔

کودا اور تیات کی صورت اور صوت بتاتی ہیں کہ یہ " قدح " اور " تفاوت " ہیں۔ لطف یہ ہے کہ یہ الفاظ آج بھی پیالہ اور فرق کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں، کتھائے اور بوشن۔ کجائے اور بینش کی مسخ صورتیں ہیں۔ ان کا تلفظ اصل سے کچھ دور جا پڑا ہے لیکن معنی وہی ہیں جو اصل

فارسی الفاظ کے ہیں۔ عین الناس سے اناس اور اناناس سے انارشس بنا۔ چھُڑی وہاں ناکتخدا دوشیزہ کو کہتے ہیں اور یہ عربی لفظ "جدیدہ" کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ ناریل نارجیل سے جتنا قریب ہے ظاہر ہے۔ ہمہ گلا۔ حملہ اور عمل" ہے۔

آب و ہوا اور مقامی حالات کا لہجہ پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ علمائے لسان نے بتایا ہے کہ ایک زبان کا لفظ دوسری میں پہنچ کر لہجہ کے فرق سے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ کیا کوئی فوراً بتا سکتا ہے کہ موجم دار، کھند کور، کار پھورما کی اصلیت کیا ہے۔ یہ معظم دار، خواند کار، اور کار فرما ہیں۔ اسی قبیل کے دو نام تعلقہ دار اور طرف دار ہیں مگر ان کی صوتی شکل ابھی مسخ نہیں ہوئی ہے۔

مغلوں کے زمانے میں بنگالی امرا اور عہدہ داروں کو جو خطاب دیئے جاتے تھے ان میں سے معظم دار اور تعلقہ دار بھی ہیں۔ خواند کار غالباً پیش کار اور دفتر کا کام کرنے والے کے عہدہ کا نام تھا۔ کار فرما بھی شاہی محل یا دربار سے متعلق کسی عہدے کا نام تھا[1]

یہ الفاظ ان ذرائع سے بنگلہ میں داخل ہوئے اور بنگلہ زبان کو انھیں قبول کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہوا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بنگال کے مشہور قومی شاعر قاضی نذرالاسلام کے کلام کی برابر اس لئے اہانت کی گئی اور سرکاری کوششوں سے اب یہ صورت حال بدل گئی ہے کہ اس میں عربی فارسی اصل کے بنگلہ الفاظ کی کثرت ہے آج بھی . . . . بعض تنگ نظر . . . . یہ سن کر خفا ہوتے ہیں

کہ فلاں فلاں الفاظ بنگلہ بھاشا میں عربی اور فارسی کے ہیں۔ اور اس بنا پر بنگلہ زبان اردو سے بہت قریب ہے۔ داخلی تحلیلی جائزہ لینے پر بنگلہ میں چالیس فی صد الفاظ عربی کے میسر آجائیں گے۔

سنہ ۱۸۱۳ء میں بنگال کی حکومت وقت نے زمینداری و آراضی کے معاملات پر مبنی ریکارڈ شائع کیا تھا۔ اس کے آخر میں عام طور پر دفاتر میں استعمال ہونے والے الفاظ کی ایک بسوط فہرست شائع کی گئی تھی، یہ کتاب سر استوتش مکرجی کی توجہ سے ۱۹۱۷ء میں دوبارہ شائع ہوئی۔ فہرست محولہ بالا کو دیکھنے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عربی فارسی کی کس حد تک حکمرانی تھی۔

مندرجہ بالا معروضات کی روشنی میں ضرورت ہے کہ اہل الرائے اور صاحب نظر اشخاص مستقل تصانیف کرکے بنگلہ اردو کو ایک دوسرے کے قریب کر دیں اور تخریب کاروں کی اس کوشش کو ناکام بنا دیں کہ بنگلہ سے فارسی عربی الفاظ بدستور خارج رہیں جو بنکم چٹر جی جیسے متعصب افراد کا اصلی کارنامہ شمار کیا جاتا ہے۔ بنگلہ زبان میں اسلامی علوم و فنون کو اس طرح منتقل کیا جائے کہ یہ زبان اپنے مذہبی اور علمی سرمایہ کے اعتبار سے اردو کی ہم پلہ ہو جائے۔ جب یہ کام پیہم مخلصانہ کوششوں سے سرانجام پا جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ ہمارے ملک سے اقتصادی بے چینیوں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا تو یقیناً وہ لمحہ آجائے گا جب قوم کے دردمند لوگ رسم الخط کے مسئلہ کا حل تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ حروف القرآن سوسائٹی کے تجربے کو بھی سامنے رکھنا چاہیے اس سوسائٹی کے اخبار "حروف القرآن" چاٹگام

کی پیشانی پر ایک شعر درج رہتا تھا۔ دل چاہتا ہے کہ وہ بطور یادگار نقل کر دوں ؎

از خونِ دل نوشتم نقش و نگارِ قرآں
نامش اناں نہادم یارب حروفِ قرآں

مندرجہ بالا سطور لکھی جا چکی تھیں کہ تعلیمی اصلاحات کا تاریخی اعلان شائع ہوا۔ جس کی شق الف صفحہ ۵ کے مطابق یہ تجویز کیا گیا کہ ۱۹۷۴ء تک اردو اور بنگلہ کو صوبائی دائروں میں جاری کر دیا جائے گا نیز بنگلہ کو بنگال کی صوبائی زبان بنا دیا جائے گا۔ اور اردو کو مغربی پاکستان کی زبان تسلیم کر لیا جائے گا۔ اور ۱۹۷۵ء تک مرکزی دفاتر کی زبان اردو بنگلہ بنا دی جائے گی۔

مولانا راغب احسن کا بیان مندرجہ بالا فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈھاکہ کے مشہور و معروف بزرگ مولانا راغب احسن صاحب رقم طراز ہیں :

ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہمیں اردو اور بنگلہ صوبائی و مرکزی زبانوں کی حیثیت سے قبول و منظور ہے بشرطیکہ بنگلہ عربی رسم الخط (حروف القرآن) میں جاری و منظور کی جائے جو عین ممکن ہے اور بنگال کی بھاری اکثریت کا مطالبہ بھی ہے۔ بنگلہ سنسکرتی رسم الخط میں نہ کبھی کسی صوبے کی زبان رہی ہے اور نہ ہوگی۔ بلکہ ممکن ہی نہیں۔ جیسا کہ

مغربی بنگال کے تجربے سے ثابت و روشن ہے۔"

اسی مقالہ کے آخر میں مولانا نے چند ایک بہت نفیس تجاویز پیش کی ہیں جو من وعن درج ذیل ہیں:

(۱) بنگال کے ایک کروڑ مہاجرین اور کروڑوں انصار بھائیوں کا مطالبہ ہے کہ بنگال میں اسکولوں اور مدارس عربیہ اسلامیہ کی زبان اور ذریعۂ تعلیم بدستور اردو رکھا جائے۔ اردو اسکولوں کا نظام جداگانہ قائم و برقرار رکھا جائے اردو اسکولوں اور اردو کالجوں اور اردو یونیورسٹیوں کے نظام کو فروغ دیا جائے۔

(۲) ورنہ یہ خطرہ یقینی ہے کہ لسانی لحاظ سے پاکستان شرقی و غربی متفرق و جداگانہ دو منفصل خطوں میں تقسیم ہوگا اور مشرق و مغرب کے درمیان کوئی رابطہ باقی نہیں رہے گا۔

(۳) بنگال کے اندر اردو کے جداگانہ نظام تعلیم کے پہلو بہ پہلو اور اس کے ساتھ پیوستہ طور پر کلاس ششم سے میٹرک تک بنگلہ ہر طالب علم کے لئے لازمی رکھی جائے۔

(۴) بنگال میں اردو و بنگلہ طلباء کے لئے رسم الخط عربی یا سنسکرتی دونوں اختیاری رکھی جائے۔ جو طلبا جی چاہے عربی رسم الخط کے ذریعہ بنگلہ سیکھیں اور جی چاہے سنسکرتی رسم الخط اختیار کریں۔ کوئی جبر کسی کے لئے لازمی نہ ہو۔

(۵) مرکزی پاکستانی گورنمنٹ کی قرار داد اسلام آباد مورخہ ۱۷ جولائی

سنہ ۱۹۶۹ء کے مطابق پاکستان نیشنل لینگویج اکادمی، پاکستان قومی زبان اکادمی دارالخلافہ پاکستان کے مرکز میں قایم کی جائے جو بیک اردو اور بیک بنگلہ کے متعلق تحقیقات اور عملی کام کرے۔

(۶) پاکستان قومی زبان اکاڈمی کو ہدایت جاری کی جائے کہ ملی و قومی زبان کے اعتبار سے بیک اُردو بیک بنگلہ کے قریب ترین کرنے کی پالیسی پر عمل کرے اور رسم الخط کے لحاظ سے دونوں قومی زبانوں کے واسطے لسان القرآن عربی رسم الخط کو اختیار و جاری کرے۔ اور رفتہ رفتہ ۱۹۷۱ء تک بنگلہ بخط عربی جاری کرے اور رواج دے۔

(۷) پاکستان قومی زبان اکاڈمی کو ہدایت کی جائے کہ اردو و بنگلہ کی ترقیاتی اسکیم میں بنیادی اصول یہ تسلیم کیا جائے کہ نئی نئی اصطلاحات تراکیب و الفاظ تمام تر عربی ماخذوں و مصدروں سے مرکب کئے جائیں اور قانونی و آئینی و علمی اصطلاحات ہم آہنگ و متوازن اور اسلام پرور رکھے جائیں تاکہ دفتروں کے علمی نظم و نسق چلانے میں دقت نہ ہو۔

(۸) اس طریقہ سے اور صرف اس طریقہ سے صوبہ بنگال اور مرکزی پاکستان کے اندر دفتروں کی زبان بیک وقت اردو اور بنگلہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ عربی رسم الخط اختیار کرنے سے بائیں سے داہنے لکھنے کی ساری دقت ختم ہو جائے گی۔ بنگلہ آسانی کے ساتھ

بخط عربی و باصطلاح عربی صوبہ و مرکز کے اندر دفتری زبان کی حیثیت سے جاری ہو سکتی ہے۔ ورنہ بنگلہ بخط سنسکرت و باصطلاح سنسکرت کبھی پاکستان کی زبان نہیں بن سکتی ہے۔ اور ایک صدی میں بھی جاری نہیں ہو سکتی۔

مغربی بنگال کا تجربہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۹ء تک ناکام ہو چکا ہے، اور ناکام رہے گا

(بحوالہ روزنامہ حریت کراچی ۱۱ر اکتوبر ۱۹۶۹ء)

اس سلسلہ میں مولانا راغب احسن صاحب کی تجاویز کے ساتھ ساتھ محترمہ رئیسی بیگم دختر شیر بنگال مولوی فضل الحق مرحوم کے ارشادات بھی پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہیں۔ آپ لکھتی ہیں:۔

گاندھی جی کی سرپرستی میں انڈین نیشنل کانگریس نے اردو اور اردو سے قریب تر بولیوں کے خلاف اور ہندی کی حمایت میں ایجی ٹیشن شروع کیا اور دو دیا ساگر نے بنگالی بولی کی شدھی کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ بنگالی بولی سے فارسی اور عربی کے الفاظ خارج کرکے اس میں سنسکرت کے الفاظ شامل کئے جائیں۔ بنگالی کے لئے سنسکرت گرامر رائج کی جائے، اور اس میں ہندو دیو مالا، ہندو دیوتاؤں اور دیویوں کی کہانیاں شامل کی جائیں۔ مسلم بنگالی پر آخری وار کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر آستوش مکرجی نے کیا۔ انھوں نے شدھ بنگالی کو جس سے عربی اور فارسی کے تمام الفاظ خارج کر دیئے گئے تھے۔ بنگال کے تمام ہائی اسکولوں اور کالجوں کے لئے لازمی

قرار دے دیا اور اس کے خلاف ہم بنگال کے مسلم لیڈروں نے کوئی صدائے احتجاج بلند نہ کی۔ کیونکہ وہ شرفائے بنگال تھے، انھوں نے احتجاج کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ ان کی یہ خود پسندی اور خود بینی اسلام کے سراسر منافی تھی اور بے حسی کے مترادف۔ مسلمان طالب علم امتحان کے پرچوں میں اپنی بنگالی لکھنے سے ڈرتے تھے۔ کیونکہ انھیں اندیشہ تھا کہ کہیں ہندو ممتحن اُن سے انتقام نہ لیں پاکستانی یونیورسٹیوں میں آج بھی بنگالی سنسکرت کے شعبہ کی لونڈی ہے حالانکہ ضرورت تھی کہ بنگالی کو سنسکرت کے شعبہ سے الگ کر دیا جاتا اور اردو و بنگالی کا علیحدہ علیحدہ شعبہ قایم کیا جاتا۔ دونوں قومی زبانوں کی ترقی کے لئے ایک بورڈ کے بجائے دو الگ بورڈ بنائے جاتے جن میں ایک بورڈ کا تہذیبی قبلہ کلکتہ ہوتا اور دوسرے کا تہذیبی قبلہ مکہ۔

باب ۷

صوبہ بہار

انگریزوں کے عہد سے صوبۂ بنگال اور بہار کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے، نواب علی وردی خاں کے عہد میں یہ دونوں صوبے بمعہ اڑیسہ ایک ہی حاکم کے تحت رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہار کا صوبہ بنگال کی تعلیمی، تاریخی اور سیاسی تبدیلیوں سے پوری طرح متاثر ہوتا رہا۔ بہار زمانۂ قدیم سے علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ جہاں تک اردو زبان اور بہار کا تعلق ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس علاقہ کو دہلی اور یوپی کے بعد اردو کا تیسرا بڑا مرکز ہونے کی عزت حاصل رہی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا ارشاد ہے کہ

"جس طرح دوسرے صوبوں کے قدیم بزرگوں کے دہن مبارک سے اس بولی (اردو) کے متعدد فقرے نکلے ہیں اس صوبے کے بزرگ بھی اس کو بولتے اور سمجھتے تھے۔ اس کے بعد جوں جوں یہ بولی ترقی کر کے زبان بنتی گئی اس کی ترقی میں یہ قطعۂ ہند بھی اپنی بساط بھر حصہ لیتا رہا۔ اور یہ حالت اس وقت تک قایم رہی جب تک کہ نئی حکومت نے اس صوبہ کو بنگال میں ملاکر اس کی مستقل حیثیت کو مٹا نہ دیا۔ اور بہار کے تمام دفتروں اور صیغوں میں بنگالیوں کا تقرر عمل میں نہ آیا۔ جو ہندوستانی کے ایک حرف سے بھی آشنا نہ تھے۔ ساتھ ہی صوبے میں ہندوستانی کے ساتھ بنگالی اور اڑیا دو زبانیں بھی شریک

ہوگئیں ؎

"جب ملک کی متحدہ زبان کے رسم خط کو اردو ہندی کے دو حصوں میں بانٹ کر ملکی اتحاد کی رگ کے آخری قطرہ خون کو بھی بہا دیا۔ ۱۸۶۵ء میں بہار اور بنگال کی گورنمنٹ نے ہندی کو دفتروں کا خط قرار دیا۔ اس اثنا میں بہار بنگال کی ہمسائگی کے اثر سے انگریزی تعلیم کو روز افزوں ترقی ہوتی گئی، تو اس زبان پر اس صوبہ میں مردنی چھاگئی۔ عدالتوں اور دفتروں کی ضرورت سے کون آزاد ہے۔ ہندی رسم الخط عوام میں ہندوستانی رسم الخط کی جگہ لینی شروع کی اور خواص دن بدن انگریزی تعلیم پڑھتے جا رہے تھے، دیسی زبان کی یہ کیفیت قریب قریب پچاس ساٹھ برس رہی۔ اس طویل عرصہ میں بزرگوں کی ادبی دولت برباد ہوگئی۔ اپنی زبان کی خدمت کا ولولہ جاتا رہا۔ صحیح زبان بولنے اور لکھنے پڑھنے کا ذوق مٹ گیا۔ انگریزی اسکولوں میں جو مدرس اور ماسٹر پڑھاتے تھے، ان میں بڑا حصہ بنگالیوں کا تھا۔ وہ جیسی ہندوستانی بولتے تھے، اس کے قریب قریب ان کے شاگرد بھی بولنے لگے۔ ؎

بہار کے لسانی مسائل سید ہاشمی فرید آبادی کی نظر میں

سید سلیمان ندوی مرحوم نے مختصر الفاظ میں بہار کے لسانی انتشار کو بخوبی بیان کیا ہے، اب یہی کہانی سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم کی زبان سے سنیے۔

"انگریزوں نے غدر سنہ ۱۸۵۷ء سے پہلے بنگال میں فارسی کے بجائے

؎ نقوش سلیمانی۔ مقالہ بہار کے نوجوان اور ادب کی خدمت صفحات ۳۲۲ - ۲۶۵

انگریزی کو سرکاری زبان بنایا۔ بہت سے بنگالیوں کو اپنے کام کے لئے سدھایا یہ سب ہندو تھے۔ مسلمانوں کو سرکاری ملازمت بلکہ عزت و خوش حالی کے اکثر مسائل سے ایسا محروم کیا کہ ہمارے زمانے تک بنگالی کے معنی ہی ہندو بنگالی سمجھے جاتے تھے۔ صوبے کی دیسی زبان بنگلہ قرار دی گئی۔ مگر اس میں سے اردو فارسی الفاظ خاص اہتمام سے خارج کئے اور اس کا رسم الخط سنسکرتی کر دیا سنسکرت کے الفاظ کثرت سے بھرے گئے جو مسلمانوں کی نظر میں بالکل ہندوانی زبان تھے اور ان کے لئے اس میں تعلیم دشوار ہو گئی۔ بہار کا صوبہ اس تجدید بلکہ تفریق فرنگ سے ابتک بچا رہا تھا۔ یہ کار خیر کیمبل نام کے گورنر بنگال نے انجام دیا۔

(جارج کیمبل کی فیصلہ کن تقریر سابقہ باب میں درج کی جا چکی ہے)

سنہ ۱۸۷۱ء میں اس کی مظفرپور والی تقریر برطانوی جہل و تعصب کا شاہکار مانی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد بہار میں کیتھی حروف اور ہندی بولی جبراً رائج کی گئی۔ انگریز کا داؤ چل گیا ہندو مسلمان میں تفرقہ کا بیج بو یا گیا۔

صوبۂ بہار میں زبان کی تبدیلی کے خلاف ملک میں بے چینی پھیل گئی اس بے چینی کی اطلاع حاکمان اعلیٰ تک پہنچنے لگی۔ تحقیقاتوں کا ڈھونگ رچایا گیا۔ گارسان دتاسی نے اپنے مقالوں میں ان کیفیات کو قلمبند کیا ہے۔

"ہندی کی رقابت کے مسئلہ پر علی گڑھ اخبار (۲۶ مارچ سنہ ۱۸۷۵ء) کے ایک نامہ نگار نے لکھا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ بنگال کے نئے حاکم اعلیٰ نے اسکولوں

لے نقوش سلیمانی۔ مقالہ بہار کے نوجوان اور اردو ادب کی خدمت۔ صفحات ۲۶۴-۲۶۵

لے مقالات گارسان دتاسی مترجمہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۴۳ء

کے انسپکٹروں سے پوچھا ہے کہ کیا یہ سچ ہے کہ بہار کے شرفا ہندی پر اُردو کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس تحقیقات سے حقیقت پر روشنی نہیں پڑ سکتی۔ کیونکہ بہار کے محکمۂ تعلیم کے سربراہ ہندو ہیں اور تعصب کی وجہ سے وہ یقیناً ہندی کی تائید کریں گے۔ بہار میں ہندی کا چرچا حال ہی میں سُنا جا رہا ہے کیونکہ وہاں کی سرکاری زبان ہمیشہ فارسی رہی جسے ہندو مسلمان سب ہی سمجھتے تھے۔

جب سے بہار میں محکمۂ تعلیم کی نئی تنظیم ہوئی ہے اسکولوں میں ہندی اور اردو کے استاد مقرر کر دیئے گئے ہیں حالانکہ طلبا کی بہت بڑی اکثریت اردو پڑھتی ہے اور ہندی کے رسیا ڈھونڈے نہیں ملتے۔ ہندوستانی اردو سے صرف محبت نہیں کرتے کہ یہ ان کی مادری زبان ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اسے جاننا گویا ترقی اور شرافت کی سند لینا ہے۔ اور یہ ایسی سند ہے جو ہندی سے نہیں مل سکتی۔ لہٰذا حکومت وقت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہر طرح اس زبان کی ہمت افزائی کی جائے۔ [ل]

"حکومت کا یہ فیصلہ کہ ہر ضلع کے باشندوں کو زبان کے انتخاب کی آزادی ہے۔ سراسر غلط ہے۔ یہ طریقہ تو مینار بابل تیار کرنے والوں کا ہے۔ اس طرح ہر ضلع اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے گا اور ہماری قوم کا شیرازہ بکھر جائے گا۔"

اردو زبان کی قدر و قیمت - یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اردو زبان پڑھے لکھوں

[ل] مقالات گارسان دتاسی صفحات ۱۲۵ - ۱۲۶ - ۳۵۹ -

کی زبان ہے۔ یہ ہمارے ملک کی زبان ہے۔ جس میں اتنی صلاحیت ہے کہ یہ ہر قسم کے خیالات کا اظہار کر سکے اور تعلیم عامہ کا واحد ذریعہ بن سکے۔ حکومت بہار چاہے تو اپنے مصنفوں سے ہی پوچھ دیکھے کہ وہ کس زبان کا استعمال کرتے ہیں تو کیا یہ ضروری ہے کہ کچھ ہٹ دھرموں کی خوشنودی کے لئے گنواروں کی بولی کو رواج دیا جائے۔ جانی پہچانی کتابوں کو طاق میں رکھ دیا جائے اور ہندی کی ورق گردانی شروع ہو۔ جسے پنڈتوں کے علاوہ اور کوئی نہیں سمجھتا۔

حکومت نے ارادہ کیا ہے کہ بہار کے دفتروں اور عدالتوں میں سرکاری کام ہندی زبان اور ناگری رسم الخط میں ہوا کرے۔ اس بوالعجبی کی وجہ ہماری سمجھ میں نہ آئی کیونکہ بہار کی رائے عامہ اس تبدیلی کے خلاف ہے۔ ایک تو یہ کہ صدیوں کے استعمال کی وجہ سے لوگ فارسی رسم الخط کے عادی ہو چکے ہیں۔ دوسرے عدالتی یا تجارتی امور میں اردو کا چلن بہت عرصہ سے ہے ان اسباب کی بنا پر یہ تبدیلی نامناسب معلوم ہوتی ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ بہت سے باثر مسلمان اور ہندوؤں نے اس تبدیلی کے خلاف حکومت کو لکھا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ انگریزی کا سوال نہ ہو تو اور کسی قسم کی لسانی تبدیلی مصلحت کے خلاف ہے۔ مسٹر ایڈن (بنگال کے لفٹنٹ گورنر) حال ہی میں بہار کا دورہ کرکے لوٹے ہیں۔ وہ ازراہ انصاف کہدیں کہ عوام کی زبان کون سی ہے [۵۲]

---

[۵۲] مقالات گارساں دتاسی صفحات ۱۲۵ - ۱۲۶ - ۲۵۹

سنہ ۱۸۷۶ء میں صوبۂ بہار میں اُردو کی کیفیت

ہندی کے کامیاب حملہ کے بعد صوبۂ بہار میں اُردو کی پوزیشن بے حد خراب ہو گئی۔ اس کا نقشہ گارساں دتاسی نے حسب ذیل الفاظ میں کھینچا ہے :۔

"میں نے پچھلے مقالے میں بیان کیا تھا کہ بہار کی عدالتوں اور دفتروں پر ہندی کے حملہ کو اُردو نے رد کرنے کی پوری کوشش کی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پانسہ پلٹ گیا اور بازی ہندی کے ہاتھ رہی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سر کیمبل کے اشارہ پر حکومت بنگال نے ہائی کورٹ کو ہدایت کی ہے کہ عدالتوں میں ہندی کی سرپرستی کرنی چاہیے۔ کورٹ نے اس ہدایت پر عمل بھی شروع کر دیا ہے۔" [لے]

سر کیمبل کی تقریر

ہم بنگال کے باب میں سر کیمبل کی تقریر کا اقتباس پیش کر چکے ہیں۔ بہار کے بارے میں اقتباس حسب ذیل ہے :۔

"فارسی زبان جو ہندوستان کے سابق حکمرانوں کی زبان تھی، سرکاری زبان کی حیثیت سے میرے (لفٹنٹ گورنر بنگال) ہندوستان آنے سے قبل ترک کر دی گئی تھی۔ میرے عہد کے ابتدائی ایام میں اس بات کی پوری طور پر کوشش کی گئی کہ سرکاری قوانین میں اس غیر صحیح النسب و دوغلی زبان کے الفاظ استعمال نہ ہوں جو فارسی انشا پردازوں کو بہت عزیز تھے، میرا خیال تھا کہ یہ زبان بالکل متروک ہو چکی ہے اور ہمیں ایسا کرنے میں کچھ

لے مقالات گارساں دتاسی بابت سنہ ۱۸۷۲ء صفحہ ۱۸۰ - ۱۸۱

کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن پچھلے دنوں جب مجھے بہار جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ نہ صرف یہ دوغلی زبان پوری قوت سے پھل پھول رہی ہے۔ بلکہ مدرسوں میں بھی اس کی تعلیم کا انتظام کر کے اسے زندہ جاوید بنایا جا رہا ہے بہار میں جو زبان سنی وہ نہایت خراب اور مصنوعی تھی۔ ایسی مصنوعی زبان میں نے نہ پہلے کبھی سنی تھی اور نہ گمان کیا تھا۔ کہ اس کا وجود ممکن ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس شیطانی زبان کو اگر اسے زبان کہا جا سکتا ہو) ہمارے ان مدارس میں جن کو دیسی زبان (ورناکیولر) کے مدارس کہا جاتا ہے۔ مولوی لوگ مروجہ زبان کے بجائے ہمارے مدارس میں سکھلاتے ہیں بدقسمتی سے اس زبان کے لئے "اردو" کا لفظ تراشا ہے۔ جو نہایت غیر موزون ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ لفظ بنگال کے محکمۂ تعلیمات نے رائج کیا ہے۔ یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی میرے خیال میں متعین نہیں کئے جا سکتے۔ کتابوں میں چاہے اس زبان کے متعلق کوئی کچھ لکھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان دہلی کے دربار اور درباروں کے لشکر کی زبان ہے نہ کہ ملک کی مروجہ زبان۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس زبان کی تعلیم کو جو ہمارے مدرسوں میں دی جاتی ہے پوری طرح بند کرا دوں گا۔"

انجام۔ مسلمانان بہار نے گورنمنٹ کے مندرجہ بالا فیصلہ کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ سرسید احمد خاں رحمۃ اللہ علیہ نے اس تبدیلی کے خلاف اپنے اخبار میں زبردست مقالات لکھے۔ لیکن ایک پیش نہ گئی۔ صوبۂ بہار تقریباً پچاس سال تک اس لسانی ناانصافی کا شکار رہا۔ بنگال کی شورش

(۱۹۱۱ ـ ۱۹۰۶) کے نتیجہ میں بہار کو بنگال کے اثرات سے نجات ملی اس علیحدگی کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ آہستہ آہستہ بنگال کا اثر کم ہونے لگا۔ سر علی امام مرحوم و مغفور کا اس صوبہ کے مسلمانوں پر خصوصی احسان ہے کہ صوبہ داخلی امور میں خود مختار بن سکا۔ آخر میں بہار اور اڑیسہ بھی علیحدہ کر دیئے گئے اور صوبے کی زبان ہندوستانی رہ گئی

بہار بھارتی حکومت کے دور میں

بھارتی حکومت نے جملہ صوبوں کی طرح بہار کی زبان بھی ہندی قرار دے دی جس کے خلاف مسلمانوں کا غم و غصہ ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن ع

کون سنتا ہے فغانِ درویش

بھارت کے صوبۂ بہار میں سابقہ الیکشن سنہ ۱۹۶۷ء لسانی بنیادوں پر لڑا گیا۔ مسلمانوں کی اکثریت اور کچھ منصف مزاج غیر مسلموں نے اردو کے حق میں ووٹ دیئے۔ اور اردو کے حامی گروپ کو حکومت بنانے کا موقع مل گیا۔ اس کے علاوہ بھی کئی صوبوں میں حکومتیں بدل گئیں لیکن الیکشن کے وعدوں کا ایفا نہیں کیا گیا۔ اور بہار کے مقام رانچی رود ڈکیلا میں لسانی بنیادوں پر فساد کر کے مسلمانوں کا جس بے دردی کے ساتھ خون بہایا گیا اس کی مثال تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکے گی۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کا خون کبھی رائیگاں نہیں گیا۔ انشاء اللہ حالات ضرور سازگار ہوں گے۔

باب ۔ ۸

صوبہ یو ۔ پی

یو۔ پی کے اضلاع اپنی مردم خیزی کے اعتبار سے برِ صغیر پاک و ہند میں ایک امتیازی حیثیت کے مالک رہے ہیں. قیام پاکستان سے قبل مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی اکثر تحریکوں کا مرکز بھی یہی صوبہ رہا ہے. سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے اکثر ہیرو جنرل بخت خاں روہیلہ، نواب خان بہادر خاں شہید، مولوی احمد اللہ شہید، بیگم حضرت محل، مولوی لیاقت علی شہید، جنرل محمود خاں وغیرہم اسی علاقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جب جنگ آزادی کی تحریک ناکام ہوئی تو انگریزی عتاب بھی بڑے خوفناک انداز سے اسی صوبے پر نازل ہوا۔ غربت، افلاس اور جہالت گویا یہاں کے مسلمانوں کا مقدر بن چکی تھی۔ لیکن قدرت کی یہ عجیب و غریب کرم فرمائی رہی کہ ان تمام موانع کے باوجود عامۃ المسلمین کے تیور ایسے رہے گویا انھوں نے شکست تسلیم کرنا سیکھا ہی نہیں ہے۔

انگریز بنگال اور بہار میں مسلمانوں کی اجتماعی قوت، برادران وطن کے سرگرم تعاون کی وجہ سے پوری طرح توڑنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس کامیاب تجربے کے بعد بدلی ہوئی شکل میں ایسی ہی سازشیں یو۔پی میں بھی شروع کی گئیں۔ جیسا کہ گزشتہ باب میں عرض کیا جا چکا ہے کہ مسلمانوں میں ان سازشوں

کے خلاف جو پہلی شخصیت ابھری وہ سرسید علیہ الرحمۃ کی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ سرسید رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کے قومی مفاد کی حفاظت کا پورا حق ادا کر دیا۔ لیکن خود ان کو اس لسانی قضیئے کا بانی مبانی قرار دینا سراسر بہتان ہے۔ اصل میں فرقہ پرست ہندو سرسید رحمۃ اللہ علیہ کی اس معصومانہ درخواست پر مشتعل ہوئے کہ جو انھوں نے "علوم مشرقی" کی یونیورسٹی قائم کرنے کے سلسلے میں گورنمنٹ کی خدمت میں پیش کی تھی۔ ہندوؤں کو اس یونیورسٹی کے قیام میں بھی مسلمانوں کا غلبہ نظر آنے لگا۔

سرسید کی عرضداشت

سرسید نے جو عرضداشت گورنمنٹ کی خدمت میں پیش کی تھی اس کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:۔

"ہم نہایت ادب کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ ان لفظوں سے کہ تعلیم دیسی زبانوں کے ذریعہ ہونا چاہیے، ہماری یہ مراد نہیں کہ ایشیا کے علوم و فنون پھر تازہ کئے جائیں اور ان کی تعلیم ہو۔ بلکہ ہم صرف اس بات کے خواستگار ہیں کہ جو علوم و فنون بالفعل یورپ میں مروج ہیں انھیں کو شائع کیا جائے۔ کیونکہ بجز اس کے ہماری اور کوئی غرض نہیں ہے کہ اہل یورپ کی طرح روشن ضمیری تمام ہندوستان میں عموماً پھیل جائے"

"دو کالج اب ایسے موجود ہیں کہ جن کی سند ہم اپنی تجویز کے مفید ہونے کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ ایک ٹامسن انجینیرنگ کالج رورکی کی شاخ اور دوسری میڈیکل کالج آگرہ کی شاخ اردو در

روڑکی کالج کے انگریزی اردو فریقوں میں سے ہر ایک کو ایک ہی قسم اور ایک ہی درجہ کے علم سکھائے جاتے ہیں۔ یعنی جن کتابوں کی تحصیل اردو فریق کے طالب علم کرتے ہیں وہ کتابیں بالکل ان کتابوں کا ترجمہ ہوتی ہیں جو انگریزی طالب علموں کے استعمال میں ہوتی ہیں۔ امتحان کے سوالات دونوں فریق کے یکساں ہوتے ہیں۔ ایک بند سوالوں کا انگریزی میں دوسرا اردو میں دیتے ہیں۔ جو انگریزی کا ٹھیک ترجمہ ہوتا ہے۔ امتحان کے نتیجے بھی ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں کبھی اردو فریق والے کا طالب علم اپنے انگریزی فریق ہمسر سے بہتر نمبر حاصل کرتا ہے، اور کبھی انگریزی طالب علم اپنے ہمسر اردو کے طالب علم سے سبقت لے جاتا ہے۔ دونوں فریق کے طالب علم کو مساوی فائدے حاصل ہوتے ہیں صرف ذریعہ مختلف ہوتا ہے جس سے وہ علم کی تحصیل کرتے ہیں۔ علاوہ اس کے میڈیکل کالج آگرہ میں یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ اردو کے طالب علم اپنے انگریزی ہمسر طالب علموں سے ان مضمونوں کے بخوبی تحصیل کرنے میں پیچھے رہ جاتے ہوں جو دونوں کو ایک ہی معین حد تک یکساں طریق پر سکھائے جاتے ہیں۔

پس اگر دیسی زبان کو تعلیم کا ذریعہ بنایا جائے تو اس درجہ کا علم جس کا حکم اب صرف چند ایم اے کے سند یافتہ طالب علموں کی

رسائی ہوتی ہے۔ بے انتہا لوگوں کو حاصل ہونے لگے گا
اب جو سررشتۂ تعلیم غیر ملکی زبان کے ذریعہ سے جاری ہے
اس کی بدولت طالب علموں کو ایک مرتبہ حاصل کرنا ہے
اس کو وہ یونیورسٹی کے چھوڑنے اور زندگی کے معمولی کام
کاج میں مصروف ہونے کے بعد جلد بھول جاتا ہے اور جلد
اس کے ذہن سے وہ علم اتر جاتا ہے۔ مگر جو طریقہ ہم نے تجویز
کیا ہے اس کے ذریعہ سے جو علم ایک مرتبہ حاصل ہو جائے
گا صرف وہی باقی اور برقرار نہیں رہے گا۔ بلکہ علم کے تحصیل
کا ذریعہ اس معمولی زبان کے ہونے سے جس میں ہر وقت
اس کے خیالات ظاہر اور پیدا ہوتے ہیں وہ علم کی استعداد
اور قابلیت کی مناسبت سے ہمیشہ ترقی اور شگفتگی پاتا رہے گا۔"[1]

گورنمنٹ کا جواب

سرسید رحمۃ اللہ علیہ کی مندرجۂ بالا مدلل درخواست کے خلاف فرقہ پرست ہندوؤں نے ایجی ٹیشن برپا کر دیا۔ دوسری طرف انگریز مسلمانوں کے خلاف خبثِ باطنی رکھتے ہی تھے لہذا سرسید کی کوششیں قطعی ناکام رہیں۔ چنانچہ گورنمنٹ کی طرف سے جو جواب دیا گیا اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

(۱) دیسی زبانوں میں ابھی اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے کافی سامان

۱؎ مقالاتِ سرسید۔ جلد ہشتم مرتبہ مولوی محمد اسماعیل پانی پتی ص ۶۱-۶۲۔ انجمن ترقی ادب لاہور

اور لوازم موجود نہیں ہیں۔

(۲) صرف ان کتابوں کا ترجمہ جو یونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں داخل ہیں،" اس قدر کافی نہ ہوگا کہ جس کی بنا پر اس تجویز کو عمل میں لانے کی ہمت ہو سکے۔ کیونکہ یونیورسٹی کی تعلیم کا مقصد صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ بعض خاص خاص کتب سے واقفیت ہو جائے۔ بلکہ یہ مقصد ہے کہ یورپ کے علوم و فنون کے فراخ دائرہ علم کی تحصیل کے لئے طبیعت کو مستعد کیا جائے اور کچھ عرصے تک غالباً ہندوستان کے باشندے انگریزی کے ذریعے اس بات کو حاصل کر سکتے ہیں۔

(۳) اس صورت کے پسندیدہ ہونے کے باوجود گورنمنٹ کے لئے یہ غیر ممکن ہے کہ ایسے گنجان آباد ملک کو جیسا کہ ہندوستان ہے کامل تعلیم دینے کا کل خرچ اپنے ذمے لے؛

دیسی علوم کی اس ناقدری کا قدرتی اثر عام مسلمانوں پر بہت سخت پڑا۔ سر سید کی دور بین نگاہ قوم پر آنے والی مصیبتوں اور مشکلات کو بخوبی دیکھ رہی تھی۔ چنانچہ سر سید احمد خاں نے اس کیفیت کو بہت خوب صورتی سے بیان کیا ہے:

زمانے میں کچھ خفیف تبدل نہیں آیا بلکہ ایسا تبدل آیا ہے جو آنکھ سے دکھائی دیتا ہے۔ تربیت یافتہ لوگوں نے ہی نہیں بلکہ عام لوگوں نے بھی اس کو بخوبی دیکھا ہے۔ ہم مثلاً اپنے ملک کی بڑی عدالت کا ذکر کرتے ہیں جب کہ صدر عدالت

ہائی کورٹ نہیں ہوتی تھی۔ مشرقی علوم اور مشرقی زبان کے نہایت ذی علم ولائق شخص وکالت کرتے تھے۔ اور ایسے کامیاب تھے کہ زمانہ ان پر رشک کرتا تھا۔

دفعتاً سنہ ۱۸۶۶ء میں صدر عدالت ہائی کورٹ ہوگئی اور یورپین علوم اور یورپین زبان نے اپنا راج کیا۔ وہ بار آور درخت علوم مشرقی اور مشرقی زبان کے جن کی پتنگ آسمان تک پہنچی تھی اس طرح زمین پر کمھلا کر گر پڑے جیسے کوئی نیا نازک پودا پالے کے صدمے سے جھلس جائے۔ اب ہائی کورٹ میں جاکر علما وعلوم مشرقی کا حال دیکھو کہ ان پر مکھیاں بھنکتی ہیں۔ نہ وہ اپنی ذات کا کچھ فائدہ کرسکتے ہیں اور نہ ملک و قوم کا۔

تمام عہدوں سے مشرقی علوم ومشرقی زبان خارج ہوگئی ہے۔ دیوانی عہدوں میں جن کی بنیاد وکالت کے امتحان پر ہے مشرقی علوم ومشرقی زبان کی پرستش نہیں رہی۔ ہم نے سنا ہے کہ ہائی کورٹ کی وکالت کے امیدواروں کی فہرست میں ایک بھی مسلمان نہیں ہے۔

زمانے نے سرکاری ملازمت ہی کی حالت کو نہیں بدلا ہے۔ بلکہ تمام حالات مبدل ہوگئے ہیں جس طرح علوم مشرقی اور زبان مشرقی عہدہ جات سرکاری میں بے کار ہوگئی ہے۔ اسی طرح تجارت اور صنعت وحرفت میں سب کار ہے ہم روزمرہ کے کاموں میں بھی انگریزی کے محتاج ہیں۔ ادنیٰ درجہ کے لوگوں کو ادنیٰ درجہ کی انگریزی۔ اعلیٰ درجہ کے لوگوں کو اعلیٰ درجہ کی انگریزی کی محتاجی ہے۔

اردو کے خلاف برادران وطن کا محاذ | گورنمنٹ کی معاندانہ پالیسی کی شہ پر

برادرانِ وطن نے بھی اردو کے خلاف محاذ کھول دیا۔[1]

گارسان دتاسی اپنے سنہ ۱۸۷۲ء کے مقالہ میں لکھتا ہے :۔

"اردو اور ہندی کے متعلق لسانی مباحث کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ ہندوستان کے ایک اخبار میں پڑھنے میں آیا ہے کہ صوبہائے شمالی و مغربی کے دو لاکھ رجعت پسند ہندوؤں کے دستخط سے کلکتہ کی مرکزی حکومت کے روبرو ایک معروضہ پیش کیا گیا ہے جس میں یہ درخواست کی گئی ہے کہ تمام سرکاری کارروائیاں بجائے عربی رسم الخط کے جس میں اردو لکھی جاتی ہے دیوناگری رسم الخط میں ہونی چاہئے، جس میں سنسکرت لکھی جاتی ہے۔[2]

میرا خیال ہے کہ دستخطوں کی تعداد کے بیان میں کچھ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا معروضہ سے وہ یادداشت مراد ہے جو بنارس کے بابو شیو پرشاد نے حکومت کو بھیجی تھی اور جس پر دو لاکھ نہیں بلکہ محض پانچ ہزار اشخاص کے دستخط تھے۔

ہندوؤں کی اردو سے نفرت اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ محکمۂ تعلیمات بھی پورے طور پر متاثر ہو چکا تھا سنہ ۱۸۷۰ء میں لکھنؤ کے ایک امتحان کے سوالات قابل غور ہیں۔

(۱) واضح کرو کہ صوبہ اودھ کی عدالتوں میں اردو اور اس کے فارسی رسم الخط

---

[1] مقالات سرسید جلد ہشتم۔ مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی صفحہ ۷۸۔۷۶

[2] صفحہ ۲۰۔۲۱۔ مقالات گارسان دتاسی ترجمہ ڈاکٹر یوسف حسن خاں انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی

کا استعمال مفید اور قرین انصاف ہوگا یا ہندی اور اس کے ناگری خط کا۔

(۲) اردو اور ہندی کی خوبیاں اور نقائص تفصیل سے بیان کرو اسی طرح فارسی اور دیوناگری رسم الخط کی خوبیاں اور نقائص بیان کرو۔ عوام الناس کے لئے ان ہر دو زبانوں میں سے کس زبان کے استعمال سے زیادہ سہولت یا زحمت ہے؟

(۳) اردو سے کیا مراد ہے؟ بتاؤ کہ ان دونوں میں فرق کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

(۴) اردو اور ہندی سے کون سی زبانیں مراد ہیں۔ ؟ تم کن تصانیف کو اردو کی اور کن کو ہندی کی کہوگے؟۔"

مندرجہ بالا لغو سوالات سے ذہنی پستی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سنہ ۱۸۷۵ء میں صوبہ متحدہ کے گورنر سر جان اسٹریچی جن کے نام پر علی گڑھ کا مشہور اسٹریچی ہال آج بھی موجود ہے، نے اس مسئلہ کی تحقیق کی کہ اگر عدالتوں کی زبان اردو سے بدل کر ہندی کر دیں تو یہ کس حد تک مناسب ہوگا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ نچلے طبقے کے لوگ تھوڑا بہت ہندی سے لگاؤ رکھتے ہیں لیکن جن لوگوں کا ذرا بھی علم سے تعلق تھا وہ اردو کے واقف کار نکلے۔

سنہ ۱۸۸۶ء میں صوبۂ متحدہ کے ہندوؤں نے ہنٹر ایجوکیشن کمیشن کے سامنے ہندی کے مسئلہ کو پیش کیا۔ مگر کمیشن نے کچھ توجہ نہیں کی۔ کیونکہ سر سید احمد خاں نے ثابت کیا کہ کمیشن کے دائرۂ اختیار میں سرے سے یہ مسئلہ نہیں ہے غرض سنہ ۶۷-۱۸۶۶ء میں اردو کے خلاف حامیانِ ہندی نے جس مناقشہ کی بنیاد رکھی وہ سر سید رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے وقتی طور پر دب گیا۔ لیکن سنہ ۱۸۹۸ء

میں جب سر سید کا انتقال ہو گیا اور صوبہ میں ایک متعصب انگریز گورنر مقرر ہوا تو ان لوگوں کو موقع مل گیا۔ چنانچہ ان کا ایک وفد لفٹننٹ گورنر سر انٹونی میکڈانلڈ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وفد نے جو معروضات پیش کیے ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(۱) جن وجوہ کی بنا پر بہار اور ممالک متوسطہ (سی پی) میں ناگری حروف عدالتوں میں جاری کیے گئے ہیں وہی دلائل اضلاع شمال و مغرب و اودھ کے لیے بھی قابل تسلیم اور قابل عمل ہیں۔

(۲) اضلاع شمالی و مغربی اور اودھ کی عدالتوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنی کارروائی اور بحث صاف اور عام فہم اردو میں قلم بند کریں۔ حالانکہ عدالتوں کی کارروائیوں میں ایسے الفاظ اور فقرے استعمال کیے جاتے ہیں کہ جن لوگوں کو عدالتوں سے سابقہ پڑتا ہے وہ ان کو پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ناگری حروف عدالتوں میں جاری کر دیے جائیں جس سے آخر کار عدالتوں کی زبان سے عربی اور فارسی کے وہ تمام الفاظ نکل جائیں گے جن کے سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے اور جو لوگوں کی بول چال میں یکجان نہیں ہوئے۔

(۳) ان صوبجات کے باشندوں کی بھاری تعداد فارسی حروف میں لکھے ہوئے استغاثوں، درخواستوں اور دستاویزوں کو پڑھ نہیں سکتی اور جب عدالتوں کے سمن ان حروف میں جاری ہوتے ہیں تو بہت سے لوگوں کو جن کے نام وہ سمن جاری کیے گئے ہیں ان کے پڑھنے میں دقت ہوتی ہے،

(۴) ہندی کے حامیوں نے پروفیسر بایپر ولیمز کا قول نقل کیا ہے کہ فارسی حروف مثل گورکھ دھندے کے ہیں۔ ان کا پڑھنا ہی مشکل ہے۔ پھر بیان کیا کہ شکستہ خط اور انفاظ کے صحیح پڑھے جانے کی نسبت عدالتوں میں تنازعے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

(۵) ناگری حروف کی نسبت بعض دفعہ جو اعتراض کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ حروف شکستہ کے برابر جلد نہیں لکھے جاتے۔ اس کے بارے میں درخواست میں کہا گیا کہ اگر یہ بات فرض بھی کر لی جائے، پھر بھی جو وقت خط شکستہ کے لکھنے سے بچتا ہے، اس کے پڑھنے کی حالت میں پورا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ تھوڑے سے وقت کے نقصان کی جو ناگری لکھنے میں صرف ہوگا، بعد میں اس کو بآسانی اور یقینی طور پر پڑھے سے تلافی ہو جاتی ہے۔

(۶) ہندی کے ایڈریس پیش کرنے والوں نے ابتدائی تعلیم کے مسئلہ کو بھی چھیڑا۔ انھوں نے ہندوستان کے مختلف صوبجات میں مقابلہ کر کے بتایا کہ سنہ ۱۸۷۰ - ۱۸۷۱ء سے سنہ ۹۶ - ۱۸۹۵ء تک پرائمری اسکولوں میں تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد میں کس قدر ترقی ہوئی۔ پھر دکھایا کہ صوبۂ بہار میں سنہ ۱۸۸۱ء سے اور صوبۂ ممالک متوسط میں سنہ ۱۸۷۶ء سے جبکہ ان ملکوں کی عدالتوں میں ناگری حروف جاری ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم میں بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اضلاع شمال و مغرب و اودھ

(یو۔ پی) اور صوبہ پنجاب میں جہاں سرکاری عدالتوں اور اسکولوں میں اردو زبان اور اردو خط کا رواج تھا۔ اس باعث سے ابتدائی تعلیم میں کم ترقی ہوئی کیونکہ ان صوبوں میں دیسی زبان اور دیسی خط کا رواج نہیں تھا۔"

سنہ ۱۸۹۸ء کے مندرجہ بالا میمورنڈم کا مسلمانوں پر بڑا سخت ردِ عمل ہوا۔ اور وہ برادران وطن کی اس ناروا کارروائی پر تلملا اٹھے بحث ناسازگار حالات کے باوصف مسلمانوں کے اہل الرائے اصحاب نے زبان اور قلم سے مقابلہ شروع کر دیا۔ ہم نے میمورنڈم کا خلاصہ جناب رشید احمد سالم کے ایک مقالے بعنوان "اردو ناگری بحث اضلاع شمال و مغرب و اودھ" میں سے اخذ کیا ہے۔ جو رسالہ "معارف" علی گڑھ بابت اپریل سنہ ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس رسالہ کے مدیر مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی تھے۔

اعتراض

فاضل مقالہ نگار نے میمورنڈم میں اٹھائے گئے اعتراضات کا بہت ہی جامع اور مسکت جواب بھی ارقام فرمایا تھا۔ ان جوابات کا خلاصہ درج ذیل ہے :-

"جن دلائل سے بہار اور ممالک متوسط میں ناگری حروف عدالتوں میں جاری کئے گئے ہیں وہی دلائل اضلاع شمال و مغرب و اودھ کے لئے بھی قابل تسلیم اور قابل تعمیل ہیں ۔۔۔۔ مگر یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ خود سر آنز (مشہور اردو دشمن لفٹنٹ گورنر یوپی سر انٹونی میکڈانلڈ) نے اس کے جواب میں فرمایا کہ بہار میں اردو حروف کی جگہ کیتھی حروف کے جاری کرنے

میں قریباً ایک پشت کا عرصہ خرچ ہوا ہے۔ اور میں اپنے ذاتی تجربے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ وقت ہر ایک شخص کے واسطے نہایت تکلیف دہ تھا۔ جب ملک کے اس حصہ میں جہاں مغلوں کے دستور کا بہت کم اثر ہوا اور جہاں سرکاری ملازمت میں مسلمانوں کی تعداد بمقابلہ ہندوؤں کے بہت کم تھی۔ ایسی سخت تکلیفوں اور مصیبتوں کا سامنا ہوا تو آپ فوراً سمجھ سکتے ہیں کہ صوبجات متحدہ میں آپ کی تجویز کو نافذ کرنے میں کیسی دقت اور مصیبت پیش آئے گی۔

"بموجب اصول علم اللسان کے دو زبانوں کے درمیان اگر گرامر کا بیّن اختلاف ہے تو ان میں سے ہر زبان مستقل سمجھی جائے گی۔ اور اگر ایسا اختلاف نہیں ہے تو ان دونوں زبانوں کو ایک ہی زبان کی دو شاخیں تصور کریں گے۔ انگلستان کی نسبت کون انکار کر سکتا ہے کہ وہاں اس سرے سے اس سرے تک انگریزی زبان مستعمل ہے۔ حالانکہ اس ملک کے ہر ضلع میں ایک دوسرے سے مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں مگر ان کو انگریزی زبان سے علیحدہ کوئی زبان تصور نہیں کیا گیا۔ بلکہ وہ انگریزی ہی کی شاخیں قرار دیدی گئی ہیں۔ انگریزی میں عام زبان کو لینگویج اور اس کی شاخوں کو جن میں گرامر کا بیّن اختلاف نہیں پایا جاتا ڈائی لیکٹ (بولی) کہتے ہیں۔ پس صوبہ متحدہ کی لینگویج یعنی عام زبان اردو ہے اور وہ زبانیں جن کو ڈاکٹر گریرسن ہندی یا ہندی جیسی کوئی زبان خیال کرتے ہیں۔ اردو زبان کی ڈائی لیکٹ یعنی مختلف بولیاں ہیں۔ شہروں میں پڑھے لکھوں کی زبان جس میں عربی اور فارسی الفاظ کی زیادہ آمیزش ہے بشستہ

اور نفیس مہذب اور خالص اردو سمجھی جاتی ہے۔ جب کہ دیہات اور قصبات کے جاہلوں کی زبان غیر شستہ بے محاورہ اور غیر خالص اردو خیال کی جاتی ہے۔ ان دونوں قسم کی زبانوں میں باعتبار بناوٹ اور صرف ونحو کے کوئی بیّن فرق نہیں ہے۔ اور اسی لئے وہ علیحدہ اور مستقل زبانیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی زبان کی دو شاخیں ہیں جن میں سے ایک اعلیٰ ہے اور ایک ادنیٰ جب یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ صوبجات متحدہ کی عام زبان اردو ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ممالک متوسط (سی۔ پی) اور بہار کی نسبت جو دلائل پیش کئے جائیں وہ ان صوبجات کی حالت پر بھی صادق آئیں۔

اعتراض ۱۲ فارسی کے ثقیل الفاظ کی دلیل

۰ ہمارے نزدیک ناگری حروف کو عدالتوں کی کارروائی کے لئے پسند کرنے کی وجہ بھی کافی نہیں ہے۔ کیونکہ عدالتوں کی کارروائیاں جس زبان میں لکھی جاتی ہیں وہ قانونی زبان ہے۔ قانونی زبان عام بول چال سے ہمیشہ علیحدہ سمجھی جاتی ہے۔ اور اس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس کو سمجھنا چاہیں اور جن کو اس کے سمجھنے کی ضرورت پیش آئے۔ کسی ملک کے عام آدمی قانونی یا سیاسی یا علمی زبان کو عام طور پر نہ بول چال میں استعمال کرتے ہیں نہ اس کو سمجھ سکتے ہیں جس طرح ہر انگریز انگریزی زبان کے قانونی اصطلاحات سے واقف ہونے کا مدعی نہیں ہو سکتا اسی طرح صوبجات متحدہ کا ہر باشندہ اردو کی قانونی کارروائیوں اور قانونی الفاظ سے آگاہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ امر بھی مسلّم ہے کہ علمی یا قانونی الفاظ اگر عام بول چال سے اخذ کئے جائیں تو ان کے نہ ہی معنی عام طور پر سمجھے جائیں گے جو بول چال میں سمجھے جاتے ہیں۔ نہ کہ وہ معنی جو علماء یا واضعان قانون قرار دیتے ہیں۔ اسی بنا پر یورپ کے

علما اور واضعان قوانین نے علمی اور قانونی الفاظ کا ان زبانوں سے لینا اختیار کیا ہے جو مردہ ہو چکی ہیں۔ اور جن کے الفاظ کے اصلی معنی لوگوں کے ذہنوں اور زبانوں میں گردش نہیں کرتے۔ اردو زبان میں بھی عربی اور فارسی زبانوں سے قانونی اور علمی الفاظ لیے گئے ہیں۔ اور یہ زبانیں ہندوستان کے کسی صوبے میں بولی نہیں جاتیں۔ اور اس لیے اردو زبان کی تمام قانونی اور علمی الفاظ سے وہی مراد لی جاتی ہے جو علمار اور واضعان قانون نے مراد لی ہے۔ پس ہر شخص جو عدالتوں کی کارروائیوں اور ان کے الفاظ کو سمجھنا چاہے سمجھ سکتا ہے اور ٹھیک وہی سمجھ سکتا ہے جو عدالتوں اور واضعان قانون نے قرار دیے ہیں۔ اگر عدالتوں کی زبان وہی زبان ہو جو جاہلوں یا پڑھے لکھوں کی عام بول چال ہے تو قانونی کارروائیوں کے سمجھنے میں نہایت پیچیدگی اور دقت پیش آئے گی۔ اردو زبان میں تمام قوانین مروجہ ہندوستان کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ (واضح رہے کہ یہ سنہ ۱۸۹۹ء کی بات تھی۔) اور قانونی اصطلاحیں مقرر ہو چکی ہیں۔ پرانی ہندی بھاشا جس کے زندہ کرنے کا خیال چند صاحبوں کو منظور ہے نہ اتنی وسیع ہے نہ اتنی نازک اور بلیغ کہ قانون کی باریکیوں اور عدالتوں کی موشگافیوں کو کما حقہ ادا کر سکے۔ اور اگر سنسکرت کی مدد سے اس کا دائرہ وسیع کیا جائے تو جدید اصطلاحوں کے قائم کرنے سے عدالتوں اور ان لوگوں کو جن کو عدالتوں سے سابقہ پڑتا ہے عام اس سے کہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان نہایت تکلیف اور مصیبت کا سامنا کرنا ہوگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ناگری حروف کے جاری کرنے میں بھی وہی عربی اور فارسی کی قانونی اصطلاحات قایم رکھی جائیں گی جو اس وقت تک قائم ہو چکی ہیں مگر عام زبان جس میں مقدمات کی مسلیں مرتب

کی جاتی ہیں اب کی نسبت زیادہ سہل اور زیادہ عام فہم ہو جائیں گی تو یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ عربی اور فارسی الفاظ کو کثرت سے استعمال کرنے والے زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو تعلیم یافتہ اور مہذب ہیں۔ وہ اس حالت میں بھی ایسے الفاظ اور فقرے استعمال کریں گے جو ان کی لیاقت اور علمی قابلیت کو بتائیں گے۔

اگر عربی اور فارسی کے قانونی الفاظ ناگری حروف میں لکھے جائیں گے تو ان حروف کے لئے جو سیمٹک زبانوں سے مخصوص ہیں. مثلاً ث۔ ذ۔ ص۔ ض۔ ط ظ۔ ع۔ غ۔ ق۔ نئے حروف ناگری ایجاد کرنے پڑیں گے۔ حالانکہ ناگری کی نسبت دعوی کیا گیا ہے کہ وہ ان تمام آوازوں کو ادا کرتی ہے جو انسان کے گلے سے نکلنی ممکن ہیں اور اس کو اپنی مکمل حالت پر کیوں نہ قائم رکھا جائے جس سے آرین اور سیمٹک زبانوں کی آوازیں برابر ادا ہو سکتی ہیں۔

دلیل نمبر ۷ فارسی دستاویزات کا ناقابل فہم قرار دینا

ہمارے نزدیک ناگری حروف کی تائید اس واقعہ سے بھی نہیں ہوتی۔ کیونکہ استغاثوں، درخواستوں دستاویزوں اور سمنوں کے پڑھنے کے لئے پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے خواہ یہ کاغذات فارسی حروف میں ہوں یا ناگری حروف میں۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ اگر یہ کاغذات ناگری حروف میں لکھے ہوئے ہوں تو ان کو وہ اشخاص بھی پڑھ سکیں گے جو ناگری حروف میں لکھنا پڑھنا نہیں جانتے پس اس دقت کا علاج یہ نہیں ہے کہ ناگری حروف جاری کئے جائیں۔ بلکہ اصل علاج یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں قومیں مل کر تعلیم کو وسعت کے ساتھ جاری کرنے کی کوشش کریں۔

دلیل نمبر ۵ فارسی حروف کا مثل گورکھ دھندے کے ہونا اور ان کا غلط اثر فیصلوں پر پڑنا

اس میں کوئی شک نہیں کہ پروفیسر مانیر ولیمز آرین زبانوں کے بہت بڑے عالم ہیں مگر ان کا یہ قول فارسی حروف کی نسبت قابل سند نہیں ہو سکتا۔

پروفیسر گارساں دتاسی کا بیان :۔

"اردو میں دو قسم کا خط ہوتا ہے۔ ایک خوش خط دوسرا شکستہ مگر ہندی میں علاوہ ان خطوں کے جو ایک ہی قسم کی زبانوں سے مخصوص ہوتے ہیں اور جن کو سنسکرت کے بڑے عالم دیر تک غور کئے بغیر نہیں پڑھ سکتے کئی قسم کے خط ہوتے ہیں۔ خود ہندؤں کو اپنی خاص تحریر کے پڑھنے میں ایسی ہی دقت معلوم ہوتی ہے۔ گویا وہ ایک غیر زبان کے پڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔"

عدالتوں کے شکستہ خط سے شکوک اور تنازعات کا پیدا ہونا اور اس وجہ سے تمام مقدمات کا صحیح طور پر فیصلہ نہ ہونا بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ نہ ایڈریس پیش کرنے والوں نے اس کی نظیریں بیان کی ہیں نہ ہم کو ایسی نظیریں معلوم ہیں جن کی بنا پر ہم ججوں کے فیصلوں میں شبہ کر سکیں۔ شکستہ سے شکستہ خط تھوڑی سی مشق سے بے تکلف پڑھ لیا جاتا ہے اور اس کے جاننے والے ہر عدالت میں موجود ہیں۔ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ کسی فیصلہ کی اپیل اس بنا پر کی گئی ہو، کہ کاغذات مقدمہ میں کوئی لفظ صحیح نہیں پڑھا گیا۔ کوئی عبارت کیسی ہی شکستہ خط میں لکھی ہو اس کا سیاق و سباق خود بتا دیتا ہے کہ اس کے الفاظ کیا ہیں۔

اور وہ کس مطلب کے لئے لکھے گئے ہیں۔

"ہز آنر (گورنر صوبہ) نے ان صوبجات کے خواندہ اشخاص کی تعداد تین ملین بیان کی ہے اور فرمایا ہے کہ ان میں سے بھی بہت بڑی تعداد مسلمانوں کی ہے جو اردو خط میں لکھنا اور پڑھنا پسند کرتے ہیں۔"

دلیل نمبر ۶
پڑھنے کی آسانی کا مسئلہ

ہمارے نزدیک ناگری حروف کی حمایت میں یہ دلیل بھی کافی نہیں ہے کیونکہ یہی امر اردو خط کی نسبت بھی کہا جا سکتا ہے اگر اردو خط بھی نوک پلک کی درستی اور زیر وزبر کے ساتھ لکھا جائے تو اس کے پڑھنے میں بھی آسانی ہوگی اور کوئی لفظ مشتبہ نہیں رہے گا

عام تعلیم کا مسئلہ

ہر صوبے میں دیسی زبان اور دیسی خط کا رواج نہیں ہے۔ حالانکہ وہ اس امر کو فراموش کر گئے ہیں کہ ہر صوبے میں تعلیم کی ترقی یا تنزل کے اسباب مختلف ہیں۔ یہ اختلاف اس باعث سے نہیں کہ ایک صوبے میں دیسی زبان اور دیسی خط کا اسکولوں میں رواج ہے اور دوسرے صوبے میں نہیں ہے

اگر صوبہ بہار اور ممالک متوسط میں جہاں ناگری حروف عدالتوں میں جاری کئے گئے ہیں ابتدائی تعلیم کی ترقی کا اندازہ اس وقت سے نہ کیا جائے جبکہ وہاں سررشتۂ تعلیم قایم ہوا تو یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے گا کہ ناگری حروف کے اجرا سے پہلے اور بعد کے زمانے میں ابتدائی تعلیم کی رفتار میں اسی قدر زیادتی ہوئی ہے جس قدر کہ ہر صوبے میں بہ لحاظ مقامی اسباب اور اقتضائے زمانہ کے ہوتی چلی ہے۔

نواب محسن الملک کی قیادت

جس وقت برادران وطن کا ایجی ٹیشن زور پر تھا نواب محسن الملک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ مسلمانوں کے خلاف من حیث المجموع کوئی تحریک اٹھے اور محسن الملک مصالح کا شکار ہو جائیں۔ وہ اپنی زندگی کے اس آخر دور میں بھی مرد توانا کی طرح اٹھے اور آناً فاناً طوفان کا رخ بدل کر رکھ دیا۔

۱۳ مئی سنہ ۱۹۰۰ء کو کراسٹیویٹ ہال علی گڑھ میں ایک جلسہ بصدارت نواب لطف علی خاں رئیس چھتاری منعقد ہوا۔ نواب محسن الملک نے اس جلسہ میں ایک پُرمغز تقریر فرمائی اور طے پایا کہ ایک وفد گورنر صوبہ کی خدمت میں حاضر ہو اور نواب محسن الملک بذات خود وفد کی قیادت کے فرائض انجام دیں نیز شمالی ہند کے مسلمانوں کا ایک نمایندہ جلسہ منعقد کرنے کا انتظام کریں جو متفقہ عرضداشت تیار کرے۔

نواب محسن الملک نے اپنے طور پر طے کیا کہ گورنر سے مل کر پہلے بالمشافہ گفتگو کرلیں لہٰذا انھوں نے گورنر سے ملاقات کی اجازت طلب کی لیکن جواب آیا کہ،

> "آپ کا اس مقصد سے نینی تال کا سفر کرنا کہ آپ اردو ناگری کے متعلق اپنے خیالات ہز آنر کے سامنے ظاہر کریں، ان کے نزدیک آپ کے لئے غیر ضروری تکلیف ہے۔ یہ مقصد خط و کتابت سے بھی حاصل ہو سکتا ہے"

جب گورنر کے ردِ عمل کا عوام و خواص کو علم ہوا تو کس کی مجال تھی جو غریب

محسن الملک کا ساتھ دیتا۔ چنانچہ نواب لطف علی خاں آف چھتاری نے استعفیٰ دے دیا اور گورنر کو لکھا کہ میرے سامنے واقعات کا غلط رخ رکھا گیا تھا، اس لئے میں نے صدارت قبول کرلی تھی۔

نواب محسن الملک کی دلیری

سرانٹونی میکڈانلڈ کی برہمی مزاج اور ہندی نوازی کا کما حقہٗ علم ہو جانے کے باوجود اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن نے لکھنؤ میں ایک عظیم الشان جلسہ ۱۸ اگست سنہ ۱۹۰۰ء کو منعقد کیا۔ یہ عجیب وغریب وقت تھا۔ انگریزی حکومت کا مضبوط ڈنڈا سر پر تھا اور یہ حالت ہو رہی تھی کہ "زبردست مارے اور رونے نہ دے"، لیکن مسئلہ ایسا سخت تھا کہ ذرا سی بزدلی پوری قوم کو ڈبو سکتی تھی۔ اس لئے نواب محسن الملک کو مجبوراً سامنے آنا پڑا۔ غور فرمائیے کہ کس مجبوری اور الجھن کی کیفیت میں مندرجہ ذیل رزولیوشن لکھا گیا ہوگا:

"اس مجمع کی ہرگز یہ رائے نہیں ہے کہ سرانٹونی میکڈانلڈ صاحب بہادر نے رزولیوشن مورخہ ۱۸ اپریل سنہ ۱۹۰۰ء دربارۂ نفاذ ناگری عمداً کسی فریق کی طرف داری یا نا منصفانہ کارروائی سے دانستہ اہل اسلام کو ضرر پہنچانے کی نیت سے پاس کیا ہے۔ بلکہ جیسا کہ صاحب ممدوح کے بیان سے ظاہر ہوگا ان کا یہ رزولیوشن صرف کثرت آرا اہالیان ممالک مغربی وشمالی اودھ پر مبنی ہے۔ گو یہ جلسہ ہز آنر سے متفق نہیں ہو سکتا۔"[1]

---

[1] تذکرۂ محسن۔ مرتبہ محمد امین زبیری صفحات ۹۴ تا ۱۰۹، سنہ ۱۹۳۵ء

نواب محسن الملک نے اس موقع پر بڑی زوردار تقریر فرمائی جس میں بظاہر انگریزوں و ملکہ سے وفاداری کا بھی اظہار کیا گیا تھا۔ تاہم ان کی دلی کیفیت مندرجہ ذیل چند فقروں سے ظاہر ہوتی ہے:

"گو ہمارے ہاتھ میں قلم نہیں اور ہمارے قلم میں زور نہیں اور اس وجہ سے ہم دفتروں میں کم نظر آتے ہیں مگر ہمارے ہاتھ میں تلوار پکڑنے کی قوت ہے"

بڑے بڑے آدمی نواب محسن الملک کا ساتھ گورنمنٹ کی ناراضی کی وجہ سے دینے میں متامل تھے۔ دوسری طرف علی گڑھ کالج کا مفاد بھی نواب محسن الملک کا دامن تھامے ہوئے تھا۔ ایسے حالات میں معمولی دل گردے کا آدمی مقابلہ پر ہرگز نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ لیکن نواب محسن الملک ہر بات کی نزاکت بخوبی سمجھنے کے باوجود قومی زبان کے مسئلہ پر پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ ملاحظہ کیجیے:

"جب کسی مسئلے کی نسبت تمام قوم کے دل کو صدمہ پہنچے تو اس کے متعلق ایجی ٹیشن پھیلانے اور برانگیختہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسے وقت میں ہمارا فرض حقیقت میں یہ ہے کہ پبلک رائے کو اعتدال پر لائیں اور گورنمنٹ کے ارادوں اور مقاصد کی نسبت جھوٹے خیالات لوگوں کے دلوں سے دور کریں۔ باوجود اس کے کہ ایسے بڑے شخص ہمارے مستعفی پریسیڈنٹ ہیں، اس تحریک سے علیحدہ ہو گئے یا بڑے بڑے نواب اور رئیس خیالی خوف سے علیحدہ رہے۔ ہم کو یقین ہے کہ ہماری قومی زبان مرنے نہ پائے گی اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔"[1]

---

[1] مجموعۂ تقاریر نواب محسن الملک حصہ اول ص ۹، ۳

ردِ عمل سر میکڈانلڈ گورنر صوبہ کو جب علی گڑھ کے جلسہ کی خبریں ملیں تو وہ سخت مشتعل ہوا اور اس نے نواب محسن الملک کی ذاتی طور پر توہین کرنے کا پختہ عزم کر لیا۔ چنانچہ ٹرسٹیانِ علی گڑھ کالج کے اجلاس میں اس نے اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کے خلاف بہت زہر اگلا اور الزام لگایا کہ علی گڑھ کالج کے طلبا اس تحریک کے سرگرم کارکن ہیں۔ نیز اساتذہ و سیکرٹری بھی نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔ گورنر نے دھمکی دی کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو گورنمنٹ کی امداد فی الفور بند کر دی جائے گی۔

جب نواب محسن الملک نے محسوس کیا کہ حالات بد سے بدتر رخ اختیار کرتے جا رہے ہیں اور علی گڑھ کالج کا وجود بھی خطرے میں پڑ رہا ہے تو انھوں نے قومی مفاد کی خاطر کالج کی سکریٹری شپ سے استعفیٰ دے دیا۔ نواب محسن الملک کے استعفے دینے کے باوجود انٹونی میکڈانلڈ کا غصہ فرو نہیں ہوا۔ چنانچہ حکم ہوا کہ نواب صاحب محسن الملک کا خطاب بھی استعمال نہ کریں۔ نواب محسن الملک کی اس جبریہ علیحدگی کی وجہ سے سیاستِ ملی میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔ چنانچہ ایک نئی سیاسی جماعت بنانے کی تحریک پیدا ہوئی۔ نواب وقار الملک بھی اس خیال کے حامی تھے لیکن علی گڑھ میں مسٹر بارسین ایک با اثر یورپین ممبر اسٹاف اپنی خاموش تدابیر کے ذریعہ مسلمانوں کو علیحدہ سیاسی تنظیم سے برابر روک رہے تھے۔ لیکن تا بکے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ بالاخر وجود میں آہی گئی یہ سیاسی ادارہ بھی مسلمانوں کے واحد تعلیمی پلیٹ فارم یعنی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ڈھاکہ میں قایم ہوا۔

مسلمانوں کی کامیابی نواب محسن الملک کی سیاست سے علیحدگی اور زبان و قلم پر طرح طرح کی پابندیوں کے باوجود زبان اور رسم الخط کے مسئلہ پر مسلمانوں کی بے چینی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بالآخر ۱۰ر اپریل سنہ ۱۹۰۵ء گورنمنٹ نے ایک رزولیوشن جاری کیا۔ جس کے تحت عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں ناگری حروف میں لکھی ہوئی درخواستیں دینے کی اجازت دے دی گئی۔ اور سمن و اعلان اردو ناگری حروف میں جاری ہونے کا فیصلہ ہوا۔ نیز یہ بھی طے ہوا کہ کوئی شخص کسی عہدہ پر مقرر نہ کیا جائے جسے ناگری اور اردو حروف سرعت کے ساتھ لکھنے کی مہارت نہ ہو۔ [۱]

ان تمام ریشہ دوانیوں کے علی الرغم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور ہمارے اکابر کے تدبر کے نتیجے میں مسلمانان یوپی ہندی کے ساتھ ساتھ اردو زبان کو بھی کورٹ کی زبان برقرار رکھوانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن برادرانِ وطن نے اس فیصلہ کو دل سے قبول نہیں کیا اور ہندی و ہندوستانی کا قضیہ اٹھ کھڑا ہوا اور قیام پاکستان تک جاری رہا۔

ہم اب تک انگریزوں کی لسانی میدان میں سیاسی حکمت عملیوں کو بیان کرتے چلے آئے ہیں، لیکن جوں جوں ہم آگے بڑھتے ہیں ہمارا برادران وطن سے براہ راست ٹکراؤ ہوتا جاتا ہے۔ یہ سب ہنگامے قدرتی طور پر ہوتا ہی تھے

---

[۱] مسلمانوں کا روشن مستقبل از مولوی طفیل احمد منگلوری۔ شائع شدہ نظامی پریس بدایوں سنہ ۱۹۴۵ء ص ۲۳۲ - ۲۳۱

اس لئے واقعات کی کڑیاں ملانے نیز تسلسل بیان کی خاطر ذیل میں ہم ہندی۔ ہندوستانی اور اردو کے قضیۂ نامرضیہ کی داستان مختصراً پیش کرتے ہیں۔

جیساکہ متعدد بار بیان کیا جا چکا ہے کہ انگریزوں کی شہ پر برادران وطن کا ایک مضبوط گروہ اردو دشمنی پر آمادہ ہو گیا تھا، اس گروہ کی سرگرمیوں کے نتیجے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ان تہذیبی رشتوں کا خاتمہ ہو گیا، جو صدیوں کے تعلقات باہمی کا خوشگوار نتیجہ تھے۔ فرقہ پرستوں نے اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مسلم تہذیب و تمدن و معاشرت کو تباہ کرنے کا بہترین ذریعہ اردو دشمنی میں مضمر ہے۔ لہٰذا یہ لوگ اردو کی مخالفت دراصل اسلام دشمنی کے جذبے کو تسکین دینے کے واسطے کرتے تھے۔ آج بھارت میں ہندی۔ ہندو۔ ہندوستان کا نعرہ گونج رہا ہے۔ حالت یہ ہے کہ مردم شماری کی رپورٹوں تک میں بے ایمانی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اسکولوں کے معصوم بچوں کو ہندی کی کڑوی گولی نگلنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ یہ کیفیت کوئی ایک روز کی پیداوار نہیں ہے۔ بلکہ برسوں کی سوچی سمجھی تدابیر کا نتیجہ ہے۔ اس لئے ذیل میں ہم ماضی قریب کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

ہندوستانی کیا ہے؟ ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی نے ہندوستانی کی جو تعریف کی ہے وہ مندرجہ ذیل ہے۔

ہندوستانی ایک باعظمت زبان ہے جو اردو اور ہندی کی شکل میں پندرہ کروڑ سے زیادہ لوگوں کے لئے ادب کی ایک معیاری حیثیت رکھتی ہے اور دنیا کی بڑی زبانوں میں (چینی و انگریزی کے بعد) سب سے زیادہ عام

اور کثیر الاستعمال شمار کی جاتی ہے ۱ے

ہندوستانی کی مندرجہ بالا تعریف پر جب بحث و مباحثہ و نیز عمل کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ رسم الخط کے معاملہ میں ناگری رسم الخط کو ہی ترجیح دی جا رہی ہے۔

گاندھی جی آنجہانی کو اردو ہندوستانی کے مسئلہ سے بڑی دلچسپی تھی۔ واردھا تعلیمی اسکیم کے تحت جس کے اصلی روح رواں وہ خود تھے، ہندوستانی زبان کو ایک لازمی مضمون قرار دیا۔ لیکن وہ ہندوستانی کی تعریف عجیب و غریب کرنے لگے۔ انھوں نے ہندوستانی کا مطلب نہ اردو کو قرار دیا اور نہ ہندی کو بلکہ ایسی زبان جو پیدا کی جائے گی۔

گاندھی جی کی زندگی میں کانگریس کے اعلیٰ دماغوں میں بابو راجندر پرشاد کا بڑا اونچا مرتبہ تھا۔ انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں بہت کھل کر کچھ حقایق بیان کئے ہیں ملاحظہ ہوں۔

کانگریس کے آئین میں جہاں زبان کا ذکر ہے وہاں نہ لفظ ہندی استعمال کیا گیا ہے نہ اردو۔ بلکہ وہاں لفظ ہندوستانی ہی استعمال ہوا ہے۔ جب گاندھی جی نے جنوبی ہند میں راشٹر بھاشا کا پرچار سنہ ۱۹۱۰ء میں شروع کیا تھا، تب ہندی کے کام کا ساہتیہ سمیلن کے اہتمام میں ہی آغاز ۲ے

۱ے بحوالہ کتاب لسانی مسائل۔ از ڈاکٹر شوکت سبزواری ص ۲۳۵

۲ے گاندھی جی کی بالغ نظری قابل داد ہے۔ جنوبی ہند اس وقت لسانی مسئلہ کی وجہ سے بھارت کے واسطے درد سر بنا ہوا ہے گاندھی جی نے ۵۰ سال قبل اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا۔

کر دیا تھا۔ اس زمانے میں وہ اندور میں ساہتیہ سمیلن کے صدر مقرر ہوئے تھے۔ کانگریس کے آئین میں ہندوستانی لفظ کا استعمال مہاتما جی اور سری پرشوتم داس ٹنڈن نے ہی کیا تھا۔ ان کے ہی لفظ کو کانگریس نے مان لیا تھا۔ گاندھی جی نے جب سے یہ کام ہاتھ میں لیا تھا۔ انھوں نے ہندی اور اردو کو دو الگ الگ زبانیں نہیں مانا تھا۔ اگرچہ دونوں کی لغت میں فرق ہے۔ اور یہ فرق روز بروز بڑھتا جارہا ہے۔ پھر بھی دونوں کی گرامر ایک ہی ہے۔ جو کسی دوسری زبان سے پوری پوری نہیں ملتی۔ ماہر لسانیات کا کہنا ہے کہ زبان کا اختلاف لغت سے اتنا نہیں ہے جتنا لفظوں کی ساخت اور قواعد زبان کی رو سے ہوتا ہے۔ اس لئے یہ ماننا نامناسب، اور اصول لسانیات کے خلاف نہیں ہے کہ ہندی اور اردو ایک ہی زبان کا نام ہے۔ یا یوں کہیے کہ ایک ہی زبان کی دو طرز ہیں۔ جو الگ الگ زبانیں نہیں۔ ہندوستانی ہندی بھی ہے اور اردو بھی۔ کیونکہ وہ عموماً ثقیل لفظوں کو کام میں نہیں لاتی۔ وہ اپنا روپ ایسا رکھتی ہے جسے ہندی والے اور اردو والے دونوں ہی اپنا سکیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اصطلاحی لفظوں کے لئے راشٹر بھاشا (قومی زبان) کو چاہے ہم جس نام سے پکاریں ہم کو سنسکرت پر ہی انحصار کرنا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ غیر ملکوں سے کچھ لفظ ایسے آگئے ہوں جو رائج ہو گئے ہیں ان کو ویسے ہی رہنے دینا موزوں اور لازمی ہے۔ لیکن جہاں نئے لفظ بنانے ہوں وہاں سنسکرت کی ہی مدد لینا مناسب اور مفید ہے۔

اس میں اردو والوں کا اگر کچھ اصرار ہو تو وہ اپنے لفظ جیسے چاہیں بنا لیں مگر یہ یاد رکھیں کہ ان کے وہ الفاظ ملک گیر نہ ہو سکیں گے صرف اردو میں ہی رہ جائیں گے۔ اس لئے جہاں تک معمولی بول چال کا اور اخباروں کی زبان کا تعلق ہے ہم ایسی ہی زبان استعمال میں لا سکتے ہیں جو ہندی اور اردو دونوں کے لئے قابل قبول ہو۔ مگر جہاں اصطلاحی لفظوں کا کام پڑے گا۔ وہاں دونوں الگ ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی ضروری یا لازمی نہیں ہے اور جیسا اوپر لکھا گیا ہے یہ اصطلاحی لفظ تب ہی ہر دل عزیز اور ملک گیر ہو سکتا ہے جب وہ سنسکرت کی امداد سے بنا ہو[1]

بابو راجندر پرشاد بہار کے ایک قدیم کایستھ خاندان کے فرد تھے۔ فارسی زبان سے بخوبی واقف تھے۔ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن سے مسلمانوں سے زیادہ آشنا تھے۔ اس لئے عام طور پر یہ خیال تھا کہ وہ اردو کے ساتھ انصاف کریں گے چنانچہ مسلمانان ہند نے ان کی خدمت میں جب وہ صدر جمہوریہ ہند تھے، ایک طویل میمورنڈم بھی انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام بدقسمت اردو کے قانونی حق کے بارے میں پیش کیا۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، بابو راجندر پرشاد تو ہندی زبان کے سب سے بڑے مبلغ تھے، پھر ان سے اردو کے بارے میں انصاف کی امید بے کار تھی۔ ملاحظہ کیجیے:

"جنوبی ہند میں گاندھی جی کے ہندی پرچار کے کام نے ہندی پرچار کے

---

[1] کتاب "اپنی کہانی" بابو راجندر پرشاد آنجہانی سابق صدر بھارت ص ۷۶۱

نے میری آنکھیں کھول دیں اور ایک بہت بڑا میدان پیدا کر دیا۔ اور میں یہ خواب دیکھنے لگا کہ وہ ایک دن سارے ملک کی سرکاری زبان ہو جائے گی۔ اگرچہ اس تبلیغی کام کے ساتھ میرا کسی قسم سے براہ راست تعلق نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی میں اس میں دلچسپی لینے لگا۔ کچھ بہار کے پرچار کرنے والے بھی وہاں گئے۔ ان میں سے کچھ تو آج تک وہاں کام کر رہے ہیں۔ شروع میں جو پرچار کرنے والے جاتے تھے، وہ مجھ سے پوچھ کر جاتے۔ اس طرح وہاں جو کام ہوتا اس کی معلومات مجھے رہتیں۔ گاندھی جی سے اس کا تعلق ہونے سے یہ کام اور بھی مضبوط ہوتا گیا۔ مہاتما جی کے ہندی پرچار کے کام سے متاثر ہو کر انجمن ادبیات ہندی نے ان کو اندور کے اجلاس کا جو سنہ ۱۹۱۸ء میں ہوا تھا، صدر منتخب کر لیا۔ مہاتما جی وہاں چمپارن ہی سے گئے۔ ہم میں سے کئی آدمی ان کے ساتھ ہی گئے۔ وہاں کا جلسہ بہت شاندار ہوا۔ جنوبی ہند میں ہندی تبلیغ کے لئے وہاں پر چندہ کیا گیا۔ انجمن نے ان کی اس ترغیب و خواہش پر اس کام کو اپنا اہم کام سمجھ کر اس کو ہاتھ میں لے لیا۔ [1]

مولوی فضل الحق کی تقریر سنہ ۱۹۳۸ء

مندرجہ بالا حالات و واقعات کی روشنی میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کا برادران وطن کی طرف سے مشتبہ ہو جانا ایک قدرتی بات تھی۔ چنانچہ مسلمانوں نے پاکستان کی جدوجہد جن وجوہ سے شروع کی اس میں برادران وطن کی لسانی پالیسی بھی شامل تھی۔ جو انگریزوں کی لسانی پالیسیوں کا ورثہ تھی۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں شیر بنگال مولوی فضل الحق مرحوم نے مسلمانان ہند

---

[1] باپو کے قدموں میں۔ از بابو راجندر پرشاد شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ صفحہ ۱۶۸-۱۶۹

کے تعلیمی پلیٹ فارم سے صدارتی تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

" افسوس ہے ادھر چند سال سے فرقہ پروری کی بیماری جنون کی حد تک پہنچ گئی ہے اور اس جنون میں اکثر قوم پرستی کا دعویٰ کرنے والے رہنما بھی مبتلا ہیں۔ بنارس سے ایک مصنوعی اور غیر فطری تنگ خیالی کی گھٹا اٹھ کر مذہب کے نام پر ہماری سوشل فضا کو تاریک کر رہی ہے کس قدر تعجب خیز ہے کہ بعض سیاسی مدبر باوجود دعوئ حریت اور ادعائے روشن خیالی اس تحریک کی رہبری کر رہے ہیں۔ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ اردو کسی اور ملک کی زبان ہے؟ یا مسلمان اسے اپنے ساتھ لائے تھے؟ یا وہ فقط اس کے بانی مبانی ہیں؟ اگر ان سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو پھر اس کوشش کے کیا معنی ہیں کہ اردو سے فارسی عربی الفاظ کے بن باس کا حکم ہو رہا ہے۔ اور اس کی جگہ سنسکرت کا لفظ خواہ وہ کیسا ہی مضحکہ خیز اور غیر مانوس ہو تجویز کیا جا رہا ہے۔ مثلاً نافذ کی جگہ لاگو[1]۔ صوبجات متحدہ کی جگہ جُبت صوبہ[2] ضمنی سوال کی جگہ دُم سوال ایجاد کیا گیا ہے۔

حیف اُردو سے ہے اُردو کا وطن بگڑا ہوا
شیخ کر غصہ مزاجِ برہمن بگڑا ہوا

آج کل بتیس کروڑ افراد میں اُردو زبان
اس طرح ہے جس طرح بتیس دانتوں میں زبان

(حضرت ناطق لکھنوی)

---

[1] ایک شاعر نے جس کا نام یاد نہیں اس لفظ پر کیا اچھا شعر کہا تھا ؏

گر تو نافذ کا ترجمہ لاگو
کیونکہ تو حکمران ہے پیارے

[2] صوبے کا نام اتر پردیش رکھا گیا ہے

اس موقع پر میرا فرض ہے کہ کانگریس کے اس ہنگامے پر اظہار خیال کروں جو ہندی کو ہندوستان کی مشترکہ زبان بنانے کے لئے تمام ملک میں برپا کیا جا رہا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہندوستان کی اکثر مروّجہ اور مقامی زبانوں پر ہندی کو ترجیح ہو۔ لیکن کانگریسی حضرات اگر جبراً قہراً ہندی کو کھینچ تان کر ملک کی مشترکہ زبان کا منصب دینا چاہیں گے تو ہم ان کی سعی نامشکور کے اس سلسلہ کو کور آنہ فرقہ پروری اور معاندانہ تعصب کی ایک کڑی تصور کریں گے۔ جو ہندوستان کے کانگریسی صوبوں کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ بن کر دکھائی دے رہا ہے"۔

مولوی فضل الحق کے اندیشے حقایق پر مبنی تھے۔ بلی جلد ہی تھیلے باہر آگئی۔ کانگریسی حکومتوں نے جس ذہنیت کے مظاہرے کئے ان کی روشنی میں آزاد ہندوستان کی لسانی پالیسیوں کا تصور کیا جا سکتا تھا۔

واردھا تعلیم اسکیم اور اُردو

مشترک ہندوستان میں مسلم کلچر۔ تہذیب و تمدن نیز زبان کو جن باتوں سے شدید خطرہ لاحق تھا ان میں سے ایک واردھا تعلیمی اسکیم بھی تھی جس کا ہم سرسری ذکر کر چکے ہیں۔ مسلمانان ہند نے اس بارے میں شدید بے چینی کا اظہار کیا۔ چنانچہ اس اسکیم کا جائزہ لینے کے واسطے مسلم لیگ نے بھی ایک کمیٹی مقرر کی جس کے ممبران حسب ذیل تھے :۔

۱۔ ڈاکٹر افضال قادری۔ حال صدر شعبہ ذولوجی۔ کراچی یونیورسٹی۔

۲۔ پروفیسر نواب علی۔

۳۔ سید محمد مہدی ساجد۔ اودھ۔ مرتب رپورٹ

کمیٹی محولہ بالا کی رپورٹ کا ایک طویل اقتباس درج ذیل ہے :-

" واردھا تعلیمی اسکیم کا یہ منشاء تھا کہ وہ اردو زبان کی ترقی کو محدود کرنے میں ایک کامیاب ہتھیار ثابت ہو اس اسکیم کے تحت ہندوستانی زبان کو ایک لازمی مضمون قرار دیا گیا تھا۔ تاکہ یہ تمام ہندوستان کی عام زبان بنائی جا سکے لیکن لفظ ہندوستانی ایک دھوکے میں ڈالنے والی بات تھی۔ پہلے اس کا منشا اردو زبان کو نشانہ بنانا تھا۔ جو کہ عام طور سے شمالی ہندوستان میں بولی جاتی تھی اور بعض کانگریسی لیڈروں نے اس کو اردو زبان بنانے کی ناکام کوشش بھی کی۔ لیکن مسٹر گاندھی آں جہانی نے ہندوستانی کا مطلب نہ تو اردو کو قرار دیا اور نہ ہی ہندی کو۔ بلکہ ایسی زبان جو پیدا کی جائے گی "

لفظ ہندوستانی کے معنوں میں گاندھی جی کی پیدا کردہ یہ تبدیلی کوئی اتفاقی بات نہیں تھی اس کا ہونا لازمی تھا۔ کیونکہ کانگریسی ہائی کمانڈ ایک فرقہ وارانہ جماعت تھی۔ پس ہندوستانی کے بھیس میں ایک عام ہندوستانی کی زبان کے لباس میں واردھا اسکیم مسلمانوں پر ایک نئی زبان جبراً عاید کرنا چاہتی تھی۔ مسلمانان ہند کے یہ اندیشے بے جا نہیں تھے۔ وقت نے ان سب باتوں کو صحیح ثابت کیا۔ ذیل کے اقتباس کو غور سے ملاحظہ فرمایئے۔

" لفظ ہندوستانی کی تعریف کے معنوں میں جو تبدیلی روز بروز ہو رہی ہے اس سے ہم کو شبہ ہے کہ اردو زبان کے ساتھ ساتھ جس میں کہ مسلمانوں کے تمدن کا ذخیرہ ہے رسم الخط بھی جس میں اردو زبان لکھی جاتی ہے، غائب ہو جائے گا۔"

قیام پاکستان کے بعد یو۔پی میں اردو

بھارتی آئین کی دفعہ ۳۴۷ میں اردو کو ملک کی چند بڑی زبانوں میں تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن عملاً اس زبان کے ساتھ بڑی سرد مہری کا سلوک ہو رہا ہے۔ لسانی اقلیتوں کے کمشنر نے صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ اردو تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ کمی ہو رہی ہے۔ جب کہ ریاست میں پرائمری تعلیم پانے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ بھارتی حکومت کے بیس سالہ دور میں اردو کے ساتھ جو ظلم و ستم روا رکھا گیا ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے انجمن ترقی اردو ہند کے آرگن "ہماری زبان" نے اپنی یکم مارچ سنہ ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں بہت سخت تبصرہ کیا ہے۔ جس کا ایک اقتباس حسب ذیل ہے،

مکتبوں اور مدرسوں میں طلبا کی تعداد جو دی گئی ہے وہ بھی حکومت کے لئے باعث فخر نہیں باعث شرم ہے۔ سنہ ۶۱-۱۹۶۰ء میں یہ تعداد ۱۶۰۱۰ تھی۔ سنہ ۶۵-۱۹۶۴ء میں یعنی چار برس میں یہ تعداد بڑھ کر ۲۳۰۱۳ تک پہنچ گئی۔ اتنے عظیم الشان اضافہ پر دو لاکھ کی گراں قدر رقم اس کارِ خیر پر صرف کرنے پر اُتر پردیش حکومت ایسی نازاں ہے کہ اس نے کوئی بڑا تیر مارا ہے۔ سچ ہے ؂

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ کیجیے کہ مغربی یو۔پی کے شہروں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور جہاں ہندوؤں کی بڑی اکثریت بھی اردو داں

ہے۔ بیس سال کے قلیل عرصہ میں کیسا خوفناک انقلاب آیا ہے، یہ سب کچھ کس لئے ہو رہا ہے؟ صرف اس واسطے کہ سیاسی طور پر بیدار یوپی کی مسلم اقلیت کو ذہنی و جسمانی طور پر مفلوج بنا دیا جائے۔ اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ برادران وطن کی ذہنیت کا اندازہ پنڈت سندر لال کی بیان کردہ ایک روایت سے بخوبی ہو سکے گا۔

"آج سے کوئی ۳۰ برس پہلے میں نے یوپی کے وزیر اعلیٰ پنت جی سے ملاقات کی تھی اور اردو کے مسئلہ پر گفتگو کی تھی اور میں نے شکایت آمیز لہجہ میں ان سے کہا تھا کہ اردو پر کیوں ظلم روا رکھے ہوئے ہو؟ وہ تو ایک مشترکہ زبان ہے۔ پنت جی نے کہا کہ یہ تو مسلمانوں کی زبان ہے میں نے کہا یہ بات غلط ہے۔ لیکن اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو کیا کروڑوں مسلمانوں کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ ان کی زبان زندہ رہے؟ پنت جی اس کے جواب میں بولے کہ آپ کو اس کی کیوں چنتا ہے؛ مسلمانوں نے ہم پر ایک ہزار سال حکومت کی ہے۔ ذرا ان کو احساس تو ہو جانے دو کہ اب وہ محکوم ہیں۔

دس بیس سال رک جائیے جب اردو بولنے والے ختم ہو جائیں گے۔ تو اردو کے مسئلہ پر بات چیت کی جائے گی۔

مندرجہ بالا اقتباس پر تبصرہ کرتے ہوئے امام صحافت مولانا عبدالماجد دریاآبادی مدیر "صدق جدید" نے تحریر فرمایا کہ:

"اور اگر راوی اتنا معتبر نہ ہوتا تو روایت یقین کرنے کے جی

قابل نہ تھی۔ یہ ذکر پنت جی کا ہو رہا ہے جو پٹیل کے نہیں، پنڈت جواہر لال نہرو کے خاص لوگوں میں سے تھے۔ جب ان کی ذہنیت اس درجہ مسلم بیزار اور اُردو کُش تھی تو سردار پٹیل، اور راج رشی ٹنڈن اور ڈاکٹر کاٹجو اور ڈاکٹر سمپورنانند کا ذکر ہی کیا ہے۔

(بحوالہ رسالہ "العلم" جولائی تا ستمبر ۱۹۶۶ء ص ۱۰)

سہ لسانی فارمولا ۔ ہر دور اور ہر زمانے میں ظالم کی مار کے سامنے تو کم ہی لوگ جاتے ہیں۔ البتہ بیچ کی راہ تلاش کرنے والوں کی کمی نہیں ہوتی، جو کمزوروں کو عموماً زیادہ سمجھاتے ہیں اور ظالم کے سامنے طرح طرح سے باتیں بناتے ہیں ایسے لوگوں کی نیت یقیناً خراب نہیں ہوتی لیکن ایسی تمام کوششیں محض آنسو پونچھنے کے مترادف ہوتی ہیں۔ کُل بھارت اور خصوصاً یو پی بہار میں سہ لسانی فارمولا بڑے بلند بانگ دعووں کے ساتھ پیش کیا گیا تھا اور اس کو بہت سی لسانی مشکلات کا حل بتایا گیا تھا اس فارمولے کے تحت، ایک طالب علم مادری زبان، علاقائی زبان لازماً سیکھتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہندی یا انگریزی میں سے ایک زبان لینے کا پابند ہوتا ہے۔ بقول پروفیسر مسعود حسین خاں "ہماری زبان" علی گڑھ مورخہ یکم اپریل سنہ ۱۹۶۸ء

"یہ سہ لسانی فارمولا لسانی اقلیتوں کے لئے چہار لسانی بن جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ سہ لسانی فارمولے میں تین قسم کی زبانیں شامل ہیں۔ مادری، رابطہ کی زبان اور علاقائی زبانیں۔ اب رابطہ کی زبان مسلمان انگریزی استعمال

کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہندی سیکھنے پر بھی مجبور ہیں۔"

رسم الخط بدلنے کا مشورہ : مسلمانوں کے دل و دماغ کو دہشت زدہ کرنے کے بعد اب بھارت میں ان کو مشورہ دیا جا رہا ہے کہ بہتر بات یہ ہوگی کہ رسم الخط بدل دیا جائے۔ پروفیسر آل احمد سرور اداریہ "ہماری زبان" مورخہ ۸ اکتوبر سنہ ۱۹۶۰ء میں رقم طراز ہیں :

"کچھ لوگ اب ہمیں یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ "بھائی اُردو رسم الخط چھوڑ دو۔ اور اُردو زبان کو بچاؤ۔ اس کے سکھانے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ یہ بدیسی اثرات کی یادگار ہے اس میں چھپی ہوئی کتابوں میں غلطیوں کا امکان زیادہ ہے۔ اس میں حروف کی شکلیں اتنی ہیں کہ نو سیکھے یاد نہیں رکھ سکتے۔ ٹائپ رائٹر ٹیلی پرنٹر وغیرہ اس میں کہاں ؟ ذرا سے لفظوں کے پھیر سے بات کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ تھوڑے سے لوگ اسے پڑھتے ہیں اس کے مقابلے میں دیوناگری رسم الخط اختیار کر لیا جائے تو سارے دلدر دور ہو جائیں گے ہر ادیب اور شاعر کی کتاب لاکھوں بکے گی۔ آخر دیوان غالب کی لاکھوں کاپیاں بکی ہیں یا نہیں ؟ چٹکی بجاتے میں۔ رسم خط سکھایا جا سکے گا اور جہاں اردو ادب کے لئے دیوناگری رسم خط اختیار کیا گیا وہیں ہر طرف اُردو ہی اُردو ہوگی۔

لوگ ہندی کی کسی کتاب کو کبھی اٹھا کر بھی نہ دیکھیں گے۔ رسم خط کی قربانی دے کر ہی زبان کو بچایا جا سکتا ہے۔

ان لوگوں کی سادہ لوحی یا معصومیت یا مصلحت پسندی کی وجہ سے اچھے اچھے لوگ شبہ میں پڑ گئے ہیں۔ کہ کہیں ہم اپنے رسم خط پر اصرار کر کے غلطی تو

نہیں کر رہے ہیں۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ ایسی تجویزیں زبان کے عالموں، ادیبوں یا شاعروں اور معلموں کی طرف سے کم پیش کی گئی ہیں اور زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے پیش کی گئی ہیں جو یا تو ہر چیز کو وقتی سیاست کی عینک سے دیکھتے ہیں، یا اردو کے سارے سرمایہ کی اہمیت سے ناواقف ہیں۔

آج کی حالت

۱۹۶۹ء ختم ہونے والا ہے، بھارت کو آزاد ہوئے تقریباً ۲۲ سال گذر گئے۔ لیکن حکومت یو۔پی اردو دشمنی کی پالیسی بدلنے کو کسی طرح تیار نہیں ہے۔ ہماری زبان ۱۵ ر جون سنہ ۱۹۶۹ء میں جناب ظفر احمد صدیقی سکریٹری انجمن تعلیمی کونسل نے انکشاف کیا ہے کہ،

> "یو۔پی میں ڈیڑھ سو سے زائد ثانوی اسکول مسلمانوں کے ہیں جو مسلمانوں کے زیر انتظام چل رہے ہیں ان سب میں ایسے طلبا کی اکثریت ہے جن کی مادری زبان اردو ہے مگر پورے یو۔پی میں ایک اسکول بھی ایسا نہیں ہے جس میں اردو ذریعہ تعلیم ہو، وجوہات حسب ذیل ہیں :۔
>
> (۱) پرائمری سطح پر اردو کی تعلیم کا معقول بندوبست نہیں (۲) ثانوی درجات میں پڑھائے جانے والے مضامین حساب، جغرافیہ اور تاریخ وغیرہ میں اردو کی کتابیں نہیں ہیں اور نہ ان کی تیاری کا کوئی بندوبست ہے (۳) اس امر کا کوئی اطمینان نہیں ہے کہ جن طلبا نے ثانوی تعلیم اپنی مادری زبان اردو میں حاصل کی ان کی اعلیٰ تعلیم کا بندوبست بھی ان کی مادری

زبان میں کیا جائے (۴) ملازمتوں اور زندگی کے دیگر شعبوں میں اردو داں طلبہ کے لئے یکساں مواقع نہیں ہیں (۵) مختلف مضامین کے امتحانات اردو میں لئے جانے کا بندوبست نہیں ہے۔

سنسکرت پر اصرار یو۔پی میں صرف سنسکرت کو سہ لسانی فارمولا میں شامل کیا گیا ہے۔ بلکہ اسے اتنی اہمیت دی گئی ہے جس سے سہ لسانی فارمولا کا اصل مقصد ہی فوت ہوگیا ہے۔

باب - ۹

صوبۂ پنجاب

صوبۂ پنجاب سنہ ۱۸۴۹ء میں انگریزی اقتدار کے تحت آیا۔ سنہ ۱۸۵۶ء میں محکمۂ تعلیم قایم ہوا اور اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا۔ صاحب ایجوکیشن رپورٹ سنہ ۱۸۸۴ء کے مطابق

"پنجاب میں گورنمنٹ نے ابتدا ہی میں طے کر دیا تھا کہ ایک واحد زبان ایک ہی رسم الخط میں اسکولوں میں ذریعہ تعلیم ہوگی۔ چنانچہ اردو زبان فارسی رسم الخط میں اسکولوں کی زبان قرار دے دی گئی۔ اس سلسلہ میں اس وقت بمشکل ہی کوئی اختلاف موجود تھا۔ اگرچہ پنجاب کی بولی اردو سے خاصی مختلف تھی۔"

کچھ عرصہ بعد اردو کے مقابلہ میں ہندی اور گورمکھی زبان کا مسئلہ انگریزی حکومت کی مسلّمہ پالیسی کے تحت آہستہ آہستہ ابھرتا چلا گیا۔ جہاں تک پنجابی زبان کا تعلق ہے وہ اگرچہ پنجابی عوام کی گھریلو بولی تھی۔ لیکن اس کی علیحدہ گرامر موجود نہ تھی۔ نیز وہ سرمایہ علمی کے اعتبار سے بھی تہی دامن تھی۔ سکھوں کا عام رجحان گورمکھی کی جانب تھا۔ اور ہندوؤں کا ہندی کی طرف۔ پھر کچھ عرصہ بعد پنجابی بہ خط ناگری کا ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ مسلمانان پنجاب اس حقیقت

کو بخوبی سمجھتے تھے کہ اگر انھوں نے ہندو سکھوں کے دباؤ میں آکر اردو کے بجائے پنجابی گورمکھی یا ہندی کو ناگری حروف میں منظور کر لیا تو یہ فیصلہ قومی خودکشی کے مترادف ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے فارسی زبان سے جبریہ پیدا کردہ بے تعلقی کے بعد اردو سے کنارہ کش ہونا کسی صورت میں قبول نہیں کیا اور یہ صورت حال انگریزی کے اختتام تک قائم رہی بابائے اردو مولوی عبدالحق سر سکندر حیات خاں کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"پنجاب اردو کا گڑھ ہے، اور تقریباً اسی سال سے
مسلسل اردو کی قابل قدر خدمت کر رہا ہے اور اس حکومت
میں ہندوستان کے سب صوبوں سے پیش پیش ہے
اگر وہاں اردو کی حیثیت میں فرق آیا تو نہ صرف اہل پنجاب
کو بلکہ ہندوستان کے تمام اردو داں طبقہ کو جو ملک میں بڑی
اہمیت رکھتا ہے دلی صدمہ پہنچے گا اور ہر صوبہ میں اس
کے خلاف شورش برپا ہوجائے گی۔ یوں تو ہم میں سینکڑوں
اختلاف ہیں یہاں تک کہ مذہب بھی اس سے نہیں بچا
لیکن اردو کے معاملہ میں ہم سب ایک ہیں خواہ کسی خیال و
مشرب کے ہوں" [۱]

تاریخی سرگزشت: سکھوں کے پچاس سالہ خون آشام دور میں

---

[۱] اردو دے معلی صفحہ ۲ خط مورخہ ۹ / جون ۱۹۴۲ء مرتبہ عبدالحق جوبلی کمیٹی کراچی

پنجاب و سرحد کے مسلمانوں کو ہر محاذ پر دردانگیز تباہیوں سے واسطہ پڑا لیکن صرف ایک معاملہ میں وہ خوش قسمت رہے یہ خوش قسمتی فارسی زبان کا خالصہ دربار کی زبان کے طور پر برقرار رہنا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ معلمی کے پیشہ میں مسلمانوں کا تھوڑا بہت وقار قائم رہا اور فارسی لٹریچر کے سہارے مسلمانوں کا قومی و روحانی جذبہ بھی برقرار رہا۔ چنانچہ جب انگریز پنجاب پر قابض ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ "معلمی کا میدان مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ مسلمان

مسلمان اساتذہ کی کثرت

طلبا کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہندو طالب علموں کو بھی مسلم اساتذہ پر بے حد اعتماد ہے وہ اسلامی مدارس میں بڑی کثیر تعداد میں فارسی پڑھتے ہیں۔ اگر اس چیز کو اسی حالت میں چھوڑ دیا گیا تو حکومت کی تمام طاقت مسلمانوں کے ہاتھ میں آجائے گی۔ یہ ایک ایسا میلان ہے جسے بہت جلد روکنے کی ضرورت ہے ۱؎

کپتان فلر کا بیان سنہ ۱۸۶۱ء

"محکمہ میں تین سو چونتیس استاد مسلمان ہیں۔ گیارہ ہندو اور چھ دوسرے فرقوں کے۔ ابھی اس نسبت کو مساوی کرنے کا موقع نہیں ملا حلقہ انبالہ کے سوداپیشہ والوں کی تعلیم مسلم اساتذہ کے ہاتھ میں ہے جب تک یہ استاد ہر دلعزیز ہیں، ہم ان کی جگہ دوسری قوموں کے استاد مقرر نہیں کرسکتے البتہ افسران ضلع رفتہ رفتہ رستہ صاف کرکے تبدیلی کے امکانات پیدا کرسکتے ہیں۔ اور وہ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ ہندوؤں کو ٹریننگ اسکول میں

۱؎ بیان مسٹر آرنلڈ پنجاب کی پہلی تعلیمی رپورٹ سنہ ۱۸۵۶ء بحوالہ مقالہ۔ علمائے کرام و دینی مدرسے۔ از محمد علم الدین سالک "نقوش" لاہور نمبر ص ۵۴۷ - ۵۳۶

جانے کا شوق دلائیں اور جو اسکول مسلم استادوں کے تقرر پر زیادہ اصرار کریں وہاں ہندو استاد متعین کیے جائیں۔

ایک طرف تو انگریز مسلم اساتذہ کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مشغول تھا، دوسری طرف مسلم اساتذہ بھی صورت حال سے نافل نہیں تھے۔ لیکن حاکم و محکوم کے مقابلہ کا سوال ہی کہاں؟ جب فارسی زبان متروک قرار پائی اور اردو زبان نے اس کی جگہ لے لی تو مسلمانوں نے اس خلا کو کچھ زیادہ محسوس نہیں کیا۔ کیونکہ اردو زبان سے وہ بخوبی آشنا تھے۔ نیز مسلمانوں کا مذہبی سرمایہ اس زبان میں برابر منتقل ہو رہا تھا۔ مسلمان اساتذہ مسلم کلچر تہذیب و تمدن کے قدرتی امین تھے۔ ان اساتذہ کی موجودگی میں انگریزوں کی کوئی پالیسی کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا انھوں نے غریب مسلمان اساتذہ کو نشانہ بنایا ذرا انداز بیان ملاحظہ کیجیے

"غیر جانب داری کے اصولوں کے خلاف جس پر محکمہ (تعلیمات) کی اساس ہے یہ اسکول زیادہ تر مذہبی خصوصیات کے حامل بن گئے ہیں۔ ماتحت افسران خصوصاً مسلمان اپنے عقائد کے بارے میں بے حد پرجوش ہیں۔ محکمہ کے احکام کے خلاف ایسے ہی لوگ استاد مقرر ہوئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی جنونی کیفیت نے ان کا بحیثیت لادینی تعلیم دینے والے استاد کے تقرر کو کالعدم قرار دے دیا ہے"

انگریزی زبان کا ذریعۂ تعلیم قرار پانا	جب مسلمان اساتذہ احتساب کا شکار

ہونے لگے اور غیر مسلموں کی سرپرستی علی الاعلان ہونے لگی تو اس انتشاری فضا میں انگریزی زبان کے واسطے قدرتاً سازگار ماحول پیدا ہوگیا اور اس زبان کا پھیلاؤ شروع ہوا۔ ابتدائی تخمینوں کے مطابق انگریزی داں طلبا کی تعداد ۴۴۳۹ تھی۔ جو جلد ہی ۱۳۱۸۱ تک جا پہنچی۔

ڈسٹرکٹ اسکولوں میں انگریزی زبان کے طلبا کی تعداد ۱۳۵۵ تھی سنہ ۱۸۷۱ء میں بڑھ کر ۱۵۰۳ ہو گئی۔ انگریزی کو اس طرح ذریعہ تعلیم قرار دینے کے خلاف عوامی ردعمل بہرحال ظاہر ہوا۔ چنانچہ گورنمنٹ نے طے کیا کہ مڈل تک ذریعہ تعلیم دیسی زبان (اردو) رہے گی اور انگریزی ثانوی اور ہائر سیکنڈری میں ذریعۂ تعلیم ہوگی۔

دیسی زبانوں کی تعلیمی حیثیت سنہ ۸۲-۱۸۸۱ء

سنہ ۸۲-۱۸۸۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۶۷۲ طلبا کلاسیکل زبان بطور ایک علیحدہ مضمون کے پڑھتے تھے۔ اور یہ واحد زبان فارسی تھی۔ ورناکیولر جس کی بچوں کو لازمی تعلیم حاصل کرنا پڑتی تھی وہ اردو تھی۔ ہندی۔ دیوناگری رسم الخط کے ساتھ ذریعۂ تعلیم چند اسکولوں میں تھی۔ جو صرف ضلع ہوشیارپور اور کانگڑہ میں واقع تھے ہندی کی اس محدود تعلیم کو پورے صوبے پر محیط کرانے کے واسطے ہندوؤں نے جس قدر زور دکھایا اس کا اندازہ اگلے صفحات میں ہو سکے گا۔

سنہ ۱۸۵۷ء کا دردناک المیہ اور پنجاب

جیسا کہ ہم ابتدائی باب میں ایک جگہ لکھ چکے ہیں کہ سنہ ۱۸۵۷ء کے حادثہ فاجعہ سے بظاہر صوبہ پنجاب علیحدہ رہا لیکن خون مسلم کی ارزانی کے لحاظ سے اس صوبہ کا یوپی اور دہلی کے بعد

نمبر آتا ہے انگریزوں نے یہاں ہندوستانی اور غیر ہندوستانی کا سوال پیدا کر کے سکھوں اور ہندوؤں کی مدد سے تقریباً پچاس ہزار مسلمانوں کو شہید کیا یا جلا وطن اور تباہ و برباد کر دیا۔ پنجاب میوٹنی ریکارڈز مطبوعہ سنہ ۱۹۱۱ء کی ضخیم جلدیں اس حقیقت پر گواہ ہیں صرف لاہور شہر سے ۲۵۳۶ ہندوستانی مسلمانوں کو چن چن کر داری پار کیا گیا[1] اس وقت انگریزوں کا طریقہ یہ تھا کہ نوکری یا منصب سے علیحدہ کر کے جو لوگ اپنے اپنے گھروں کے واسطے روانہ ہوتے تھے، ان کو وفادار سکھوں کی مدد سے لوٹنے کے بعد قتل کروا دیتے تھے۔ چنانچہ محولۂ بالا رپورٹوں میں مقامی آبادیوں کے ہاتھوں قتل ہونے والوں کی تعداد باقاعدہ مرتب کی گئی ہے

پنجاب کی ثقافتی و سیاسی تاریخ

مسلمانانِ پنجاب انگریزوں اور دیگر غیر مسلموں کے یہ ظالمانہ سلوک اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اور خون کے گھونٹ پی رہے تھے۔ بعض بعض جگہ انھوں نے شدید مقابلے بھی کئے لیکن وہ خود نصف صدی سے ظلم و استبداد کا شکار ہو رہے تھے، کیا کر سکتے تھے۔ اب جو انگریزوں نے تعلیمی پالیسیوں کی آڑ میں طرح طرح کی چالیں چلنا شروع کیں تو انھوں نے پہلے سے زیادہ مذہبی جوش اور جذبے کے ساتھ بقائے باہمی اور سربلندیٔ اسلام کے واسطے کام کرنا شروع کر دیا۔ ابتداءً انگریزوں نے ۱۰ فیصد تعلیمی ٹیکس عائد کر کے دیہاتوں میں اسکول کھولنے کے منصوبے پر عمل درآمد شروع کیا۔ اس زمانے میں اساتذہ کو صرف پانچ روپے ماہوار معاوضہ ادا کیا جاتا تھا۔ یہ اساتذہ زیادہ تر مسلمان تھے اور

---

[1] نقوش ۔ لاہور نمبر۔ مقالہ پروفیسر شجاع الدین ۔ ص ۱۲۲

وہ سب کے سب اعلیٰ درجہ کی عربی فارسی نیز دیگر علوم مروجہ کے منتہی ہوتے تھے ان لوگوں کی انفرادی شخصیت انگریزوں کی تخریبی پالیسی کے بروئے کار آنے میں مانع تھی۔

اب چکر یہ پڑ گیا تھا کہ سیاسی ضرورت کے تحت انگریزوں نے اردو کو عدالتی اور دفتری زبان بنا دیا تھا لیکن بہ باطن اس کی ترقی کے خلاف تھے۔ بات یہ تھی کہ یہ زبان مسلمانوں کے کلچر، تہذیب و تمدن کی نمائندہ زبان اور نشاۃ ثانیہ کی امین بن گئی تھی پنجابی یا گورمکھی کو اس لئے اختیار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس طرح ماضی قریب کے حکمرانوں کو تقویت پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ دوسری مجبوری یہ تھی کہ بشمول پنجابی، گورمکھی، ہندی وغیرہم سب زبانیں اردو کے مقابلہ میں تہی دامن تھیں۔

اُردو کے خلاف پہلا حملہ سر رابرٹ منٹگمری کے عہد سنہ ۱۸۶۲ء میں پنجاب کے جوڈیشل کمشنر نے سرکاری دفتروں اور عدالتوں کی زبان کے بارے میں ایک عجیب و غریب سوال کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں کے سامنے پیش کیا تھا۔ یہ گویا اردو کے خلاف پہلا حملہ تھا جس سے اردو زبان بال بال بچ گئی اس سوال کے بارے میں ان اعلیٰ حکام کے جوابات کے اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ ان آرا کے مطالعہ سے اس وقت کے انگریزوں کا انداز فکر اور حکومتِ وقت کے خیالات کا پتہ چلتا ہے۔

سر رابرٹ اجرٹن "ہندی پنجاب کے لوگوں کی زبان نہیں ہے"

سر چارلس ایچی سن "میں پنجابی زبان کو ابتدائی تعلیم کے قابل نہیں سمجھتا"

مسٹر پی۔ ایس۔ میول کمشنر دہلی "دہلی، حصار، ریاستہائے ستلج میں

کچہریوں کی زبان بے شک اردو ہونی چاہیے۔ ضلع لاہور اور امرت سر میں بھی اسی فیصلہ پر عمل کیا جائے۔ کیونکہ پنجابی اردو زبان کی ایک دیہاتی بولی ہے اگر بے پڑھے لکھے اشخاص سے گفتگو کرتے وقت اردو میں سے فارسی کے بڑے بڑے الفاظ نکال دیئے جائیں تو یہ زبان پنجاب کے تمام لوگوں کی سمجھ میں آ سکتی ہے"

"اگر پنجابی کو پنجاب کی کچہریوں کی زبان بنا لیا گیا تو ہمارا نظام تعلیم سراسر فضول ہو جائے گا۔ ہم یہاں کے لوگوں کو پنجابی کے بجائے اردو لکھنا پڑھنا سکھاتے ہیں۔ علاوہ ازیں کوئی ایسی تجویز کرنا جس سے گورمکھی میں جو تحریر پنجابی ہے جان ڈال دی جائے۔ ایک پولیٹیکل غلطی ہوگی۔ اضلاع ملتان اور راولپنڈی کے واسطے بھی اردو مفید ہوگی۔ ڈیرہ جات اور پشاور کے لئے بھی کوئی دیہاتی بولی مناسب نہیں ہوگی۔ ان اضلاع میں بھی یہی براعظم ہند کی لینگوا فرانیکا اردو اختیار کرنا نہایت عمدہ ہے جو ہماری رعایا میں روز بروز مستعمل ہوتی رہی ہے۔

مسٹر نیمستہ کمشنر حصار۔ کچہری کی ورناکیولر اس عام مستعمل زبان کے مطابق ہونی چاہیے۔ جو اس صوبہ کے مختلف حصوں میں بخوبی رائج ہے"

مسٹر ایچ۔ بی ایڈورڈ کمشنر این روئے ستلج۔ "تمام پنجاب اور اس کے علاقہ جات میں سوائے پشاور اور اضلاع کوہاٹ کے کچہریوں کی زبان اردو ہونی چاہیے"۔

ضلع ہزارہ میں سکھوں کے مدت دراز کے قبضہ نے پشتو زبان کو قریب قریب نیست و نابود کر دیا ہے اور اس جگہ ناقص اردو بولی جاتی ہے۔ پس ایسی جگہ کچہریوں کی زبان عمدہ اردو ہونی چاہیے۔ اگر پشتو، پنجابی ملتانی یا کسی اور

بگڑی ہوئی بولی کو شہادت کی زبان قرار دیا جائے۔ تو جوڈیشیل کمشنروں کے پاس اپیلوں کا ہونا اور دیسی زبان میں سرکلروں کا جاری ہونا بالکل بند ہوجائے گا۔"

کپتان الفنسٹن ڈپٹی کمشنر جالندھر "اس تمام صوبے میں کچہریوں کی زبان اردو ہونی چاہئے۔ یہ زبان تمام صوبے میں سمجھی جاتی ہے اور تمام دیہاتی مدارس میں اس کی تعلیم ہوتی ہے، اور یہ زبان جدید نسل کی تعلیم یافتہ قوموں کی زبان بنتی جارہی ہے۔"

کچہریوں میں مختلف بولیاں استعمال کرنے سے نصف موجودہ عملہ موقوف کرنا پڑے گا۔ اور ایک ضلع کے دفتر کی کارروائی اور تحریر دوسرے ضلع میں جاکر بالکل نہیں سمجھی جائے گی اس سے عام لوگوں کے کام میں بڑی دقت ظاہر ہوگی اور اس کے بدلہ میں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

مسٹر فورستھ کمشنر لاہور۔ کچہریوں کی زبان سے شہادتوں کا اندراج مراد نہیں ہے۔ بلکہ اس بات سے دفاتر کی کارروائی اور اجرائے احکام وغیرہ کا تحریر کرنا بھی مراد ہے۔ یہ حکم دیناکہ لاہور میں ورناکیولر احکامات کے لئے صرف پنجابی ہی استعمال کی جایا کرے ایک بڑی دقت پیدا کرے گا۔

کرنل ہیملٹن کمشنر ملتان۔ " پشاور اور سرحدی اضلاع[ل] میں سابقہ دور میں غالباً فارسی زبان مستعمل ہوگی۔ الحاق (انگریزی اقتدار سنہ ۱۸۴۹ء)

ل صوبہ سرحد سنہ ۱۹۱۱ء تک پنجاب میں شامل تھا۔ اس لئے انتظامی اور سیاسی وحدت بھی ایک ہی تھی۔

کے تھوڑے عرصے بعد اُردو کو حکماً کچہری کی زبان بنایا گیا۔ اس فیصلے کے نتیجے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تجویز نہایت عمدہ تھی۔

"قسمت ملتان میں پنجابی کبھی تحریری زبان نہیں تھی۔ اس ضلع میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ملیگا جو پنجابی زبان کو صحت کے ساتھ کسی خط میں لکھ سکے۔ عرصہ بارہ سال سے اردو کچہریوں کی زبان ہے۔ تمام مدارس میں اس زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور تمام کاروباری امور میں فارسی کے بجائے یہی زبان استعمال ہونے لگی ہے۔ اب کوئی تبدیلی اس سلسلہ میں مناسب نہیں ہوگی۔"

کپتان میکویل ڈپٹی کمشنر گوگیرہ ، اس ڈپٹی کمشنر کا بیان بہت طویل ہے اس نے پنجابی، گورمکھی اور ہندی کی شدید مخالفت کی اور پنجابی زبان کے خلاف حسب ذیل دلائل دیئے۔

(۱) یہ کوئی زبان نہیں بلکہ بولی ہے۔

(۲) ضلع گوگیرہ میں اس کو کچہری کی زبان بنا دینا ایسا ہی ہے جیسے سومرسیٹ شائر کی دیہاتی بولی کو انگلستان کی کچہریوں کی زبان قرار دے دیا جائے۔

(۳) پنجابی بولی مطالب کے باریک فرق اور منطقی خیالات کو صحت کے ساتھ ظاہر نہیں کر سکتی۔ جس کی قانونی کارروائیوں میں اشد ضرورت ہے۔

(۴) چونکہ لوگ اردو زبان بخوبی سمجھ سکتے ہیں اس لیے پنجابی زبان کے استعمال کی ضرورت نہیں ہے۔

(۵) پنجابی زبان کا کوئی ایک معیار اور درجہ نہیں ہے۔ بلکہ دریائے

راوی اور ستلج کے قرب و جوار کی بولیوں میں بڑا نمایاں فرق ہے۔

(۶) پنجابی فارسی حروف میں نہیں لکھی جا سکتی ہے۔ اور اس کو ناگری میں لکھنے سے بہت سے اعتراضات پیدا ہوتے ہیں۔ [1]

مسٹر برانڈرتھ کمشنر راولپنڈی [2]: "اردو کے بجائے پنجابی جاری کرنے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اگر ایسی کارروائی عمل میں آئی تو وہ غیر معیاری ہوگی تمام تعلیم یافتہ قوموں کی زبان اردو ہے قانون کی نگاہ میں۔ عام مستعمل زبان" سے مراد عام تعلیم یافتہ افراد کی زبان ہونا چاہیے۔"

"اردو زبان اور پنجابی بولی میں اتنا ہی فرق ہے جس قدر کہ انگریزی زبان اور لنکا شائر اور یارک شائر کی بولیوں میں فرق ہے حالانکہ لنکا شائر اور یارک شائر کی بولیوں کو ان اضلاع کے دفاتر میں استعمال کرنے کے واسطے زور نہیں دیا جا سکتا" [1]

کرنل میجر کمشنر ڈیرہ جات۔ پنجابی مختلف اضلاع میں مختلف نوعیت سے بولی جاتی ہے۔ یہ بولی سرکاری دفاتر میں استعمال ہونے کے لائق نہیں ہے اور اردو ایک اعلیٰ درجہ کی زبان سمجھی گئی ہے۔ اور تقریباً سب ہی لوگ

---

[1] مسلمانان ہند اور مسلمانان پنجاب کا اصل جھگڑا ہی رسم الخط کا تھا۔ اگر پنجابی فارسی رسم الخط میں اس وقت لکھنا ممکن ہوتا اور انگریز بھی یہی فیصلہ سندھ کی طرح کرتے تو ممکن تھا اتنی مخالفت نہ ہوتی جتنی مسلمانوں کی جانب سے کی گئی۔

[2] لاہور ریلوے اسٹیشن کے سامنے برانڈرتھ روڈ اس شخص کے نام سے آج بھی موجود ہے

اس کو سمجھتے ہیں۔ ہمارے مدارس کے لئے یہ ایک تجویز شدہ زبان ہے، جیسی ترقی اس زبان نے کی ہے اس میں خلل انداز نہیں ہونا چاہیے دفاتر میں مقامی محاورات کو معہ ان کے اردو ترجمہ کے لکھنا چاہیے۔"

کرنل ٹیلر کمشنر پشاور۔ "قسمت پشاور کے ہر سہ اضلاع میں کچہریوں کی ورناکیولر اردو ہونا چاہیے۔ اس زبان نے ضلع کوہاٹ اور پشاور میں بہت ترقی کی ہے اور اس کی ایک بہت آسان بولی ہزارہ میں بولی جاتی ہے۔ پشتو کچہریوں کے قابل نہیں ہے۔ پشتو اور اردو کے درمیان ایک تیسری زبان فارسی ہے۔ ایسے بہت کم آدمی ملتے ہیں جو پشتو لکھ سکتے ہوں اور اگر اسی مطلب کے لئے لوگ اس زبان کو پڑھیں تو نتیجہ کے طور پر اردو زبان پھیلنے سے رہ جائے گی۔ اس طرح اخلاق و تہذیب کی درستگی بند ہو جائے گی۔"

اردو کے خلاف دوسرا محاذ سنہ ۱۸۸۲ء

سر رابرٹ منٹگمری کے عہد میں جو طوفان اٹھا تھا اس کے خلاف انگریزوں کی سرکاری پالیسی کے تحت افسران بالا نے اردو کے حق میں رائے دی۔ اگر خدانخواستہ اس وقت اردو کے خلاف فیصلہ ہو جاتا تو مسلمانان پنجاب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جاتا۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمان سکھوں کے زخم خوردہ اور انگریزوں سے ڈرے ہوئے تھے۔ لہٰذا زبان کے معاملے میں سرکاری فیصلہ ایک طرح کی قدرت کی معاونت تھی جس میں ہندوؤں کا کوئی دخل نہیں تھا۔ جب بہار، بنگال میں زبان کے مسائل ہندوؤں کے حق میں طے پا گئے، تو ان کی کوششیں

یو۔پی اور پنجاب تک اپنا رنگ دکھانے لگیں۔ اس دوران میں انگریزوں نے مسلمانوں کے مکتبی نظام کو مختلف ہتکنڈوں سے مجروح کرنا شروع کر دیا۔ سنہ ۱۸۸۴ء میں جب ہنٹر کمیشن کا قیام عمل میں آیا اس وقت میدان اچھی طرح تیار ہو چکا تھا۔ ہندوؤں میں اپنی علیحدہ قومیت کا احساس جگایا جا چکا تھا۔ سکھ بھی سنہ ۱۸۵۰ء میں انگریزی کی حمایت کر کے دوبارہ جان پکڑ چکے تھے۔ لہٰذا اردو کے خلاف زبردست محاذ بنا لیا گیا۔ گویا مسلمانوں کو تباہ کرنے کے مسئلہ پر سب متفق ہو گئے' لیکن سر سید احمد خاں علیہ الرحمۃ نے سب کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ انھوں نے یہ قانونی سوال اٹھایا کہ زبان کا مسئلہ ہنٹر تعلیمی کمیشن کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔

ہنٹر کمیشن نے جو طویل سوال نامہ جاری کیا اس کا گیارھواں سوال یہ تھا کہ:

ہنٹر کمیشن کا سوال نامہ

"کیا وہ زبان جو آپ کے صوبے میں گورنمنٹ کی طرف سے تسلیم کی گئی ہے اور آپ کے صوبہ کے اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے وہاں کے باشندوں کی اصلی بولی ہے؟ اور اگر نہیں ہے تو کیا آپ کے صوبے کے اسکول اس وجہ سے کم مفید اور ناپسندیدہ ہیں"

یہ اور اس قبیل کے دوسرے سوالات کا جواب صوبے کے جملہ اہل الرائے حضرات نے اپنی اپنی سمجھ اور خیال کے مطابق دیا تھا۔ بعض جماعتوں نے میمورنڈم بھی پیش کئے تھے۔ ان شہادتوں کے مطالعہ سے اس دور کی لسانی سیاست' کی بخوبی عکاسی ہوتی ہے۔ ذیل میں اردو زبان کے

حق میں اور اس کے خلاف خاص خاص بیانات کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

اردو کے حق میں دلائل

سردار دیال سنگھ،

(۱) یہ ہندوستان کی لنگوا فرانکا ہے۔

(۲) اس میں ترقی کی زبردست گنجائش ہے۔

(۳) یہ زمانۂ دراز سے درسی زبان ہے۔

(۴) یہ بہر حال مسلمانوں کی زبان ہے

(۵) چونکہ یہ کافی عرصہ سے منظور شدہ ہے اس لئے یک لخت اس کو متروک قرار دے دینے کے نتیجے میں الجھنیں پیدا ہونے کا امکان ہے۔

(۶) یہ اخباروں کی زبان ہے۔

(۷) یہ جلد اور آسانی کے ساتھ لکھی جا سکتی ہے۔

انجمن اخوان الصفا گجرات،

"ہندی رسم الخط کا نفاذ غیر منصفانہ تباہ کن اور غیر تسلی بخش ہوگا۔ ہم کو افسوس ہے کہ کچھ لاہور کے ہندوؤں نے بنگالیوں کے اغوا سے جو اردو نہیں جانتے ہندی بخط ناگری کے حق میں میمورنڈم پیش کیا ہے۔ ان لوگوں نے اس بات کی وضاحت نہیں کی ہے کہ ہندی بھاشا سے ان کی کیا مراد ہے۔ ان کے بیان کے مطابق یہ کبھی پنجابی بولی کبھی برج بھاشا اور کبھی سنسکرت کی قسم قرار دی جاتی ہے۔ لہذا بہت سے لوگوں نے غلط فہمی میں دستخط کر دیئے ہیں۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ ہندی نہ تو شہروں میں بولی جاتی ہے اور نہ دیہات میں اس کا چلن ہے۔ لوگ نہ اس زبان کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی اس کی تحصیل کے خواہش مند ہیں۔ صرف مذہبی تعصب اس کی تہ میں کارفرما ہے۔"

دستخط (سید برکت علی شاہ)

جوڈیشیل اسسٹنٹ کمشنر اور دوسو دیگر افراد

یادداشت باشندگان سیالکوٹ:

"یہ دعویٰ کہ پنجاب کے دیہاتی اردو نہیں جانتے قطعاً احمقانہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وکیل، مختارکار اور کچہری کے اہلکار مقدمات کی متعلقہ پارٹیوں سے اردو میں گفتگو کرتے ہیں اور یہ گفتگو وہ لوگ بخوبی سمجھتے ہیں اور اس قدر عمدگی کے ساتھ سمجھتے ہیں کہ قانونی موشگافیوں تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔"

"اگر پنجابی بولی (بخط ناگری۔ گورمکھی) کو پڑھایا گیا تو متعلقہ صوبجات سے ہمارے برادرانہ تعلقات میں فرق آجائے گا۔"

دستخط (دولت رام۔ منصف ڈسکہ۔ احمد اللہ بحکم دین ہیڈ ماسٹر مڈل اسکول ڈسکہ۔ رامچند اسسٹنٹ ماسٹر نیز تیس دیگر اصحاب

ڈاکٹر رحیم خاں:

پنجاب کے اسکولوں میں عام طور پر انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو استعمال ہوتی ہے۔ اگرچہ اردو ملک کی زبان نہیں ہے ..... لیکن اس کے

خلاف کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ سوائے ان چند اصحاب کے جو مذہبی نقطۂ نظر کی بنا پر اردو کے خلاف ہیں۔ اور ہندی نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ جو اسی قدر غیر ملکی ہے جتنی کہ اردو۔ پنجاب کے چند برہمنوں کے علاوہ کوئی ہندی بولی نہیں سمجھتا۔ اگر پرائمری اسکولوں میں تعلیم پنجابی زبان میں دی جائے تو یہ قدم یقیناً بڑی ترقی شمار ہوگا لیکن اس کے نتیجے میں اردو کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس وقت پنجابی اتنی وقیع نہیں ہے کہ اعلیٰ مضامین کا اس میں ترجمہ بغیر عربی فارسی کی مدد کے کیا جا سکے۔"

ابو سعید محمد حسین:

"وہ لوگ جو گورنمنٹ کی ملازمتوں کے خواستگار ہیں یا مڈل میں ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں، اردو کو پسند کرتے ہیں۔ باقی لوگ روزمرہ کے کاروبار میں پنجابی فارسی رسم الخط کے ساتھ پسند کرتے ہیں۔"

مسٹر جے گراہم:

"میرے خیال میں پنجابی صوبے کی دیسی زبان کہلانے کی مستحق ہے۔ لیکن ...... میں یقین نہیں کرتا کہ اردو یا فارسی کے بجائے اگر اس زبان کو رائج کر دیا گیا تو ایسے اسکول عوام کے واسطے قابل قبول ہوں گے اور ایک بھی شخص ان کی طرف متوجہ ہوگا۔"

مرزا فتح محمد بیگ قصوری: ۔ مرزا صاحب سے سوال کیا گیا کہ

۔کیا پنجاب میں کوئی قومی زبان ہے۔ اگر نہیں ہے تو جو زبان اسکولوں

میں استعمال ہوتی ہے اس کے ملک کی قومی زبان بننے کے کیا امکانات ہیں ؟

جواب۔ " آپ کو پہلے پوچھنا چاہیے کہ کیا پنجاب میں کوئی قوم آباد ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں اور مختلف بولیاں بولتے ہیں، اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ قومی زبان بولتے ہیں۔ لیکن اردو کو یہ سہولت حاصل ہے کہ یہ ہر جگہ بہت آسانی سے سمجھی جاتی ہے اور آسانی کے ساتھ ان زبانوں کے الفاظ اپنے میں ضم کر لیتی ہے جن سے اس کا واسطہ پڑتا ہے۔ حقیقتاً یہ ایک ترقی پذیر زبان ہے۔ اور امید ہے کہ یہ بین الاقوامی حیثیت کی حامل بن جائے گی۔"

ڈاکٹر گوکل ناتھ، لاہور۔

" میرا ۳۰ سال کا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ جب لوگوں کو اردو میں مخاطب کیا جاتا ہے تو وہ سادہ اردو میں جواب دیتے ہیں۔ اگر اردو عوام کی مستعمل زبان نہ ہوتی تو ہمارے اسکول (مشن) اس قدر مقبول نہ ہوتے۔"

سردار کنور سنگھ اہلوالیہ سی۔ ایس۔ آئی۔

" صوبے کی منظور شدہ اردو زبان ایک بہت ہی شائستہ اور عمدہ زبان ہے۔ یہ شہروں کے رہنے والوں اور پڑھے لکھے اشخاص کی پسندیدہ ہے لیکن اردو زبان دیہاتیوں کی زبان نہیں ہے اس لئے میری یہ رائے ہے کہ اگر اردو کی کتابوں کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان میں کتابیں بخط

ناگری گورمکھی، دیہاتی اسکولوں میں رائج کردی جائیں تو وہ زیادہ فائدہ مند ثابت ہوں گی۔"

پادری کے۔ سی۔ چیٹرجی:

"اردو بہت بڑے علاقہ میں سمجھی جاتی ہے اور بے حد فائدہ مند اور مقبول ہے۔ کیونکہ یہ عدالتوں اور جملہ دفاتر نیز کاروبار کی زبان ہے ہندی صرف ہندو تاجر اپنے بہی کھاتوں اور نجی خط و کتابت میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ ایک عوامی ذریعہ تعلیم کے طور پر آزمائی گئی اور اس میں وہ خوبیاں ثابت نہیں ہوئیں جو اس کے حامی بیان کرتے ہیں جب ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ اول اول پنجاب میں قائم ہوا تو دیہات کے اسکول اکثر دو قسم کے تھے۔ ایک فارسی ذریعہ تعلیم کے حامل اور دوسرے ہندی ذریعۂ تعلیم کے اسکول۔ ہندی کے اسکول کئی سال کی آزمائش کے بعد بند کر دیئے گئے۔ کیونکہ ان میں طلباء ہی میسر نہ آسکے۔"

مسٹر ہولڈ آئیڈر۔ ڈائریکٹر تعلیمات۔ لاہور۔

"جو زبان پڑھائی جاتی ہے، وہ اردو ہندی ہے۔ اردو زنانہ اسکولوں میں پنجابی بھی رائج ہے۔ اردو بہر حال خاص ذریعہ تعلیم ہے۔ لڑکوں کے اسکولوں میں اردو لوگوں کی بولی نہیں ہے جو مختلف جگہ پر علیحدہ علیحدہ قسم کی ہے۔ لیکن یہ عدالتوں، سوداگروں اور پریس کی زبان ہے۔ یہ زبان بہت وسیع علاقہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ دوسری زبانوں کے مقابلہ میں اور ایک عام معیاری اسکول میں پنجاب کے کاشتکار کا لڑکا اسی رغبت

اور جوش کے ساتھ اس زبان کی تحصیل کرتا ہے جیسے کوئی دہلی کے باشندے کا بچہ کرتا ہے۔"

"فارسی سکھوں کے عہد میں درباری زبان تھی اور آج کل زیر اثر ریاستوں کی زبان ہے۔ ہمارے اسکول زیادہ تر فارسی کے دیسی اسکولوں کی بنیاد پر قایم ہوئے ہیں۔ اردو قدرتی طور پر پہلے مرحلہ میں تعلیم کی خاص زبان منتخب کی جا چکی ہے۔ ابھی حال میں اردو کے بجائے ہندی کے نفاذ کے واسطے ایک ایجی ٹیشن جاری ہوا۔ چند اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو اس کارروائی کے برتنے خواہشمند ہیں اور جو ایجی ٹیشن کھڑا کیا گیا ہے اس کو لاہور میں اپنایا گیا ہے۔ یہ اب ایک طبقہ واری سکہ بن گیا ہے۔

"میرا خیال ہے کہ جب تک اردو عدالتی زبان ہے، لوگ عام طور پر اس کی تحصیل کے واسطے کوشش کریں گے۔ اردو کے بجائے ہندی کا نفاذ مسلم آبادی کے واسطے انتہائی ناگواری کا باعث ہوگا۔"

ہنٹر کمیشن کے روبرو انفرادی شہادتوں کے علاوہ ہندو مسلمانوں اور سکھوں کی شاید ہی کوئی انجمن ایسی باقی بچی ہو جس نے میمورنڈم یا دستاویز ارسال نہ کی ہو۔ اس ضخیم کارآمد مواد میں سے خاص حصوں کا آزاد ترجمہ درج ذیل ہے۔ ان سطور کے مطالعہ سے زبان کے مسئلہ پر عوامی اور سرکاری نقطۂ نظر واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔

انجمن رفاہ اسلام جھنگ:- "اردو ایک ہمہ گیر بین الصوبائی زبان ہے۔ یہ ہر

جگہ سمجھی جاتی ہے اور مسلسل ترقی کر رہی ہے اس میں کسی قسم کے تنزل کے آثار نہیں ہیں۔ اگر اس زبان کو کسی دوسری زبان سے بدل دیا جائے، تو یہ ایک غلطی ہوگی۔ اردو کے موجودہ کورس میں پنجابی زبان کو شامل کر دیا گیا۔ تو یہ بلا وجہ کا طلبا پر بوجھ ہوگا۔ اردو سب لوگوں کے واسطے قابل قبول ہے اس کے خلاف کوئی خاص طبقہ مذہبی عناد نہیں رکھتا ہے"

دستخط محمد نصیب (سکریٹری)

مولوی پیرزادہ محمد حسین:-

صوبے کی زبان اردو قرار پانے کی وجہ سے صوبے میں تہذیب، تعلیم شائستگی بہت تھوڑے وقت میں پھیل گئی۔ یہ ترقی اور کسی زبان سے ممکن نہ ہوتی۔ اس زبان کی مقبولیت اور فائدہ مندی کے بارے میں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ اگر ہم زراعتی کلاس کی غربت اور افلاس کو سامنے رکھیں جو اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے کے لئے وقت نہیں نکال سکتے تو ہم یہ دیکھیں گے کہ ایسے لوگوں کے علاقہ میں بھی اسکولوں میں طالب علموں کی تعداد غیر اطمینان بخش نہیں ہے۔ منظور شدہ زبان کے علاوہ کوئی بھی پنجابی، ملتانی، پشتو اسکول پرائیویٹ ذرائع سے قایم نہیں ہوا ہے۔ جس سے منظور شدہ زبان (اردو) کے خلاف عوامی ناپسندیدگی ثابت ہو سکے۔

اردو زبان کے خلاف دلائل

سردار دیال سنگھ:- (۱) یہ عوام کی زبان نہیں ہے۔

(۲) اس کا مطالعہ کرنے والے صرف چند اشخاص ہیں۔

(۳) جو لوگ اس زبان کو سمجھتے ہیں ان کے واسطے اس کو باقاعدہ پڑھنا بے حد ضروری ہے۔

(۴) جو لوگ اس زبان سے واقف ہیں اپنی آپس کی بات چیت میں شاذ و نادر ہی استعمال کرتے ہیں۔

(۵) علاوہ بریں جو لوگ عربی، فارسی اور اردو سے واقف ہیں آپس کی دوستانہ نیز گھریلو گفتگو میں صحیح طریقہ سے اور زیادہ دیر تک اردو کا استعمال نہیں کر سکتے۔

(۶) یہ زبان ہمارے (غیر مسلموں) کے جذبات اور خیالات کی حامل نہیں ہے۔

(۷) خود مسلمان (پنجابی) بھی خاص مواقع کے علاوہ اس زبان کو استعمال نہیں کرتے۔

(۸) چونکہ پنجاب کے مسلمانوں کی اکثریت نومسلموں کی اولاد ہے، نیز باپ دادا کے زمانے کے بہت سے رسم و رواج بھی ان میں ابھی تک محفوظ ہیں اس لئے وہ زبان بھی وہی بولتے ہیں جو ان کے بزرگ بولتے تھے۔

(۹) اردو کا تعلق بدیسی زبانوں سے ہے جبکہ ہندی کا تعلق دیسی ذرائع سے وابستہ ہے۔

(۱۰) فارسی کے حروف تہجی ناقص ہیں اور ہم لوگوں میں مستعمل جملہ آوازوں کی نمائندگی نہیں کرتے ہیں

سردار عطر سنگھ۔ اس سلسلے میں سردار عطر سنگھ نے فرمایا:

"ہماری زبان پنجابی ہے۔ موجودہ زمانے میں پرائمری تعلیم کی تکمیل میں پانچ سال کا عرصہ صرف ہوتا ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ جو کہ ایک بدیسی زبان ہے۔ میں یہ کہنے کی جرات رکھتا ہوں کہ یہی تعلیم اگر پنجابی میں دی جائے تو بچے یہی تعلیم نصف مدت میں حاصل کرلیں گے۔"

مسٹر بیڈل پاور کمشنر لاہور:

سکھ اور ہندوؤں کا خیال ہے کہ اردو سے ان کی قومیت اور اعتقادات کو دھکا لگتا ہے جس کو وہ مسلمانیت کا نشان سمجھتے ہیں۔

مسٹر بھگوان داس لاہوری۔

اگر ہندی اور سنسکرت کے عاملوں کی ہمت افزائی اسی طرح اونچے معاوضوں کی شکل میں کی جائے جیسی کہ اردو کے عاملوں کی ہو رہی ہے تو ان اسکولوں کی بڑی ترقی ہو سکتی ہے۔ غیر ملکی زبان اردو کے نفاذ کے نتیجے میں باشندگانِ پنجاب مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے کے نتیجے میں حاصل شدہ فوائد سے بہرہ مند نہیں ہو سکے ہیں۔ ہم گورنمنٹ کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر سنسکرت ہمارے اسکولوں میں عام کردی جائے تو ان اسکولوں میں زبردست ترقی ہو جائے گی۔ مہاراجہ کشمیر نے بھی ہندی اور سنسکرت اسکول اپنی ریاست میں قائم کردیے ہیں۔

مس روزگرین فیلڈ۔

میں پرزور طریقے سے اس بات کی تائید کرتی ہوں کہ گورمکھی اسکولوں میں پہلے مرحلے میں پڑھائی جائے۔ تاکہ بچوں کے دماغ کھل سکیں اعلیٰ کلاسوں میں مسلمانوں کے واسطے اردو اور ہندوؤں کے

وابستہ بندی کردی جائے۔

"کچھ لوگوں کا یہ اعتراض مجھ کو مصنوعی محسوس ہوتا ہے کہ گورمکھی میں لٹریچر موجود نہیں ہے۔ کیونکہ اگر پڑھنے والے لوگوں کی تعداد بڑھ جائے تو اس ضرورت کو پورا کرنے والا مناسب لٹریچر خود بخود پیدا ہو جائے گا۔ موجودہ زمانے کا اردو لٹریچر کیا ہے ...
... یہ کم و بیش گورنمنٹ کی سرپرستی یا مشنریوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔"

سردار دیال سنگھ کمشنر ہوشیار پور:

"وہ دیسی زبانیں جو اس ملک کی بولی تھیں قطعی تسلیم نہیں کی جاتی تھیں۔ اس کمی کی وجہ سے اسکول بہت کم فائدہ مند ہیں۔ اردو زبان کے حصول میں برسیں گزر جاتی ہیں۔ لیکن جتنی جلدی اس کی تحصیل ہوتی ہے اتنی ہی جلدی یہ بھلا دی جاتی ہے۔ کیونکہ ایک غیر ملکی زبان انگریزی آجاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھر انگریزی سے ہی کیوں نہ ابتدا کی جائے۔"

(یہ توہین انگریزوں کی منشا تھی)

آریہ سماج لاہور:

"پنجاب کے اسکولوں میں جو زبان منظور شدہ ہے اور اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے عوام کی زبان نہیں ہے۔ یہ ایک غیر ملکی زبان ہے، جو نہ ہندو بولتے ہیں اور نہ مسلمان۔ ستلج کے پار یہ عوام کی زبان ہے،

(ستلج پار کے ہندو کہتے تھے کہ ہندی عوام کی زبان ہے)
اور پنجاب کی جانب محض لوگوں کی بولی ہے۔ اس کے برعکس جو زبان پڑھائی جاتی ہے وہ یہی اردو ہے۔ پنجاب خاص میں اس کا استعمال بحیثیت دیسی زبان صرف چند مسلمان خاندانوں تک محدود ہے۔ جو شہر و قصبات میں آباد ہیں۔ اس زبان کے ۹۰ فی صد عربی فارسی الفاظ سمجھ میں نہیں آتے۔ اس لیے یہ ان لوگوں کی زبان نہیں بن سکتی جن کی زبان کا ماخذ سنسکرت ہے۔"

دستخط (شیام داس) صدر
دستخط (دوار کا داس) سکرٹری

ممبران ست سبھا سوسائٹی لاہور:

"بنگال میں بنگالی عدالتی زبان ہے۔ گجرات میں گجراتی۔ سندھ میں سندھی۔ ہندوستان میں ہندوستانی۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ پنجاب میں پنجابی (بخط ناگری) کیوں عدالتی زبان قرار نہیں دی جا سکتی"

سری گورو سنگھ (سکھ نیشنل) ایسوسی ایشن پنجاب

"اس زبان (اردو) کا بڑا حصہ عشقیہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے کچھ لوگوں کے خیال میں یہ نوجوانوں کے اخلاق بگاڑتی ہے"

اراکین انجمن پنجاب:

"جو زبان صوبے کے اسکولوں میں منظور شدہ اور ذریعۂ تعلیم ہے، وہ صوبے کے عوام کی زبان نہیں ہے۔ اور اس وجہ سے نہ تو اسکول

ہر دلعزیز ہیں اور نہ ہی فائدہ مند ہیں۔ جو قومیں اس متطور شدہ ذریعۂ تعلیم کو پسند نہیں کرتی ہیں وہ پنڈت، برہمن، کھتری وغیرہ ہیں، یہ قومیں سنسکرت اور ہندی دیوناگری حروف میں پسند کرتی ہیں۔ سکھ۔ یہ لوگ پنجابی۔ گورمکھی حروف تہجّی کے ساتھ پسند کرتے ہیں۔ اردو فارسی حروف میں وہ لوگ پسند کرتے ہیں جو عدالتوں اور دفتروں میں ملازمت کے جویا رہتے ہیں۔

دستخط (بابو نو دینا چندر رائے۔ پنڈت گورو پرشاد
پنڈت بھگوان داس)

بھائی گورمکھ سنگھ:-

"اردو ملک میں انگریزوں کے ساتھ آئی۔ اس سے قبل سکھ دربار کی زبان فارسی تھی۔ انگریزوں نے فارسی کو اردو سے بدلا جو پہلے سے ملک میں مستعمل تھی۔ اور اردو سے کہیں آسان تھی۔ دوسری طرف اردو اس قدر کار آمد ثابت نہیں ہوئی جیسی کہ توقع تھی۔"

"دوکان دار پنجابی زبان لنڈی حروف میں استعمال کرتے تھے بہت سے ہندو سکھ مسلمان گورمکھی رسم الخط میں پنجابی استعمال کرتے تھے۔ پنڈت سنسکرت اور مسلمان فارسی رسم الخط۔"

گورمکھی ہندی اختلاف۔ باشندگانِ جھنگ و مگھیانہ کا میموریل:-

"جملہ امور میں دیوناگری گورمکھی زبان پر بھاری ہے۔ گورمکھی بہرحال ہندی کی تبدیل شدہ زبان ہے اور صرف پنجاب تک محدود ہے۔ گورمکھی

رسم الخط میں پڑھے لکھے اشخاص پر وہ تمام علمی خزانے بند رہتے ہیں جو صوبہ اودھ و بہار وغیرہ میں موجود ہیں۔ جہاں کی زبان ہندی ہے"

اردو کے خلاف تیسرا محاذ

ہنٹر کمیشن کے تقریباً سترہ اٹھارہ سال بعد جب دوبارہ پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے ہندی اور گورمکھی و پنجابی کے واسطے جد وجہد شروع ہوئی تو مسلمانان ہند نے مجموعی طور پر برادران پنجاب کی حمایت کے واسطے محاذ قایم کر دیا۔ اردو کے مشہور ادیب و ناقد مولانا وحیدالدین سلیم نے "اردو ناگری بحث صوبہ پنجاب میں" کے عنوان پر محمد حسن صاحب کا ایک مضمون اپنے رسالہ "معارف" علی گڑھ میں سنہ ۱۸۹۹ء کے اواخر میں شایع کیا۔ مولانا سلیم کا تمہیدی نوٹ حسب ذیل تھا :-

"اردو ہندی یا اردو ناگری کی بحث کئی دفعہ اب سے پیشتر اضلاع شمال مغرب و اودھ اور صوبہ پنجاب میں ایک ساتھ چھیڑی گئی تھی۔ اور اگرچہ اس وقت تک یہ بحث اضلاع شمال و مغرب و اودھ ہی میں محدود ہے۔ مگر ممکن ہے پنجاب میں بھی اس کے بعد اس قسم کی درخواست پیش کی جائے۔ مضمون مندرجہ ذیل کا جو نہایت کاوش و تحقیقات سے معارف میں لکھا گیا ہے، درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے :-

صاحب مقالہ محمد حسن صاحب نے پنجاب کی مقامی بولیوں اور اردو کا موازنہ بڑی خوب صورتی سے کیا ہے :-

"لفظ پنجابی کا اطلاق محض ان چند اضلاع کی بولی پر ہو سکتا

ہے جو لاہور اور امرت سر کے قرب و جوار میں ہیں۔ لیکن یہ بولی تمام صوبہ پنجاب کی عام زبان نہیں ہے۔ میں خود از روئے پیدائش پشتہا پشت سے پنجابی ہوں مگر میں "پنجابی" کو یعنی لاہوری یا امرتسری بولی کو صوبہ پنجاب کے کسی اور ضلع شلاً راولپنڈی، ملتان، ڈیرہ جات وغیرہ کی بولیوں پر ترجیح دینے کے لئے کوئی وجہ استحقاق کی نہیں پاتا۔ اور صرف میری ہی یہ رائے نہیں ہے بلکہ اکثر میرے ہم وطنوں کی بھی یہی رائے ہے۔ میں نے تقریباً پنجاب کے تمام اضلاع میں منزل بمنزل سفر کیا ہے۔ اور بعض اضلاع میں تو دو دو تین تین دفعہ جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور ان سفروں میں میں نے ان باتوں پر غور کیا ہے کہ ہر ایک ضلع کی بولی خود بخود تبدیل ہو رہی ہے اور زبان ہندوستانی (اردو) غالب ہوتی جاتی ہے۔ اردو نہ صرف لوگوں کی باہمی کارروائیوں کے لئے آسان ذریعہ ہے۔ بلکہ ورناکیولر تعلیم کے لئے بھی اور سب بولیوں سے بہتر ہے۔

یہ امر بدیہی اور ناقابل انکار ہے کہ خود لاہور اور امرت سر کے وہ رہنے والے بھی جنھوں نے یا تو کسی قدر تعلیم پائی ہے یا مہذب لوگوں کی صحبتوں میں اٹھنے بیٹھنے کے عادی ہیں، اپنی مادری بولی کی نسبت اردو میں بات چیت کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں، یہاں تک کہ ان پڑھ پنجابی سپاہی جو عموماً ہندوستان کے تمام

صوبوں کی پولیس اور گورنمنٹ کی ہندوستانی فوج میں بھرتی ہونے والے سپاہی بھی اپنی دیہاتی بولیوں کی نسبت اردو میں گفتگو کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہر دو قسم کے لوگ شائستہ ترزبان میں گفتگو کو اپنی تہذیب اور شائستگی کی علامت سمجھتے ہیں۔ اس زمانے تک میں نے اردو کے خلاف کبھی کوئی شکایت نہیں سنی۔ اور نہ کبھی یہ سنا کہ عام طور پر لوگ لاہور اور امرت سر کی زبان کو ورناکیولر تعلیم میں داخل کرنے کے لئے اردو پر ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو کہ آجکل اس صوبہ کے اس سرے سے اس سرے تک عموماً بولی جاتی ہے یا کم از کم سمجھی جاتی ہے۔"

صوبۂ پنجاب کے واسطے اردو زبان کی افادیت واضح کرتے ہوئے محمد حسن صاحب نے اپنے محولۂ بالا مقالے میں مزید تحریر فرمایا ہے۔

"جب کبھی ہندوستان کے کسی ضلع کا کوئی شخص یورپ یا امریکہ یا افریقہ یا کسی دیگر ایشیائی ملک کے کسی باشندے سے ملتا ہے تو وہ لوگ بھی اپنے دیس کی زبان میں گفتگو نہیں کرتے۔ بلکہ اردو زبان میں ہی گفتگو کرتے ہیں۔ پس اگر عام تعلیم کے لئے ایک ایسے وسیع اور مکمل ذریعہ کو جو صرف پنجاب میں خود بخود نہیں پھیلا بلکہ ہندوستان کے اندر اور باہر تمام مقامات میں پھیل رہا ہے چھوڑ کر بجائے اس کے کسی جدید اور محدود

ذریعہ کو اختیار کر لیا جائے تو یہ کارروائی ورنا کیولر تعلیم کو جڑ
سے اکھاڑ دے گی۔ اور ہندوستان کی قوموں میں کسی قسم کی ترقی نہ
ہونے دے گی۔"

گورنمنٹ کے تمام ضوابط اور قوانین کی جلدیں اردو زبان میں
ترجمہ ہو چکی ہیں اور شمالی ہند میں تمام سرکاری دفتروں کی
کارروائی اردو زبان میں ہی ہوتی ہے اور دیگر اضلاع اور
مقامات میں بھی مختلف ریاستوں کی عدالتوں اور کچہریوں کے
کام اردو زبان اور فارسی حروف میں ہوتے ہیں جس سے ثابت
ہوتا ہے کہ حاکم و محکوم دونوں اپنے کاروبار کو اس زبان
میں بسہولت سرانجام دے سکتے ہیں۔

اس صوبے کے تمام اخبار اور رسالے تعداد میں ۳۵ ہیں
جن میں ۳۳، اردو کے ایک ناگری کا اور ایک گورمکھی کا
ہے اور اگر ان مؤخر الذکر اخباروں کی عبارت، طرز بیان
الفاظ کو سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ
ان کا قیام بھی اردو ہی کے الفاظ پر منحصر ہے۔"

نیا جال لائے پرانے شکاری:

مسلمانان پنجاب کو اپنے کلچر۔ تہذیب و تمدن اور مذہبی روایات کی حامل
زبان کی حفاظت کرتے ہوئے پون صدی کا زمانہ گزر چکا تھا۔ لیکن ابھی تک
امن کی شکل نظر نہیں آ رہی تھی۔ کچھ سازشیں نمایاں طور پر جاری تھیں تو کچھ

دروںِ خانہ کارروائیاں عمل میں لائی جا رہی تھیں، مثلاً سنہ ۱۸۵۳ء میں محکمۂ تعلیم پنجاب نے طے کیا کہ

(۱) اردو پڑھنے کے کورس میں کمی کی جائے تاکہ مقصدی تعلیم کے واسطے زیادہ وقت بچ سکے۔

(۲) پرائمری اسکولوں سے فارسی خارج کی جائے [1]

(۳) اردو میں درسی کتب سرکاری اہتمام سے چھپتی تھیں اس کی رفتار بھی تسلی بخش نہیں رہی تھی

پنجاب یونیورسٹی کے کانوکیشن میں ڈاکٹر پی۔ سی چیٹرجی (بنگالی) نے کہا کہ اردو کے بجائے پنجابی زبان کو رواج دیا جائے تو مسلمانوں کے کان پھر کھڑے ہوئے اور تازہ خطرے سے ہوشیار ہو کر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کا اجلاس امرتسر سنہ ۱۹۰۸ء میں بلایا اس اجلاس کے صدر خواجہ ناظم الدین مرحوم کے بزرگ نواب سر سلیم اللہ نواب آف ڈھاکہ تھے۔ مسلمانانِ ہند کے اس زبردست تعلیمی اجتماع نے دو رزولیوشن پاس کئے۔ جو درج ذیل ہیں،

"اس کانفرنس کی رائے میں اردو صوبہ پنجاب میں تعلیمی

---

[1] رسالہ معارف علی گڑھ بابت اپریل سنہ ۱۸۹۹ء یہ رسالہ جناب سید محمد حیدری صاحب کا عطیہ ہے

ہندوستان میں ترقی تعلیم ۱۸۹۷ء تا ۱۹۰۲ء مرتبہ آر ناتھن دفتر ناظم تعلیمات کلکتہ ص ۵

[2] ہندوستان میں ترقی تعلیم سنہ ۱۸۹۲ء تا سنہ ۱۸۹۷ء مرتبہ جے۔ سی۔ کاٹن ص ۶-۷

اغراض کے لیے بالعموم اور ابتدائی تعلیم کے لئے بالخصوص
نہایت مناسب اور موزوں زبان ہے۔ اور بحیثیت زبان درسی
جو رتبہ اسے مدارس میں حاصل ہے اسے قایم رکھنا ترقی تعلیم کے
لئے نہایت ضروری ہے۔"

اس رزولیوشن کے محرک پنجاب کے نہایت نیک نام بزرگ سر شیخ عبد القادر مرحوم تھے۔ اور تائید کرنے والے گرلس کالج علی گڑھ کے بانی شیخ محمد عبد اللہ مرحوم تھے۔

اجلاس امرتسر میں دوسرا رزولیوشن براہ راست ڈاکٹر چیٹرجی کی تجویز کے خلاف پاس ہوا۔ اس کے الفاظ حسب ذیل تھے۔

"یہ کانفرنس ڈاکٹر پی۔ سی۔ چیٹرجی۔ سی۔ آئی۔ ای کی اس
تجویز سے جو انھوں نے حال میں پنجاب یونیورسٹی کے جلسہ
کانووکیشن میں پیش کی ہے، زبان پنجابی کو اس صوبے میں
بجائے اردو کے رواج دیا جائے، اختلاف کرتی ہے
اور تجویز کو بلحاظ لغات پنجابی و اختلاف محاورہ
ناممکن العمل اور اس صوبے کے حق میں سخت مضر
سمجھتی ہے۔"

مندرجہ بالا رزولیوشن کے محرک سر محمد شفیع مرحوم اور موید بہار کے سر سید علی امام بیرسٹر تھے۔ غرض مسلمانان پنجاب ہند کی قومی بیداری کے نتیجے میں ایک زبردست المیہ سے دوچار ہوتے ہوتے رہ گئے

اگر اس وقت بنگال یا بہار کی طرح پنجابی بخط ناگری یا گورمکھی کے حق میں فیصلہ ہو جاتا تو آج مسلمانانِ پنجاب، صوبۂ بنگال و سندھ کی طرح پس ماندگی کا شکار ہوتے۔ خدا کا شکر ہے، یہ تخریبی کوششیں ناکام ہوئیں اور گزشتہ ربع صدی میں علوم مشرقیہ کے امتحانات کے ذریعہ پنجاب نے عربی فارسی اور اردو کی زبردست خدمت انجام دی۔

قیام پاکستان کے بعد پنجاب میں اردو

پاکستان میں صوبہ پنجاب ون یونٹ میں منضم ہو چکا ہے۔ مغربی پاکستان میں اردو کا دور دورہ ہے۔ لاہور قیام پاکستان سے قبل جس طرح اردو کا مرکز تھا الحمد للہ آج بھی اس کو وہی ممتاز مقام حاصل ہے۔ سارے مغربی پاکستان میں سب سے زیادہ اردو کی نشر و اشاعت کا کام لاہور کے مرکز علمی سے ہو رہا ہے۔ مستقبل قریب میں جب اردو عملاً عدالتی و دفتری زبان قرار پائے گی تو سابق صوبہ پنجاب اردو کی زیادہ بڑے پیمانے پر خدمت انجام دے گا۔ اردو اور پنجابی بولی میں اب اختلاف نہ ہونے کے برابر ہے۔ اصل اختلاف تو رسم الخط کا تھا، نہ کہ بولی کا۔ اور اب تو پنجابی ایک بولی نہیں بلکہ زبان بنتی جا رہی ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں لکھتے ہیں:

"اردو اور پنجابی کے تعلق کے بارے میں غور کرتے وقت یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی چاہیے کہ یہ دونوں کوئی علیحدہ زبانیں فرینچ اور جرمن زبانوں کی طرح نہیں ہیں۔ جہاں تک فرینچ اور جرمن زبانوں کا تعلق ہے

اغراض کے لئے بالعموم اور ابتدائی تعلیم کے لئے بالخصوص نہایت مناسب اور موزوں زبان ہے۔ اور بحیثیت زبان درسی جو رتبہ اسے مدارس میں حاصل ہے اسے قایم رکھنا ترقی تعلیم کے لئے نہایت ضروری ہے۔"

اس رزولیوشن کے محرک پنجاب کے نہایت نیک نام بزرگ سر شیخ عبدالقادر مرحوم تھے۔ اور تائید کرنے والے گرلس کالج علی گڑھ کے بانی شیخ محمد عبداللہ مرحوم تھے۔

اجلاس امرتسر میں دوسرا رزولیوشن براہ راست ڈاکٹر چیٹرجی کی تجویز کے خلاف پاس ہوا۔ اس کے الفاظ حسب ذیل تھے۔

"یہ کانفرنس ڈاکٹر پی۔ سی۔ چیٹرجی۔ سی۔ آئی۔ ای کی اس تجویز سے جو انھوں نے حال میں پنجاب یونیورسٹی کے جلسہ کانووکیشن میں پیش کی ہے، زبان پنجابی کو اس صوبے میں بجائے اردو کے رواج دیا جائے، اختلاف کرتی ہے اور تجویز کو بلحاظ لغات پنجابی و اختلاف محاورہ ناممکن العمل اور اس صوبے کے حق میں سخت مضر سمجھتی ہے۔"

مندرجہ بالا رزولیوشن کے محرک سر محمد شفیع مرحوم اور موید بہار کے سر سید علی امام بیرسٹر تھے۔ غرض مسلمانان پنجاب ہند کی قومی بیداری کے نتیجے میں ایک زبردست المیہ سے دوچار ہوتے ہوتے رہ گئے

اگر اس وقت بنگال یا بہار کی طرح پنجابی بخط ناگری یا گورمکھی کے حق میں فیصلہ ہو جاتا تو آج مسلمانان پنجاب، صوبہ بنگال و سندھ کی طرح پس ماندگی کا شکار ہوتے۔ خدا کا شکر ہے، یہ تخریبی کوششیں ناکام ہوئیں اور گذشتہ ربع صدی میں علوم مشرقیہ کے امتحانات کے ذریعہ پنجاب نے عربی فارسی اور اردو کی زبردست خدمت انجام دی۔

قیام پاکستان کے بعد پنجاب میں اردو

پاکستان میں صوبہ پنجاب ون یونٹ میں ضم ہو چکا ہے۔ مغربی پاکستان میں اردو کا دور دورہ ہے۔ لاہور قیام پاکستان سے قبل جس طرح اردو کا مرکز تھا الحمد للہ آج بھی اس کو وہی ممتاز مقام حاصل ہے۔ سارے مغربی پاکستان میں سب سے زیادہ اردو کی نشر و اشاعت کا کام لاہور کے مرکز علمی سے ہو رہا ہے۔ مستقبل قریب میں جب اردو عملاً عدالتی و دفتری زبان قرار پائے گی تو سابق صوبہ پنجاب اردو کی زیادہ بڑے پیمانے پر خدمت انجام دے گا۔ اردو اور پنجابی بولی میں اب اختلاف نہ ہونے کے برابر ہے۔ اصل اختلاف تو رسم الخط کا تھا، نہ کہ بولی کا۔ اور اب تو پنجابی ایک بولی نہیں بلکہ زبان بنتی جا رہی ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں لکھتے ہیں:

> "اردو اور پنجابی کے تعلق کے بارے میں غور کرتے وقت یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی چاہیے کہ یہ دونوں کوئی علیحدہ زبانیں فرنچ اور جرمن زبانوں کی طرح نہیں ہیں۔ جہاں تک فرنچ اور جرمن زبانوں کا تعلق ہے،

ان دونوں میں کوئی نہ کوئی حدِ فاصل ہے، جہاں ایک یکایک ختم ہو جاتی ہے اور دوسری شروع ہو جاتی ہے لیکن پنجابی اور اردو زبانیں اس طرح کی جغرافیائی تقسیم سے متاثر نہیں ہوئیں"۔ لے

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے اس سلسلہ میں مزید وضاحت فرمائی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ :-

"مغربی پاکستان کی وحدت بھی ان دونوں زبانوں کو قریب لانے میں بڑی تقویت کا باعث ہوئی ہے۔ انگریزی عملداری کی فتنہ انگیزیوں میں ایک بڑا فتنہ یہ بھی تھا کہ اس نے صوبہ پنجاب کے مختلف حصوں کی علاقائی بولیوں اور قومی زبان میں مغائرت پیدا کر دی تھی۔ مغربی پاکستان کی وحدت سے یہ مغائرت نہ صرف جاتی رہی بلکہ اس نے یہاں کے لسانی اور ادبی روابط کو مستحکم کر دیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ روابط علاقائی زبانوں اور قومی زبان دونوں کی ترقی کے جو ایک دوسرے کے اثرات کا نتیجہ ہیں بڑی حد تک ضامن ہوں گے۔" کے

لے مقالہ "اردو اور پنجابی کی بناوٹ کے بنیادی پہلو" صفحہ ۸۱ - ۸۲ کتاب LINGUISTIC

کے مقالہ "پنجابی اور اردو" بحوالہ کتاب پاکستان میں اردو۔ مرتبہ محمد طاہر فاروقی خاطر غزنوی محمد

باب ۱۰

صوبہ سندھ

سندھی زبان کی قدامت ۔ مغربی پاکستان کی جملہ زبانوں میں سندھی زبان کو اردو کے بعد اپنی وسعت، قدامت اور شیرینی کے لحاظ سے فوقیت حاصل ہے۔ زبانوں کی تشکیل کوئی ایک دن کا کھیل نہیں ہوتا۔ یہ صدیوں میں مختلف مراحل طے کر کے ایک شکل اختیار کرتی ہیں۔ سندھی زبان کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی رقم طراز ہیں،

"قدیم زمانے میں جس طرح ہندوستان میں مختلف زبانیں رائج تھیں اسی طرح اس حصہ ملک میں بھی مختلف بولیاں رواج پاگئی تھیں۔ سنہ عیسوی کے آغاز سے لے کر ایک ہزار برس کے اندر برصغیر ہند میں جو پراکرتیں رائج تھیں ان سے مختلف بولیاں مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی تھیں، چنانچہ مغرب میں اپ بھرنشر، وادیٔ سندھ میں شوراسینی دوآبہ گنگ وجمن میں (جس کا مرکز متھرا تھا۔ برج بھاشا پھیلی ہوئی تھی)۔ پھر یہ پراکرتیں مختلف بولیوں میں تقسیم ہو گئیں۔ چنانچہ شوراسینی سے گورہری، بہار اشٹری (مشرقی راجپوتانہ) نکلیں۔ مشرقی پراکرت ماگدھی، مگدھ دیس کی بولی تھی۔ جسے اب بہار کہتے ہیں۔ اور ماگدھی کا مرکز بنارس تھا۔ ان بولیوں کا تعلق سنسکرت زبان کے ساتھ بہت گہرا ہے۔ اس لئے کہ ان بولیوں نے سنسکرت

زبان کو کافی متاثر کیا۔ ویدوں کے زمانے میں یہ بولی جاتی تھی۔ آریاؤں کی زبان ویدوں کی زبان تھی۔ جس کو سنسکرت کہتے ہیں۔ لیکن آرین قوم اپنے ساتھ کوئی ایک متعین زبان لے کر نہیں آئی تھی بلکہ ان کے گروہ اور قبیلے مختلف اوقات میں یہاں آئے وہ ان کئی بولیوں کو بھی ساتھ لائے جن میں سے آج سب کی سب نابود ہو چکی ہیں البتہ ان کی قسمیں اب تک رائج ہیں۔ ان آریاؤں کی بولیاں ہندوستان کے اصلی اور قدیم باشندوں کی بولیوں سے مخلوط ہوئیں۔ اور آپس میں ایک دوسرے کے اثر قبول کرتی رہیں۔ اس لحاظ سے ان آریائی اور غیر آریائی بولیوں کی متعدد قسمیں وجود میں آگئیں۔ جو ملک کے مختلف حصوں میں بولی جاتی تھیں۔ ماہر لسانیات نے ان پراکرتوں یا بولیوں کے میل جول اور ایک کا اثر دوسری پر نیز ان کی متعدد اقسام پر مفصل بحث کی ہے۔ لیکن ہمیں یہاں صرف سندھی زبان سے بحث ہے

سندھی مغربی پنجابی اور کشمیری سے مراد کسی ایک حصۂ ملک کی زبان نہیں ہے۔ بلکہ ہر حصۂ ملک میں جو مختلف بولیوں کے بگڑنے سے زبان بن گئی تھی اس کو اپ بھرنش کہا جاتا تھا۔ اس قسم کی اپ بھرنش جو سنسکرت زبان کے بگڑنے سے بنی ہے، اسے وراچنڈا کہا جاتا ہے۔ اسی وراچنڈا سے سندھی بولیاں پیدا ہوئیں جو ملکی لحاظ سے چار شاخوں میں تقسیم کی گئی ہیں۔

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے بیان سے سندھی زبان کی اصلیت کا مسئلہ صاف نہیں ہوا ہے۔ ہمارے پاس قاضی صاحب مرحوم کا کٹا پھٹا مسودہ ہے۔ ممکن ہے صاف شدہ مقالہ زیادہ واضح اور مناسب ترتیب کا حامل ہو) پہلے انھوں نے اپ بھرنش کو شورسینی سے الگ ایک پراکرت قرار دیا ہے۔ اور اس کو

وادیٔ سندھ تک محدود رکھا ہے۔ پھر آگے چل کر تحریر فرمایا ہے :

"سندھی مغربی اور کشمیری سے مراد کسی ایک حصہ ملک کی زبان نہیں ہے بلکہ ہر حصہ ملک میں جو مختلف بولیوں کے بگڑنے سے زبان بن گئی تھی اسکو اپ بھرنش کہا جاتا ہے اسی قسم کی اپ بھرنش جو سنسکرت زبان کے بگڑنے سے بنی ہے اسے ورچنڈ کہا جاتا ہے اسی ورچنڈ اسے سندھی بولیاں پیدا ہوئیں جو ملکی لحاظ سے چار شاخوں میں تقسیم کی گئی ہیں

اس عبارت سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اپ بھرنش سنسکرت کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور یہ بگاڑ خود سنسکرت زبان میں ہوا جس سے اپ بھرنش کا ہیولا تیار ہوا۔ لیکن آگے چل کر سندھی زبان کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس میں حسب ذیل ترتیب قایم کی ہے۔

سنسکرت ۔ شورا سینی پراکرت ۔ اپ بھرنش ۔ ورچنڈا ۔ سندھی ۔

گویا اپ بھرنش کو وجود میں آنے کے لئے سنسکرت سے چل کر درمیان میں ایک اور مرحلہ طے کرنا پڑا اور وہ شورا سینی پراکرت کا تھا۔ اس انکشاف سے پہلے بیان کی ہوئی دونوں باتوں کی تردید ہو جاتی ہے۔

اول یہ کہ اپ بھرنش شورا سینی سے جداگانہ کوئی زبان نہیں تھی۔ بلکہ اس کی ارتقائی شکل تھی۔ دوم یہ کہ اپ بھرنش کا ڈھانچہ براہ راست سنسکرت سے نہیں بنا تھا۔ بلکہ ان دونوں کے درمیان شورا سینی پراکرت کا واسطہ تھا۔

دراصل برصغیر کی زبانوں کے آغاز کا مسئلہ کچھ ایسا الجھا ہوا ہے کہ بعض قرائن اور بعض قیاسات کی بنیاد پر مختلف نظریات قایم کئے گئے ہیں اور جب ان

سب کو سامنے رکھ کر کوئی شخص اس سلسلہ میں کوئی گفتگو کرتا ہے تو وہ خود مغالطوں میں پھنس جاتا ہے اور تضاد بیانی کے بعض عجیب و غریب نمونے دیکھنے میں آتے ہیں اس سلسلہ میں سب سے زیادہ سلجھی ہوئی بحث یہ ہے کہ ابتداً سنسکرت زبان نے برصغیر کے مختلف حصوں کی بولیوں کے ساتھ مل کر جو شکلیں اختیار کیں وہ پراکرتیں کہلائیں ان ہی پراکرتوں میں ایک شورسینی پراکرت بھی تھی، جس کا علاقہ بے حد وسیع تھا۔ شورسینی نے مقامی اثرات کی بنا پر پھر مختلف روپ بدلے یہی بدلے ہوئے یا بگڑے ہوئے روپ اپ بھرنش کہلاتے ہیں۔ ان میں وسطی اپ بھرنش سے ہندی۔ گجراتی دکنی اور اردو زبانیں وجود میں آئیں اور شمال مغربی اپ بھرنش سے پنجابی، ملتانی اور سندھی پھر سندھی زبان کی پانچ شکلیں ہوگئیں۔ (۱) وچولی (۲) سرکی (۳) لاڑی (۴) تھریلی (۵) کچھی (نوٹ مرتبہ ثنا الحق صدیقی۔ ایم اے)

(۱) وچولی جو وسط ہند میں بولی جاتی ہے، (۲) سرائیکی جو ملتان میں بولتے اور تھریلی جو تھر کے علاقہ میں رائج ہے۔ کچھی ... کچھ کاٹھیاواڑ کے علاقے میں بولی جاتی ہے۔ خاص صوبہ سندھ میں جو زبان رائج ہوئی وہ بھی وچولی سندھی ہے جو آج تک بولی جاتی ہے اور ایک عرصے سے تحریر میں بھی آچکی ہے اس تمام بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سندھی زبان کی اصل قدیم پراکرتوں اور سنسکرت سے تعلق رکھتی ہے اور آریوں کی آمد سے پہلے جو پراکرت تیار ہو رہی تھی اسے پہلے شوراسینی نام دیا گیا اور پھر اسی سے اپ بھرنش بنی اور اس کی ایک خاص قسم وراچنڈا سے

سندھی نکلی اور اس کی بھی ایک خاص قسم کی زبان وچولی اور تھریلی۔ گویا موجودہ سندھی کی ماں ہے۔

سندھی زبان کا نقشہ حسب ذیل ہے:

سنسکرت۔ شوراسینی پراکرت۔ اپ بھرنش۔ ولاچنڈا۔ سندھی۔

وچولی — تھریلی — سرائیکی — کچھی

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم کے مندرجہ بالا بیان کی تائید پیر حسام الدین راشدی نے اپنے کتابچہ "سندھی ادب" کے پہلے باب میں فرمائی ہے۔

خلاصۂ کلام سرزمین سندھ مسلمانوں کے قبضے سے قبل ہی لسانی تبدیلیوں سے متاثر ہونا شروع ہو چکی تھی۔ لیکن جب مسلمان فاتحین یہاں آئے تو نقشہ ہی بدل گیا۔ کوئی گوشۂ حیات ایسا نہیں بچا جس میں انقلابی تبدیلیاں رونما نہیں ہوئیں۔ رسم ورواج، گفتار وکردار، لباس و قیام غرض ہر شعبۂ حیات متاثر ہوا۔ ہزاروں عربی کے الفاظ جذب ہو گئے۔ مہاشے عبدالکریم لکھتے ہیں:

۔ مسلمانوں نے پہلی صدی ہجری میں سندھ فتح کیا اس دور سے لے کر آج تک بڑے بڑے انقلاب آئے مگر سندھ میں عربی خط کو دنیا نہ مٹا سکی محمد بن قاسم سے سومروں کے آخری دور تک سندھ کی سرکاری زبان عربی رہی۔ سمون کے دور سے فارسی نے اس کی جگہ لے لی۔ میروں کے

کے آخر دور تک سندھ کی سرکاری زبان فارسی رہی۔ اس کے بعد انگریزوں کا دور شروع ہوا۔ انگریزوں نے فارسی کو ختم کر کے سندھی زبان کو رواج دیا۔ مہاشے عبدالکریم اپنی کتاب "تاریخ سومرۂ سندھ" میں لکھتے ہیں:

"موجودہ رسم الخط عربی نسخ ہے۔ یہ انگریزی دور میں کمشنر سندھ سر بارٹل فریر کے مقرر کردہ ایک کمیشن کے ذریعہ سنہ ۱۸۵۲ء میں طے کیا گیا تھا۔ اس موقع پر رجعت پسند ہندوؤں نے دیوناگری حروف کے حق میں آواز بلند کی تھی، مگر ان کی یہ آواز اتنی کمزور تھی اور دلائل اتنے بے جان تھے کہ مسلمانوں کے علاوہ ہندو اکثریت نے بھی اس کے مقابلے میں عربی نسخ کے حق میں فیصلہ دیا۔ اسی دن سے لے کر آج تک ہمیں دیوناگری کے حق میں کوئی آواز سنائی نہیں دیتی"

ابتداءً سندھی بولی ایک قلیل الاستعمال، محدود رسم الخط خداوادی تک محدود رہی۔ یہ رسم الخط سندھ کے ہندوؤں نے اپنایا تھا۔ مسٹر برسٹن نے اپنی مشہور کتاب "ذاتی مشاہدات سندھ" (مطبوعہ سنہ ۱۸۴۳ء صفحات ۲، ۷، ۳) میں لکھا ہے کہ تالپوری گورنمنٹ کی جملہ خط و کتابت فارسی زبان میں ہوتی ہے۔ اور کہ سندھی زبان سنسکرت کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ گجرات تک بولی جاتی ہے اس کا رسم الخط مخصوص ہے جو خداوادی کہلاتا ہے ہندو اپنا جملہ حساب کتاب اس میں رکھتے ہیں۔ بلوچیوں کی اپنی علیحدہ مخصوص بولی ہے جس میں پشتو کے بہت اثرات ہیں جو افغان بولتے ہیں

لیکن تحریر کی زبان نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کی گرامر ہے۔ سندھ میں پنجابی بولی تاجر ملاح وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔

سندھی زبان اور انگریز:

عربی کے ہزاروں الفاظ سندھی زبان میں موجود ہیں جن کی وجہ سے اردو اور سندھی میں اور قربت پیدا ہوگئی ہے۔ چونکہ سندھی زبان کے حسن و قبیح پر بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ فی الوقت ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ سابق صوبہ سندھ میں انگریزوں کے آنے سے قبل دفتروں میں کون سی زبان رائج تھی۔ اور انگریزوں نے اقتدار اعلیٰ حاصل کرنے کے بعد کیا لسانی پالیسی اختیار کی۔ نیز نو وارد انگریزوں کے سندھی زبان کے بارے میں کیا خیالات تھے۔

کمپنی کے ابتدائی دور میں جو انگریز اعلیٰ افسران وارد سندھ ہوئے ان میں لفٹنٹ آر برٹن کا اعلیٰ مقام ہے۔ کیپٹن اسٹیک نے سندھی زبان کا بہت قریبی مطالعہ کیا اور اس کی لغت بھی تیار کرنے کا بیڑہ اٹھایا لیکن مکمل نہ کر سکا۔ ان دونوں عالم انگریزوں کے خیالات میں علمی میدان میں کم نقط کی حد تک اختلاف تھا۔ جس کی تفصیل آگے چل کر بیان کی جائے گی لفٹنٹ آر برٹن نے سندھی زبان کے بارے میں اپنے خیالات حسب ذیل الفاظ میں بیان کئے ہیں:

"سندھی زبان ہندوستان میں بولی جانے والی ہر ایک زبان سے مختلف ہے۔ یہ کئی طرح سے بولی جاتی ہے۔ کاٹھیاواڑ سے لے کر شمال میں پہاڑوں

کے دامن تک اور مشرق میں راجپوتانہ، کچھ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی گرامر کا ڈھانچہ مختلف الوضع ہے۔ اس زبان کے اسم اور صفات کا تعلق سنسکرت زبان سے ہے جبکہ فعل اور متعلقات فارسی طرز کے مطابق ہیں"

اس زبان میں جو بھی لٹریچر پایا جاتا ہے وہ محض مذہبی نظموں پر مشتمل ہے۔ اس کے ابتدائی لٹریچر میں عربی سے ترجمہ شدہ اخلاقی کہانیاں مشہور ہیں۔ یہ منظومات قدرتی کیفیت کی حامل ہیں۔ لیکن ذرا بے ڈھنگے انداز سے مرتب ہوئی ہیں۔ یہ سب کی سب سندھی مسلمانوں کی ترتیب دی ہوئی ہیں۔ اور عربی خط نسخ میں لکھی گئی ہیں۔ یہ لٹریچر حقیقتاً بہت دقیق ہے اور مشکل ہی ہندو منشی اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سندھ کے یورپین اس ادبی سرمایہ سے اس قدر کم واقف ہیں (اس زمانہ میں انگریز صرف ہندو منشی ملازم رکھتے تھے۔ . . . ہندوؤں کے قطعی مختلف حروف تہجی ہیں اور ان کا لٹریچر اسی رسم الخط میں تحریر کیا ہوا ہے۔ خلاصہ کلام علم کی جس شاخ کو سندھیوں (مسلمانوں) نے وزن دیا اور اس میں ترقی حاصل کی۔ وہ عربی ہے۔ سندھی اکثر فارسی زبان سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں"۔ [۱]

سنہ ۱۸۳۷ء میں انگریزوں نے اپنی قلمرو میں اردو کو دفتروں اور عدالتوں کی زبان بنا دیا تھا۔ اس لئے قدرتاً یہ خیال تھا کہ صوبہ سندھ میں بھی یہی پالیسی اختیار کی جائے گی۔ لیکن صرف چند سال بعد کمپنی نے کچھ دوسری پالیسیوں پر عمل شروع کیا۔ انگریزوں کی پالیسی کا اندازہ مسٹر اسٹیک کمشنر سندھ کے اس خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۲۸ اگست سنہ ۱۸۴۸ء کو تحریر کیا تھا۔

۔ ان مقامات پر جہاں ہم عوام کی مرضی سے حکومت نہیں کرتے، ہماری سب سے بڑی پالیسی یہ رہی ہے کہ "لڑاؤ اور حکومت کرو۔" .. اس لئے اگر ایک زبان (ہندوستانی یا اردو) کو سندھ کی دفتری زبان بنانا ممکن بھی ہو تو اس سے ہمیں فائدہ پہنچنا مشتبہ ہے۔"

ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی حکومت نے یہ طے کر دیا کہ سندھ میں سندھی ہی رائج کی جائے۔ لیکن اب انگریزوں کو یہ فکر ہوئی کہ سندھی عربی رسم الخط میں اگر لکھی گئی تو سندھی مسلمان اردو داں طبقہ سے قریب ہو جائیں گے اس مسئلہ پر سندھی زبان کے بنیادی "مربیوں" کے درمیان زبردست رسہ کشی شروع ہو گئی۔ برٹن اور اسٹیک کے بیانات برطانوی ریکارڈ میں محفوظ ہیں مقاصد دونوں کے ایک ہی تھے۔ لیکن مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے برٹن کا رویہ ذرا مناسب تھا۔ کیونکہ وہ عربی رسم الخط کے حق میں تھا۔ لیکن بمبئی کے گورنر لاک لینڈ نے اسٹیک کی ناگری رسم الخط والی تجویز کو انگریزی سیاست کے عین مطابق سمجھتے ہوئے اپنی سفارش کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو ارسال کر دیا لیکن سنہ ۱۸۵۲ء میں بورڈ آف ڈائریکٹرز نے برٹن کی تجویز منظور کر لی اور اس طرح سندھی زبان فارسی رسم الخط میں صوبہ سندھ میں کمپنی کی عدالتی اور دفتری زبان قرار پائی۔

مسٹر ایلیس کا کردار

جب کمپنی کا فیصلہ سنہ ۱۸۵۲ء میں کمشنر سندھ کو بھیجا گیا اس وقت تک اسٹیک کا انتقال ہو چکا تھا، برٹن کو برطانوی حکومت نے جبریہ واپس بلا لیا تھا۔ اب یہ کام کلکٹر کراچی مسٹر بیرو ایلیس کو سونپا گیا۔ کلکٹر نے

مولوی ابوالحسن مرحوم کو سندھی زبان کے حروف تہجی بنانے کا حکم دیا اس سلسلہ میں ایک کمیٹی بھی قائم کی گئی۔ خلاصۂ کلام عربی کے ۲۹ حروف کو بنیاد بناکر سندھی کے ۵۲ حروف بنائے گئے۔ حروف تہجی کا اصلی کارنامہ مولوی ابوالحسن کا ہے۔ بقول پروفیسر شبیر احمد صاحب اس کا سہرا ایلیس کے سر پر باندھا جاتا ہے۔ مسٹر ایلیس نے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے حکم کی تعمیل کے ساتھ ساتھ اسٹیک کے تیار کردہ بنیوں کے سندھی کے حروف بھی رائج کرنے کی کوشش کی اور اس کا نام ہندو سندھی رکھا لیکن یہ کارروائی کامیاب نہ ہو سکی [1]

اکابر سندھ کے بیانات:

سندھی حروف تہجی کی ایجاد اور فارسی عربی تعلیم کے خلاف سرکاری احکام کے نفاذ کو سندھ کے اہل الرائے اور صاحب نظر افراد نے شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ ذیل میں ہم چند بیانات پیش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے پیر حسام الدین راشدی کا بیان ملاحظہ کیجئے:-

"ویسے تو انگریزوں کے قدم ساحل سندھ پر کلہوڑوں کے زمانے میں پڑ چکے تھے۔ لیکن ان کی مستقل حکومت تالپوریوں کے اختتام سے شروع ہوئی۔ جبکہ سنہ ۱۸۴۳ء میں تالپوریوں کی توڑے دار تفنگوں نے میانی کے میدان میں سر چارلس نیپیر کی توپوں سے شکست کھائی

انگریزوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر عوام سے براہ راست تعلق پیدا کرنے کے لئے فارسی کی عمل داری دفاتر سے اٹھادی

اور سندھی زبان کا سکہ چلا دیا۔[۵]

شیخ صادق علی مرحوم وزیر خیرپور میرس کی تقریر شیخ صادق علی مرحوم نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے اجلاس کراچی سنہ ۱۹۰۷ء میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

"جب اس صوبے کی عنانِ حکومت سرکار انگریزی کے ہاتھ میں آئی اور گورنمنٹ یہاں کی درس گاہوں کی طرف متوجہ ہوئی تو اس نے یہ فیصلہ کیا کہ پرانے طریقۂ تعلیم کو اڑا دیا جائے اور ان اصلاحوں کو اسی طور پر سندھ میں بھی رواج دیا جائے جس طرح دیگر حصص ہندوستان میں جہاں انگریزی طریقہ تعلیم مدت سے جاری ہے"

اول تجویز کی گئی کہ سندھی زبان کے حروف ابجد بنائے جائیں نیز سندھی زبان کی صورت خطی مقرر کی جائے۔ ایک طویل مباحثہ کے بعد جس کا ذکر مسٹر ایلس نے اپنی رپورٹ کے فقرہ ۳۳ میں کیا ہے عربی صورت خطی تجویز کی گئی اور سندھی زبان کی تعلیم لوگوں میں ملازمت حاصل کرنے کا ذریعہ ہونے کے سبب عام ہوگئی اور اسکولوں میں طلبا کی تعداد بہت بڑھ گئی تو تعلیم فارسی و عربی اسکولوں سے

---

[۵] العلم۔ کراچی بابت جولائی تا ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا

خارج کردی گئی۔ یہ تبدیلی جو طریقۂ تعلیم میں ہوئی اس کا تباہ کن نتیجہ یہ ہوا کہ ان مسلمان مولویوں میں جو جوش ہمدردی و خیر خواہی تھا، بالکل زائل ہو گیا۔ جو فارسی علم و ادب کی تعلیم مذہبی اخلاقی اور دنیاوی امور کے لئے دیا کرتے تھے۔

بہت سے ملّا اور مولوی جن کے مکاتب سرکاری اسکولوں میں تبدیل کئے گئے تھے، یا جو گورنمنٹ اسکولوں میں عربی یا فارسی کے معلّم مقرر کئے گئے تھے، ان سے شرط ہوئی کہ ان اسکولوں میں تعلیم دینے کے اور اپنے آپ کو قابل بنانے کے لئے امتحان پاس کریں۔ جو وہ پاس نہ کر سکے اور آخر کار نوکریوں سے علیحدہ کئے گئے۔ ایسے حالات میں جبکہ گورنمنٹ کو مسلمانوں کی مذہبی اخلاقی اور دینی تعلیم کے برخلاف طریقۂ تعلیم بدلنا پڑا تو مسلمان ملاؤں اور قاضیوں کے لئے یہ امر ناممکن ہو گیا کہ اپنے خانگی مکاتب ان سرکاری درس گاہوں کے مقابل میں دیر تک قایم رکھ سکیں۔ جن میں طلبا کی تعداد بڑھ جانا ہر ایک سرکاری عہدہ دار و جاگیردار اور زمیندار کا فرض تھا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خانگی مکاتب جو ٹھٹھہ و دیگر مقامات پر تھے جن کا ذکر اسسٹنٹ کمشنر نے اپنی رپورٹ میں کیا تھا جلدی ہی نیست و نابود ہو گئے۔ موجودہ مکاتب جو مولوی اور

ملاؤں نے قائم کر رکھے ہیں (سنہ ۱۹۰۶ء) وہ ان پرانے مکاتب فارسی اور عربی کے (برائے نام) نمونہ ہیں۔ جن میں کبھی فارسی اور عربی علم وادب ان کی ذاتی قدر و منزلت کے سبب تحصیل کیا جاتا تھا، جس کی تحصیل اب بھی مسلمانوں کی اخلاقی اور مذہبی تربیت کے لیے نہایت ضروری ہے۔ چونکہ سندھی زبان میں علم وادب موجود نہ تھا جو فارسی اور عربی علم وادب کے بجائے رائج ہوتا۔ اور انگریزی زبان چونکہ غیر زبان تھی اور مسلمانوں کو اس کی تحصیل پر مذہبی اعتراض تھا اس لئے فارسی اور عربی تعلیم گورنمنٹ اسکولوں سے خارج کرنے پر جو یہ خیال کیا گیا تھا کہ سندھی اور انگریزی تعلیم مسلمانوں میں ضرور رواج پکڑے گی وہ خیال موہوم ثابت ہوا۔ انگریزوں نے عربی و فارسی کے اسکول عام طور پر بند کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ باقی ماندہ سرکاری اسکولوں میں بھی عربی و فارسی کی تحصیل کرنے والے طالب علموں پر فیس عاید کر دی جو اس زمانہ میں عوام المسلمین کی ناداری کے لحاظ سے بہت سخت بات تھی۔ مسٹر الیس کا اس ضمن میں ارشاد ہے کہ سنہ ۱۸۵۷ء سے عربی اور فارسی کی تعلیم کے لئے فیس مقرر کی جائے اور یہ شرط ہو کہ جب کوئی طالب علم سندھی زبان میں پوری لیاقت کا ثبوت دے تو اسے فیس سے مستثنیٰ

کیا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ صرف وہ لوگ فارسی پڑھیں گے جو فارسی کو بہ خیال اس کے علم و ادب کے سیکھنا چاہتے ہیں یا بطور ایک کمال کے حاصل کرنا چاہتے ہیں اور بہت سے لوگ جو اب فارسی اس خیال سے سیکھتے ہیں کہ ان کو سرکاری نوکریاں ملیں وہ سندھی سیکھنے کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ لیکن جب تک صرف سندھی ہی سرکاری دفاتر کی زبان نہ ہوگی تب تک جس اسکول میں صرف سندھی سکھائی جاتی ہو اس کے بارونق ہونے کا بہت کم امکان ہے۔

شیخ صادق علی مرحوم نے آگے چل کر بیان کیا: کہ

مسلمانوں کے بچے بے علم رہ گئے

جن لوگوں کو سرکاری ملازمت میں داخل ہونے کی ضرورت نہ تھی یا جو سرکاری ملازمت کے خواہاں نہ تھے، وہ گورنمنٹ اسکولوں میں نہیں جاتے تھے اور عربی و فارسی علما کے کم ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر مسلمانوں کے بچے بے علم رہ گئے سندھی زبان میں جو پبلک سروس کلاس تھرڈ گریڈ کا

مسلمان اور ملازمتیں

امتحان ہوتا ہے اب جس کے ذریعہ (۱۹۰۶ء-۰۷ء) سرکاری نوکریوں میں ملازمان ماتحت کی بھرتی کرتے ہیں اس کی کچھ قدر و منزلت نہیں۔ کیونکہ ان ہندوؤں کی تعداد جنہوں نے اسکول فائنل اور بی اے کے امتحانات پاس کئے ہیں یا جو اب پاس کر رہے ہیں اور جو سرکاری نوکریوں کے

لئے مل سکتے ہیں بہت زیادہ ہے اور سال بہ سال بڑھ رہی ہے۔ اور چونکہ ہندو گریجویٹ بہت ہوتے جارہے ہیں نیز بیس روپے یا اس سے بھی کم پر نوکریاں قبول کرلیتے ہیں۔

ڈاکٹر سداگرانی کا بیان

سندھ کے فارسی گو شعرا کے تذکرے کے افتتاحی باب میں ڈاکٹر سداگرانی نے صحیح لکھا ہے کہ:

"اس صدی کے آغاز میں نئی سوشل سیاسی اور اقتصادی قوتوں کے بروئے کار آنے کے نتیجے میں مغرب کے اثرات اس علاقہ (سندھ) پر چھاگئے، جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ پرانا علمی ماحول جس میں متعدد بلند پایہ عالم پیدا ہوئے اور جو غیر مناسب فضا کے باوجود کسی نہ کسی طرح چل رہا تھا سیلاب فنا میں بہ گیا۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں فارسی میں ہفت روزہ اخبارات کے بند ہونے نیز صوبائی حکومت کی زبان (سندھی وانگریزی) تعلیمی زبان قرار پانے کے نتیجے میں فارسی کی ثانوی حیثیت قرار پاگئی۔

فارسی زبان کا خاتمہ

بالآخر سندھ کے عالم بھی اس زبان کی طرف سے لاپرواہی برتنے لگے اور اس طرح سندھ کے اس تابناک علمی دور کا خاتمہ ہوگیا۔ جو فارسی زبان کی حکمرانی کی بدولت جاری تھا۔

امیران سندھ کا خاتمہ سنہ ۱۸۴۳ء میں ہوا۔ فارسی زبان دفتروں سے عملاً سنہ ۱۸۵۲ء سے خارج ہوئی۔ لیکن اس کا حقیقی خاتمہ سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد ہی ہو سکا۔ ایک وہ دور تھا کہ مسلمانان سندھ اس شایستہ اور شیریں زبان پر کامل عبور رکھتے تھے، اور فارسی علم و ادب پر عبور، معاشرے میں باعزت مقام دلانے کا ذریعہ بنا ہوا تھا امیر و وزیر سب ہی علمی صحبتوں اور شعر و شاعری کے شوقین تھے۔ میر فتح علی خاں نے میر عظیم الدین عظیم کو ملک الشعراء کا خطاب دیا تھا۔ خود میر کرم علی خاں، میر مراد علی خاں صاحب دیوان فارسی شاعر تھے۔ میر ضیاء الدین، غلام علی مائل، منشی صاحب رائے آزاد۔ نواب ولی محمد خاں لغاری، مرزا مظہر طباطبائی۔ اخوند نور محمد ہالائی مرزا خسرو بیگ، میر صابر علی اخوند۔ محمد قاسم ہالائی، محمد رفیق و سید علی مشتاق۔ میر ہوشنک افغان۔ مخدوم نور محمد بولکائی کے نام آج تک اہل علم فراموش نہیں کر سکے ہیں۔

ڈاکٹر برنس کے مشاہدات ۱۸۲۸ء

ڈاکٹر برنس نے اپنے مشہور سفرنامے میں امیران سندھ کے علمی ذوق کا مشاہدہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"میر نصیر شاعر تھا اس نے اپنے کلام کی ایک کاپی جس کا نام دیوان جعفری تھا، مجھ کو عنایت کی۔ کچھ عرصے بعد مصنف کو اس دیوان کی ایک مرصع کاپی بھی ہمدست ہوئی۔ جو میر نصیر کے دستخطوں سے مزین تھی۔

"دیوان جعفری کے بعد دیگر امیروں نے حافظ اور سعدی کے

مرتب اڈیشن پبلش کئے۔ جو کئی نسلوں سے کلہوڑوں (تالپوریوں) کی لائبریری میں چلے آرہے تھے۔

میر اسمٰعیل جس کی حیثیت دربار سندھ میں وزیر خارجہ کی سی تھی اس کے بارے میں ڈاکٹر برنس نے تحریر کیا ہے کہ

"وہ ایک قابل احترام، وجیہہ اور پر وقار شخصیت کا مالک ہے شائستہ گفتگو کا ملکہ رکھتا ہے۔ عمر تقریباً پچاس سال ہے۔ وہ صرف فارسی میں گفتگو کرسکتا ہے سندھی زبان سے ناواقف ہے۔"

مرزا خسرو بیگ کے بارے میں ڈاکٹر برنس کا تاثر ہے کہ وہ

"سندھ میں فارسی غزلیات کا خالق سمجھا جاتا ہے" [۱]

اب جب کہ سندھ میں نہ فارسی زبان رہی نہ فارسی دانی نہ سخن فہمی تو کون موازنہ کرسکتا ہے کہ مرزا خسرو بیگ کا سندھ کی فارسی غزلیات کے میدان میں کیا مقام تھا۔

تبدیلیٔ زبان کے بارے میں سرکاری فیصلے کی حمایت میں بیانات

مولوی خداداد خاں کا بیان

مولوی خداداد خاں صاحب "لُبِّ تاریخ سندھ" میں لکھتے ہیں:

"سالہائے گذشتہ میں ملک سندھ کے رہنے والوں کی سہولت کی خاطر سندھی حروف کو عربی حروف میں تبدیل کیا گیا اور کتابت و تحریر میں اصلاحات کی گئیں۔ نیز ملک سندھ کے شہروں میں

مدارس و مکاتب قایم کئے گئے اور عام لوگوں کی تعلیم کو سندھی زبان میں رواج دیا گیا سرکاری دفاتر جن کی زبان فارسی تھی بدل کر سندھی زبان اور تحریر دفتروں میں جاری کردی گئی۔ اس طرح تحریر و تقریر کے واسطے زبان کے استعمال میں جو سہولت باشندگان سندھ کو حاصل ہوئی اس پر وہ بہت خوش ہوئے اس مبارک کام میں زیادہ تر مشورہ اور تجاویز مسٹر الیس کمشنر سندھ کی جانب سے تھیں۔

یہ امر واقع ہے کہ سندھ کے ہندو یا بالفاظ دیگر تجارتی طبقہ بہت ہی اکمرا قسم کا رسم الخط استعمال کرتا تھا۔ جو بعض اوقات ایک ہی شہر میں مختلف الوضع ہوتا تھا اور دوسرے ہندو اس کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ یہ رسم الخط ان حروف تہجی سے ملتا جلتا تھا جو ہندوستان بھر کے مہاجن اور تاجر اپنے حساب کتاب اور ہنڈیوں کے سلسلے میں استعمال کرتے تھے لیکن اس رسم الخط میں جو تقریباً سترہ قسم کا تھا۔ کسی قسم کا ادبی یا تعلیمی مواد موجود نہیں تھا۔

مسلمانوں میں جو سندھ کی آبادی کا غالب جزو ہیں۔ ان میں جو لوگ بہت ہی تہذیب یافتہ ہیں لکھ پڑھ سکتے ہیں اور وہ بالاتفاق فارسی اپنی نجی خط و کتابت میں استعمال کرتے ہیں اور جملہ تعلیم یافتہ صاحب اثر اصحاب سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ فارسی میں گفتگو اور خط و کتابت کر سکیں۔ سندھی زبان فارسی اور عربی الفاظ سے بہت زیادہ بھرپور ہے۔ اور اسی واسطے عوام کی بھلائی کیلئے علی العموم اور مسلمانوں کے مفاد کے تحت بالخصوص سندھی حروف تہجی بر عربی و

فارسی زبان پر مشتمل ہیں۔ عربی حروف میں رسم الخط سر بارٹل فریر نے ایجاد کیا جو اب گورنمنٹ کے دفاتر اور نجی خط و کتابت میں عام طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ بعد کو مزید اصلاحات نافذ کرنے کے جذبے کے تحت نیز ہندوؤں کے فائدے کے خیال سے ہندو سندھی حروف تہجی جو تمام تجارت پیشہ اشخاص سمجھ سکیں۔ دیوناگری سنسکرت رسم الخط میں جاری کیا گیا سنہ ۱۸۶۲ء - ۶۳ء میں ہندو سندھی ٹائپ تیار کیا گیا جس میں درسی کتب تیار کی گئیں۔ اور کچھ اسکول قائم کئے گئے جن میں بنیا سندھی جیسی کہ عام طور پر بولی جاتی تھی جاری کی گئی۔ لیکن عام نتیجہ اس جد و جہد کا غیر اطمینان بخش نکلا عربی سندھی اب عام طور پر مستعمل ہے اور ہندو سندھی یا بنیا سندھی تقریباً کلی طور پر متروک ہو چکی ہے۔ صرف چند شہروں میں مثل شکارپور جہاں ہندوؤں کی غالب اکثریت ہے باقی ہے۔ قوم پرست ہندو ابھی تک (۱۹۱۵ء - ۱۶) بنیا سندھی اسکول قائم کئے ہوئے ہیں۔

سنہ ۱۹۱۰ء سے کوئی کتاب اس رسم الخط میں نہیں چھاپی گئی ہے اور سوائے حساب کتاب کے باقی میدان عربی سندھی کے ہاتھ میں آگیا ہے [1]

سندھ سے فارسی کا دیس نکالا

صدیوں سے سندھی مسلمان اپنے دیگر ہم وطنوں کی طرح عربی فارسی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس لئے یکا یک پوری قوم کی عادت اور ضمیر کو بدلنا آسان

---

[1] خود نوشت سوانح حیات سیٹھ ناؤمل ہوتی چند (سنہ ۱۸۰۴ - ۱۸۷۰) مرتبہ راؤ بہادر الوڑمل ٹیکم داس بھوجوانی۔ حواشی و تعلیقات سر ایون جیمس کمشنر سندھ سنہ ۱۸۹۱ تا ۱۸۹۱ء مطبوعہ سنہ ۱۹۱۵ء

کام نہیں تھا۔ لہٰذا انگریزوں نے بڑے سلیقے سے آہستہ آہستہ قوم کا مزاج بدلا۔ مثلاً سندھی بچوں کو فارسی زبان کی تعلیم سے ہٹانے کے سلسلے میں مسٹر ایلس نے لکھا ہے کہ

"چونکہ فارسی زبان میں علم و ادب ہے نیز یہ زبان سرکاری دفاتر کی زبان ہے اور سالہا سال سے ملک سندھ میں جاری رہی ہے اسلئے اگر اب ایسے اسکول قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی، جن میں صرف دیسی زبان سکھائی جائے تو اس قسم کی کوشش ضرور ناکام ہو گی اور اگر سندھی اور فارسی دونوں زبانوں کی تعلیم اسکولوں میں جاری کی جائے گی تو امید ہے کہ لوگ سندھی زبان پڑھنے لگیں گے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ جیسے جیسے سندھی زبان دفاتر کے کاروبار میں رائج ہوتی جائے گی ویسے ہی بتدریج سندھی زبان عام لوگ پڑھنے لگیں گے۔"

"عربی اور فارسی کی تعلیم کے لئے فیس مقرر کی جائے اور یہ شرط ہو کہ جب کوئی طالب علم سندھی زبان میں پوری لیاقت کا ثبوت دے تو اسے فیس دینے سے مستثنیٰ کیا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ صرف وہ لوگ فارسی پڑھیں گے جو فارسی کو بخیال اس کے علم و ادب کے سیکھنا چاہتے ہیں یا بطور ایک کمال کے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور بہت سے لوگ

جواب فارسی صرف اس خیال سے سیکھتے ہیں کہ ان کو سرکاری
نوکریاں ملیں وہ سندھی سیکھنے کی طرف مائل ہو جائیں گے
لیکن جب تک صرف سندھی ہی سرکاری دفاتر کی زبان
نہ ہوگی تب تک جس اسکول میں صرف سندھی سکھائی
جاتی ہے اس کے بارونق ہونے کا بہت کم امکان ہے"

سنہ ۱۹۰۷ء میں موجودہ سندھی رسم الخط کے قیام کو تقریباً پچپن سال گزر چکے تھے لیکن اس وقت تک وہ مسلمانوں کی دینی، مذہبی اور دنیاوی ضروریات پوری کرنے کے لئے وافر مواد مہیا کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اس طویل مدت میں مسلمان دوہری کش مکش میں مبتلا رہے۔ جب سنہ ۱۹۰۷ء میں کراچی میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس مولانا حالی کی صدارت میں منعقد ہوا تو حسب ذیل رزولیوشن پاس ہوئے۔ یہ رزولیوشن صوبے کے عوام و خواص کے رجحانات کو ظاہر کرتے ہیں۔ نیز اکابر سندھ و ہندوستان کے انداز فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہ وہ کس کس طرح ہر صورت میں قوم کی مجموعی فلاح کو سامنے رکھتے تھے کہ وہ خواہ انگریزی زبان کے ذریعہ حاصل ہو یا فارسی یا سندھی کے مقصد بہرحال نیک تھا۔

سرکاری مدارس سندھ میں مسلمان اساتذہ کے تقرر کا مطالبہ

چونکہ مسلمانوں کو فارسی زبان سے عموماً دلچسپی ہے، اور وہ بہ نسبت دیگر اقوام کے اس زبان میں پوری مہارت رکھتے ہیں اس لئے اس کانفرنس کی رائے میں گورنمنٹ سے درخواست کرنی چاہئے کہ وہ سندھ کے سرکاری

مدارس میں حتی الامکان مسلمان مدرس فارسی زبان کی تعلیم کے لئے مقرر کیا کرے

محرک، منشی شمس الدین سندھی

مؤید، نواب وقار الملک

کورس میں فارسی کی شمولیت کا مطالبہ

اس کانفرنس کی رائے میں سندھی زبان کا موجودہ کورس جس میں زیادہ تر مسلمان طلبا کی تعلیم ہوتی ہے ان کی جہالت کو دور کرنے اور دنیا کی عام واقفیت پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سندھی تعلیم کے ساتھ فارسی کی تعلیم بھی شامل کی جائے۔

محرک۔ میجر سید حسن بلگرامی

سندھی زبان میں مسلمانوں کے جذبات کی حامل کتابیں شامل کرنے کا مطالبہ

چونکہ اس کانفرنس کو معلوم ہوا ہے کہ سندھی زبان کے موجودہ تعلیمی نصاب میں بعض عبارتیں مسلمانوں کے عقائد کے خلاف اور دل شکن ہیں اس لئے مدارس سندھ میں موجودہ کتابوں سے بہتر کتابیں جو مسلمانوں کے خیالات اور ان کے مذہبی احساسات کے موافق ہوں رائج کی جائیں

محرک، میجر سید حسن بلگرامی

سندھ لٹریری کمیٹی

اس کانفرنس کی رائے میں ایک کمیٹی بنام۔ سندھ لٹریچر کمیٹی۔ لائق اور منتخب سندھی اشخاص کی قایم کی جائے اور وہ سندھ کے مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے سندھی زبان میں ایسی کتابیں تیار کرے جن میں مذہبی اور

اخلاقی مضامین ہوں۔

محرک، مرزا قلیچ بیگ ڈپٹی کلکٹر

مؤید، شمس الدین سندھی

ٹریننگ کالجوں میں فارسی نصاب قائم رکھنے کا مطالبہ

یہ رزولیوشن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے اجلاس خیرپور میرس میں سنہ ۱۹۱۹ء میں پاس ہوئے۔ اس اجلاس کے صدر مولوی رحیم بخش بہاولپوری تھے۔

یہ کانفرنس اصرار کے ساتھ گورنمنٹ بمبئی سے مستدعی ہے کہ ورناکیولر ٹریننگ کالج سندھ کے نصاب تعلیم میں فارسی کی تعلیم کا برقرار رکھنا زبان سندھی کی عمدہ تعلیم کے لئے لازمی ہے۔"

کتب درسیہ پر نظر ثانی کا مطالبہ

یہ کانفرنس گورنمنٹ سے درخواست کرتی ہے کہ سندھ کی ٹیکسٹ بک و لٹریچر کمیٹی میں مسلمان ممبروں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے اور ان کو کتب درسیہ پر نظر ثانی کرنے کا اختیار دیا جائے تاکہ وہ مسلمانوں کی ضروریات کے لئے مفید اور موزوں ہو سکیں۔"[1]

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی تقریر :-

ابتدائی تین رزولیوشنوں کے متعلق صاحبزادہ آفتاب احمد خاں

---

[1] مرقع کانفرنس مرتبہ انوار احمد مارہروی مطبوعہ ۱۹۳۵ء ص ۱۲۳ - ۱۲۷-۲۰۲ اور ۲۰۳

نے مندرجہ ذیل تقریر فرمائی

یہ تینوں رزولیوشن سندھی زبان کی تعلیم اور نصاب تعلیم سے متعلق ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ محض سندھی زبان کی تعلیم تہذیب اخلاق اور واقفیت عامہ کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس واسطے سندھی کے ساتھ فارسی کی تعلیم بھی شامل کی جائے دوسرے سندھی زبان کے موجودہ نصاب میں بعض عبارتیں مسلمانوں کے لئے دل شکن اور ان کے عقائد کے خلاف ہیں اس لئے سررشتۂ تعلیم سے ان کتابوں کی اصلاح چاہی جائے۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ عوامی نکتۂ نگاہ تو پرانی اقدار اور نظریات کی یاد تازہ رکھنے کے واسطے فارسی زبان کی تعلیم کی ہر مرحلہ پر حمایت کرتا تھا لیکن اس کراچی کے سنہ ۱۹۰۷ء کے اجتماع میں کمشنر سندھ مسٹر ینگ ہز بینڈ فرماتے ہیں:۔

"میں خیال کرتا ہوں کہ یہاں کی حالت ہندوستان کے ان حصوں کی نسبت یہ ہے کہ یہ لوگ مشرقی علوم کو مغربی تعلیم پر ترجیح دیتے ہیں اور انگریزی ادب کی جگہ ان کے ہاں فارسی اور عربی ادب نے لی ہے"[1]

فارسی کلچر سے سندھیوں کی وابستگی:

واقعہ یہ ہے کہ پچاس سال کا طویل عرصہ گذر جانے کے باوجود عوام المسلمین پرانے معاشرے اور فارسی زبان کو برقرار رکھنے کی جد و جہد میں لگے

---

[1] رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اجلاس کراچی سنہ ۱۹۰۷ء

ہوئے تھے۔ پیر حسام الدین راشدی نے لکھا ہے:

"سندھی مسلمانوں کی فارسی دانی کسی طرح ہندوستان کے عام مسلمانوں سے کم نہیں تھی۔ ان میں بڑے بڑے معرکے کے اہلِ قلم اور نثار موجود تھے۔"

ایک اور جگہ پیر صاحب رقم طراز ہیں:

"این زوال حکومت دودمان تالپور برائے زبان فارسی نیز پیام مرگ بود و انگلیسیان بجائے فارسی انگریزی را بر سندھ مسلط ساختند و دربار یکہ پرورندۂ شعر و ادب بود بہ کلی بساط آں را چیدند، برائے شعرائے مشرقی جائے نماند سلسلۂ تصنیف و تالیف نیز گسیخت کہ داستان تمام این زوال و انحطاط دریں ضرب المثل سندھی موجود و آں عہد بہ ما رسیدہ است۔

فارسی پڑھیں۔ تیل بیچیں
انگریزی پڑھیں۔ گھوڑی چڑھیں

یعنی اگر فارسی بخوانید تیل فروشی خواہید کرد، اگر انگریزی بخوانید بر اسپ عزت سوار خواہید شد۔ گویا دریں عہد خواہش و دانش انگریزی بجائے فارسی وسیلۂ حصولِ اقتدار و عزت بود۔"

مقدمہ تکملۂ مقالات الشعرا

واقعہ یہ ہے کہ مغلوں کے آخری دور تک ہندوستان کے مسلمانوں کا مجموعی کلچر تقریباً ایک تھا، کیونکہ فارسی زبان کی وجہ سے ان میں وحدتِ خیال پائی جاتی تھی۔ جب انگریزوں کی لسانی پالیسیوں کے نتیجے میں انقلاب آنا شروع ہوا، تو سب سے پہلے اس ذہنی وحدت کو نقصان پہنچا۔ سنہ ۱۸۰۴ء میں ڈایریکٹرز آف ایجوکیشن بمبئی نے ایک جگہ تحریر کیا کہ

"شرفائے سندھ فارسی میں خط وکتابت کرتے تھے، اور سندھی بولتے تھے۔ حکومتی سطح پر عربی فارسی کی تعلیم متروک قرار پائے نیز ملازمتوں کے واسطے عربی فارسی کی تعلیم بیکار ہوجانے کے بعد بھی مدت ہا مدت تک اہالیان سندھ مسلسل اس کوشش میں رہے کہ کسی طرح پرانی لسانی اقدار کو برقرار رکھا جائے۔ لیکن

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مرزا علی محمد کی تجویز :-

اس ضمن میں غالباً ایک آخری کوشش مرزا علی محمد کی طرف سے ہوئی آپ صوبہ سندھ کی جانب سے بمبئی یونیورسٹی سینیٹ کے ممبر تھے۔ آپ نے تجویز کیا کہ ایک علیحدہ فیکلٹی علوم مشرقی کے واسطے بمبئی یونیورسٹی میں قائم کی جائے۔ سینیٹ نے مرزا صاحب کی اس تجویز کو قبول کرتے ہوئے سنڈیکیٹ کے سپرد کردیا۔ تجویز کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک طالب علم یونیورسٹی میں پہلے سال کی تکمیل کے بعد کسی ایک مشرقی زبان کی تعلیمی شاخ کی طرف رجوع

ہو جائے یہ زبانیں دو کلاسیکل اور ایک ورناکیولر پر مشتمل ہوں۔ اس طرح تین سال کے بعد بی اے کی ڈگری دیدی جائے۔ مقصد یہ تھا کہ انگریزی تعلیم کی گرانباری سے نجات پاکر طالب علم علوم مشرقی میں منتہی ہو جائیں۔ لیکن یہ سادہ تجویز بھی محض یہ کہہ کر رد کر دی گئی کہ عربی فارسی کی ان زبانوں کا کورس غیر تنقیدی (UN-CRITICAL) ہوگا۔ یونیورسٹی ریفارم کمیشن سنہ ۲۵۔ ۱۹۲۴ء صوبہ بمبئی کے مطابق۔

مسٹر مرزا خصوصی طور پر فارسی اور عربی لٹریچر کی تعلیم کے حق میں تھے، ان کا خیال تھا کہ اس طرح صوبہ بمبئی بشمول سندھ میں عربی فارسی کی تعلیم کے زوال کو روکا جا سکتا ہے۔ لیکن چونکہ عربی فارسی کی تعلیم میں مسلم کلچر کی بو آتی ہے، اس لئے اس مفید تجویز کو چلنے نہیں دیا گیا۔ جب عربی و فارسی کے معاملہ میں ناکامی ہو گئی تو مسلمانوں نے اردو زبان کے سلسلہ میں قدم اٹھایا۔ چنانچہ ہر ایک صوبے میں اس بارے میں زبردست جد و جہد کی گئی۔

لسانی پالیسیوں کے لحاظ سے ابتدائی دور میں صوبہ بمبئی میں انگریزی زبان کے غلبہ کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کی ترویج و اشاعت پر زیادہ توجہ دی گئی لیکن بنگال کی سینٹرل گورنمنٹ کے سامنے یہ تجویز کارگر نہیں ہوئی۔ مزید تفصیلات کو قطع انداز کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ سنہ ۱۹۲۴ء میں صوبہ بمبئی کے مسلمان اُردو کو بمبئی یونیورسٹی کے ایم اے اور بی اے کے امتحانات کے واسطے منظور کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ چونکہ صوبہ بمبئی کا براہ راست سندھ سے تعلق تھا اس لئے اس فیصلے سے سندھی مسلمانوں نے بھی یقیناً فائدہ حاصل کیا ہوگا۔ اور اگر ان کو

سہولت حاصل نہ ہوتی ہو تب بھی یہ ایک مثبت کامیابی تھی۔ قاید اعظم محمد علی جناح کو مسلمانوں کی تعلیم سے ہمیشہ گہرا شغف رہا تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۴ء میں آپ ہی کی دعوت پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنا اجلاس بمبئی میں منعقد فرمایا۔ اور گورنمنٹ بمبئی کا محولہ بالا فیصلہ پر شکریہ ادا کیا۔ رزولیوشن کا متن حسب ذیل ہے :۔

"چونکہ اردو کی تعلیم نہایت ضروری ہے، اور بمبئی یونیورسٹی نے اس کو اپنے بی اے اور ایم اے کے امتحانات کے واسطے منظور کر لیا ہے اس لئے یہ کانفرنس گورنمنٹ کو بزور متوجہ کرتی ہے کہ گورنمنٹ کالجوں میں اردو کے پروفیسر اس طور پر مقرر کرے جیسے کہ گجراتی، مرہٹی اور کناری زبانوں کے لئے ہیں۔"

آج کی حالت :

ایک زمانہ دراز تک سندھی مسلمان برادران وطن اور انگریزوں کی دوہری چکی میں پستے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد ان میں تعلیم کی روشنی پھیلی قدرتی طور پر سندھی زبان و ادب میں نمایاں ترقی ہوئی۔ یہ سب ترقیات پاکستان کا مشترک سرمایہ ہیں۔ مغربی پاکستان کی سرکاری اور قومی زبان اردو اور سندھی میں کسی قسم کے بُعد اور مقابلہ کا تصور ہی ایک مذموم بات ہے۔ بجایہ کہ اس مفروضے

---

۱ مرقع کانفرنس۔ مرتبہ انوار احمد زبیری صفحہ ۲۲۹ مطبوعہ سنہ ۱۹۲۵ء

پر عمارت تعمیر کی جائے۔ قیام پاکستان سے قبل صرف دو سندھی روزنامے "الوحید" اور "آزاد" جاری تھے۔ اس کے علاوہ حسب ذیل اخبارات ورسائل کے نام ملتے ہیں (۱) مفرح القلوب (۲) الکلیل (۳) معین الاسلام (۴) معاون اسلام (۵) سندھ سدھار کراچی (۶) الحق حیدر آباد اور سکھر (۷) آفتاب سکھر (۸) بہار اخلاق (۹) سندھ زمیندار سکھر (۱۰) تعلیم کراچی۔

قیام پاکستان کے بعد ہلال پاکستان حیدر آباد۔ نوائے سندھ کراچی۔ مہران حیدرآباد رسالہ مہران کے ایڈیٹر غلام محمد گرامی ہیں دیگر روزنامے (۴) کاروان (۵) عبرت (۶) خادم وطن (۷) نوائے انقلاب سکھر وغیرہ ہیں۔

ہفت روزہ رسالوں کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) آزاد (۲) باب الاسلام (۳) المنار۔

ماہنامے:-

(۱) نئی زندگی۔ پہلے ایڈیٹر عبدالواحد سندھی تھے۔ اور اب شمشیر الحیدری ہیں[۱]

قیام پاکستان کے بعد سندھ میں جو علمی فضا پیدا ہوئی اس سلسلہ میں جناب ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں:- "قیام پاکستان کے بعد سے اردو علاقائی زبانوں سے قریب آنے لگی اور علاقائی زبانوں کو بھی اردو سے وہ بُعد نہ رہا جو اس سے قبل تھا۔ علاقائی شاعروں کا ربط اردو زبان کے لکھنے والوں سے زیادہ واضح اور مضبوط ہو گیا۔ انھیں ایک دوسرے کی تحریروں کو پڑھنے اور ادبی روایتوں کو سمجھنے کا موقع

---

[۱] مقالہ۔ سندھی ادب از مولانا شیدائی مترجم رحمت فرخ آبادی۔ رسالہ الزبیر بہاولپور۔ نمبر ۴ سنہ ۱۹۶۸ء

ملا۔ ایسے حالات میں ایک کا دوسرے سے متاثر ہونا ضروری تھا

اردو غزل کے کلاسیکی انداز میں مرزا قلیچ بیگ اور محمد بخش واصف کا کلام بہت صاف ستھرا ہے اور اس روایت کو شیخ محمد ابراہیم خلیل۔ عبداللہ خواب سردار علی سرور اور سرشار عقیلی نے برقرار رکھا ہے۔ آج بھی غزل جدید سندھی شاعری کی مقبول ترین صنف ہے۔ اور غلام محمد گرامی۔ ایاز۔ شمشیر الحیدری۔ عبدالعلیم جوش۔ رشید الانصاری۔ علی محمد مجروح اور تنویر عباسی کی غزل جدید اردو غزل کا ساتھ دے رہی ہے۔ اردو طرز پر سندھی زبان میں لکھنے والے معروف ادیب حسب ذیل ہیں :۔

(۱) غلام ربانی۔ سراج الحق شیخ عبدالرزاق وغیرہ۔

سندھ کی تاریخ اور تحقیق کے میدان میں سید حسام الدین راشدی ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، لطف اللہ بدوی اور ڈاکٹر محبوب علی چنہ نے بڑا کام کیا ہے۔

خلاصہ کلام سندھ میں حالات کا رخ بہت بہتر ہے۔ زبان کے سلسلے میں علاقائی تعصبات پھیلانے والوں کی ایک محدود اقلیت ضرور موجود ہے لیکن جمہوری حدود کے اندر خالص علمی و ادبی نقطۂ نظر سے جو کام ہو رہا ہے وہ خواہ قومی زبان اردو کے واسطے کیا جائے یا مقامی زبان سندھی کے واسطے ہرگز ہرگز لسانی تعصبات کی زد میں نہیں آنا چاہئے۔ اس معاملہ میں تھوڑی سی فراخ دلی یقیناً اچھے نتائج کی حامل ہوگی۔

باب ۱۱

ریاستہائے راجپوتانہ

راجپوتانہ (موجودہ راجھستان) چند بڑی اور چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ یہ علاقہ ایک وسیع ریگ زار ہے جہاں بارش بہت کم ہوتی ہے اس لئے بہت سا علاقہ بنجر پڑا ہے۔ جس زمین کو قابل کاشت بنایا ہے وہاں بھی کسانوں کو سخت محنت اور جانفشانی کرنی پڑتی ہے۔ تعلیم اور ثقافت کے اعتبار سے یہ صوبہ ہمیشہ پیچھے رہا۔ راجپوتانہ دہلی کے قرب میں واقع ہونے کی وجہ سے اور راجپوت حکمرانوں کی سرکشی کی بنا پر سلاطین دہلی کے لئے ہمیشہ دردسر بنا رہا۔ مورخین نے اس کو مسلمان بادشاہوں کے جسم میں ایک تکلیف دہ کانٹے سے تشبیہ دی ہے۔ مسلمان سلاطین کو بار بار فوج کشی کر کے ان کو زیر کرنا پڑتا تھا۔ اور مسلمان فوج کی ایک بھاری تعداد مستقلاً وہاں رکھنا پڑتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راجپوتانہ کے اندرونی دور دراز علاقوں میں مسلمانوں کی بستیاں قایم ہو گئیں۔ ان فوجیوں کی نسل اب تک وہاں باقی ہے۔ ان کے خدوخال، جسمانی ساخت اور افتادِ مزاج سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ یہ غوریوں، خلجیوں اور تاتاریوں کی اولاد ہیں۔ حضرت خواجہ بزرگ اور ان کے خلفا اور متبعین

نے اسلام کے پیام کو دور دور تک پہنچایا۔ اور اس سنگلاخ خطہ میں تبلیغ اسلام کے لیے زمین ہموار کی۔ شاہانِ مغلیہ کے عہد میں اکبر و جہانگیر اور دوسرے بادشاہوں کی حکمت عملی سے دہلی اور راجپوتانہ میں سیاسی تعلقات کے ساتھ ساتھ سماجی اور تہذیبی رشتے بھی قائم ہوئے اور مسلمان اہل کمال اور اہل صنعت و علم کو راجپوتانہ کی ریاستوں میں آباد ہونے کا موقع ملا۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد دہلی، لکھنؤ اور دیگر مشہور شہروں کی مصیبت زدہ مسلم آبادی کو مہاراجگان راجپوتانہ نے جس خوش دلی اور احترام کے ساتھ اپنے علاقوں میں خوش آمدید کہا اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ انقلابی تحریک کی ناکامی اور انگریزوں کے تسلط کے بعد راجپوتانہ کی ریاستوں میں مسلمانوں کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا گیا۔ ان کو مناصب اور جاگیریں عطا ہوئیں۔ یہاں تک کہ چند بڑی ریاستوں میں تو اسلامی معاشرت اور طرز زندگی کے نمایاں آثار نظر آنے لگے۔

راجپوتانہ کی قریب قریب ہر ریاست میں فارسی زبان رائج ہو گئی تھی دفتری کام اسی زبان میں ہوتا تھا۔ بعض ریاستوں میں فارسی اور عربی کی تعلیم کے لیے درس گاہیں تھیں اور انگریزی اسکولوں میں بھی اسی فیصدی طلبا فارسی اور اردو بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ لیکن جس چیز نے فارسی اور اردو کو سب سے زیادہ فروغ دیا وہ مکتبی تعلیم تھی یہ مکتب ہر محلے میں جاری تھے۔ محلے کے سب بچے جن میں ہندو بھی کافی ہوتے تھے ان مکتبوں میں فیض حاصل کرتے تھے مکتبوں میں خوش خطی پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ مکتبوں کے نکلے ہوئے لوگ

ریاست کے دفتروں میں بلا کسی دقت کے ملازمت حاصل کر لیتے تھے۔ سب سے بڑی استعداد جس کی پوچھ گچھ ہوتی تھی وہ یہ تھی کہ امیدوار شکستہ اردو کی تحریرات کو روانی اور صحت کے ساتھ پڑھ سکے۔ اور خط ایسا پاکیزہ ہو کہ دوسرے لوگ اس کو آسانی سے پڑھ سکیں۔ اسی عہد میں مسلم علما، شعرا اور ماہرین ادب کی ایک خاص تعداد، بالخصوص جے پور، الور، جودھپور، کوٹہ، جھالاواڑ اور بوندی کی ریاستوں میں وہاں کے حکمرانوں کی علم پروری اور معارف نوازی کی بدولت سکونت پذیر ہو گئی اور یہ ریاستیں علمی سرگرمیوں کا اچھا خاصہ مرکز بن گئیں۔

ان سب میں ریاست جے پور کو ایک خصوصی حیثیت حاصل تھی۔ جے پور کو شاہانِ مغلیہ کے دربار میں بھی ایک اعلیٰ مقام حاصل تھا اور ریاست میں مغلیہ نظام حکومت اور درباری رکھ رکھاؤ کی پوری تقلید کی جاتی تھی۔ یہی طرزِ عمل سلطنت مغلیہ کے انتزاع کے بعد بھی رہا یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے خاص شہر جے پور اور اس کے اندرونی علاقوں میں بود و باش کو ترجیح دی اور ریاست کی خدمات بڑی وفاداری اور قابلیت کے ساتھ انجام دیں۔ فارسی اور اردو زبانیں بڑے شوق اور توجہ سے ہندوؤں کے زیر مطالعہ رہیں۔ مشاعرے خاص طور پر پسند کئے جاتے تھے مہاراجہ رام سنگھ جو موجودہ جے پور کی علمی انتظامی اور صنعتی ترقی کے بانی سمجھے جاتے ہیں ان کو مسلمانوں اور مسلمانوں کے علوم و فنون سے دلی لگاؤ تھا چنانچہ وہ اپنے محل میں مشاعرے کراتے تھے اور فارسی اردو کے عالموں کی سرپرستی کرتے تھے۔ جب ریاست کا نیا قانونی اور انتظامی نظام انگریزوں کے تسلط کے بعد مرتب ہوا تو انھوں نے اس کی بنیاد شاہانِ دہلی کے طریقہ حکومت پر

ہی رکھی گئی دیوانی و فوجداری قوانین اردو میں تیار ہوئے اور عدالتوں میں کسی ایسے شخص کا تقرر نہیں ہو سکتا تھا جو ان زبانوں سے واقف نہ ہو۔ مہاراجہ رام سنگھ کے بعد مہاراجہ سوائی مادھو سنگھ ان کے جانشین ہوئے۔ یہ مہاراجہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ لیکن ان میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ شاہان مغلیہ اور اپنے پیش رو مہاراجہ کے طریقۂ کار اور حکمت عملی کے خلاف ایک قدم نہیں بڑھاتے تھے۔ اور اپنا اصول یہ مقرر کیا تھا کہ انگریز ریزیڈنٹ یا کوئی اور اعلیٰ افسر ریاست کے اندرونی معاملات میں جو مشورہ دیں اس پر عمل نہ کیا جائے لیکن حکومت انگلشیہ خصوصاً اس کے خداوندان محکمۂ سیاسی کو دوسرے طریقوں سے خوش اور مطمئن رکھا جائے۔ چنانچہ ان کی وفاداری تاج برطانیہ کے ساتھ کبھی بھی مشکوک نگاہوں سے نہیں دیکھی گئی۔ ان کے عہد میں (ان کا انتقال ۱۱ر ستمبر سنہ ۱۹۲۱ء کو ہوا) ریاست کے مسلمانوں اور ان کی ثقافتی خصوصیات کو کسی قسم کی زک نہیں پہنچی۔ حالانکہ اس عہد میں ہندوستان میں ہندو قوم پرستوں کی مخالف اسلام سرگرمیاں اور اردو کُشی کی تحریکات زور و شور سے شروع ہو گئی تھیں، خود ریاست میں بعض ہندو افسران خاص طور پر باہر سے آئے ہوئے خفیہ طریقہ پر ان تحریکوں کو ہوا دے رہے تھے۔

مہاراجہ مادھو سنگھ کی اس پالیسی کی کامیابی میں ان کے مصاحب (وزیراعظم) ممتاز الدولہ نواب سر فیاض علی خاں رئیس پہاسو ضلع بلند شہر (یو۔ پی) پریسیڈنٹ بورڈ آف ٹرسٹیز ایم۔ اے۔ او۔ کالج علیگڑھ کی صلح کُل اور رواداری حکمت عملی کو بڑا دخل تھا۔ انھوں نے کسی ایسی تحریک کو سر

نہ اٹھانے دیا۔ جس سے ریاست کی قدیمی عظمت اور روایات میں فرق آئے یا
فرقہ واریت کو فروغ حاصل ہو، نواب صاحب موصوف کو برٹش گورنمنٹ
اور اس کے پولیٹیکل شعبہ میں جو رسوخ واثر حاصل تھا۔ اس سے انھوں نے
ایک طرف ریاست کو عظیم الشان فائدے پہنچائے اور دوسری طرف مسلمانان
جے پور کے وقار اور ان کی خیر سگالی اور وفادارانہ خدمات کی قدر و قیمت اور
ان کی سیاسی اہمیت کے استناد اور استحکام میں اس سے بہت کام لیا۔ ان
کی اسی دور رس پالیسی کا اثر تھا۔ کہ نہایت نامساعد حالات کے باوجود سنہ ۱۹۴۷ء
کے خون آشام ہنگامے کے دوران جے پور میں ہند و جارحیت کے جنونی مسلمانوں
کے خون کی ہولی نہ کھیل سکے۔ اور یہ سرزمین الور۔ بھرت پور اور اجمیر کی طرح
بے گناہ مسلمانوں کے خون سے رنگین نہیں ہوئی۔

نواب موصوف کے عہد وزارت کے آخری دنوں میں جب وہ خود
اور مہاراجہ بستر علالت پر تھے۔ بعض لوگوں کو جن میں باہر سے آئے ہوئے بنگالی
افسران ریاست پیش پیش تھے۔ مسلمانوں کے خلاف سر اٹھانے کا موقع مل
گیا۔ ریاست کے بعض فرقہ پرست افراد بالخصوص پرجا منڈل (کانگرس کی
ریاستی تحریک کی تنظیم) کے ممبران نے اردو کے خلاف محاذ قایم کرنے کی کوشش
کی۔ لیکن ان کی کچھ چلی نہیں۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد جو ۱۹۱۹ء
یا سنہ ۱۹۲۰ء میں ہوا۔ مہاراجہ نے امور ریاست میں امداد و مشورہ کے لئے
دو انگریز افسران کو مقرر کر لیا۔ ان کی موجودگی سے سیاسی فضا مکدر ہونے
لگی۔ یہاں تک کہ مہاراجہ کے انتقال کے بعد جبکہ برٹش گورنمنٹ نے ابھی نابالغی

کے عبوری وقفہ کے لئے کوئی خاص سیاسی نظام مقرر نہیں کیا تھا اور مہاراجہ کے ایک عزیز ٹھاکر مان سنگھ جھالا کو کا ٹھیاواڑ سے بلا کر جے پور کونسل کا سینیر ممبر مقرر کر دیا تھا۔ یکایک ایک سیاسی اور فرقہ وارانہ طوفان برپا ہو گیا۔ مان سنگھ جھالا کی طرف داری میں ریاست کے بہت سے با اقتدار سردار بھی سیاسی کارکنوں کے ساتھ مل کر انگریز افسران کے اخراج کا مطالبہ کرنے لگے۔ اور اپنے مطالبات میں موقع اور محل کا خیال کئے بغیر ایک مطالبہ یہ بھی شامل کر لیا کہ اردو کے بجائے ہندی ریاست کی سرکاری اور دفتری زبان فی الفور مقرر کر دی جائے۔ سیاسی بحران تو انگریزوں کی خوش تدبیری اور اصول پرستی کی بدولت جلد ختم ہو گیا، لیکن ہندی کا نعرہ قایم رہا اور زور پکڑتا رہا۔ محبان اردو کے لئے یہ ایک لمحۂ فکریہ اور کھلا چیلنج تھا۔ جو اس نازک وقت میں جبکہ ریاستی انتظام کی باگ ڈور ایک با اختیار اور پختہ کار انگریز افسر کے ہاتھ میں تھی اور ہندوؤں بالخصوص راجپوتوں کی تالیف قلوب وقت کی اشد ضرورت تھی۔ بہت خطرناک نتائج کا حامل ہو سکتا تھا۔ لیکن اردو کے قدر دانوں نے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے اس چیلنج کو قبول کیا اور اردو کی بقا کے لئے سرتوڑ کوشش کی۔ منشی گردھاری لال، مولوی معشوق حسین اطہر، مولوی امیر الدین خاں جوش۔ ان مخلص کارکنوں میں پیش

نواب صاحب کے تفصیلی حالات مرقع فیض مصنفہ مولوی عنایت علی بریلوی مطبوعہ ۱۹۰۸ء میں تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔

پبلش تھے۔ عہد نابالغی کم و بیش بارہ تیرہ سال رہا اور اس زمانے میں ہندی کی ترویج کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کی سرکاری اور دفتری زبان ہونے کے لئے سر توڑ کوششیں ہوتی رہیں لیکن اردو کو اپنی جگہ سے ہٹا سکے۔ البتہ ہندی والوں کو ایک بڑی اہم کامیابی حاصل ہو گئی جس نے اردو کا مستقبل تاریک کر دیا۔ مسلمان اپنی پوری کوشش اور تگ و دو کے باوجود انگریز سربراہ ریاست کو اس امر پر آمادہ نہ کر سکے کہ نابالغ مہاراجہ سری سوائی مان سنگھ کے تعلیمی منصوبہ میں دوسری زبانوں کے ساتھ اردو کی تعلیم کو بھی شامل کیا جائے۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا یعنی جب مہاراجہ مان سنگھ با اختیار ہوئے تو ان کی مسلمان رعایا ان کے لئے اجنبیوں کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ اور اردو سے تو ان کو لگاؤ ہوتا ہی کیسے!

اردو ہندی کا قضیہ برابر جاری رہا۔ اور اس کا بالواسطہ یہ اثر ہوا کہ انگریزی زبان کا اثر و نفوذ بہت بڑھ گیا۔ یوں تو نابالغی کے زمانے سے ہی انگریزی کا استعمال نہ صرف سرکاری کاغذات، مراسلات اور اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں میں ہونے لگا تھا بلکہ عوام کو بھی اپنے معاملات اور گزارشات حکام اعلیٰ تک پہنچانے کے لئے اسی غیر ملکی زبان کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ اب ریاست کے انتظامی و عدالتی شعبوں میں جو لوگ مقرر ہوتے تھے ان کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ اردو زبان سے واقفیت رکھتے ہوں۔ افسران تعلیم نے پرائمری اسکولوں سے بالخصوص دیہات میں اردو تعلیم کے اساتذہ کو کم کرنا شروع کر دیا۔ فارسی کی تعلیم تو بالکل ہی ہائی اسکولوں سے بھی ختم کر دی گئی

پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے لئے یہ لازمی شرط تھی کہ جب تک وہ دونوں ورناکیولر کی تدریس کا انتظام نہ کریں گے اور ہر فرقہ کے بچوں کے لئے داخلہ کے دروازے کھلے نہ رکھیں گے ان کو گرانٹ نہیں ملے گی۔ مسلمانوں کے لئے تو یہ شرط قایم رہی اور اس پر سختی سے عمل ہوتا رہا۔ لیکن ہندو اداروں کو ان معاملات میں کھلی آزادی دے دی گئی۔

مہاراجہ جے پور نے انتظام حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد بھی کوئی فیصلہ کن اقدام ہندی کی موافقت میں نہیں کیا اور نہ مخالفین اردو کی کھل کر پیٹھ ٹھونکی۔ ان کو ذاتی طور پر اردو سے کوئی عناد نہیں تھا جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا۔ لیکن غالباً ان کی خواہش ضرور تھی کہ "مردے از غیب" ظاہر ہو کر ہندی کی سرکاری و دفتری حیثیت کو گورنمنٹ کی منظوری دلانے کی مہم کو سر کرا دے تو مہاراج بھی اس پر رضامند ہو جائیں گے۔ ان کی خوش قسمتی سے یہ مرد از غیب سر مرزا اسمٰعیل کی شخصیت میں بطور وزیر اعلیٰ جے پور کے اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اور اپنی مسلمہ سیاسی و مدبرانہ خوش تدبیری سے جہاں مہاراجہ کے اور بہت سے عظیم منصوبوں کو تکمیل پر پہنچایا وہاں اردو ہندی کے قضیہ کو بھی اکثریت کی منشا کے مطابق فیصل کر دیا۔ یعنی ہندی کو سرکاری زبان تسلیم کر کے اردو کے استعمال کی ممانعت کے احکام جاری کر دیئے گئے۔ یہی نہیں بلکہ اسکولوں میں اردو کی تعلیم جاری رکھنے اور طلبہ کو اپنی اور اپنے سرپرستوں کی مرضی کے مطابق ورناکیولر کا مضمون پسند کرنے کا حق قایم رہنے کے لئے نہ ہدایات دی گئیں نہ تخصیصات منظور کیے گئے۔

مسلمانوں اور دیگر محبانِ اردو نے اپنے امکان بھر اردو کے تحفظ کی کوشش جاری رکھی۔ درخواستیں اور وفود اس سلسلہ میں پیش ہوتے رہے۔ نواب بہادر یار جنگ کو جے پور تشریف لانے کی کئی مرتبہ تکلیف دی گئی۔ انھوں نے زبانی اور بذریعہ مراسلت سر مرزا اسمٰعیل پر اردو والوں کے صحیح خیالات اور ریاست کی مخصوص قدیم روایات کی ترجمانی کی لیکن کسی کی پیش نہ گئی۔ بلکہ سر مرزا اسمٰعیل کی پروپیگنڈا مشنری نے خود نواب بہادر مرحوم اور جے پور کے کارکنوں کے درمیان غلط فہمی اور اختلاف پیدا کر دیا۔ جیسا کہ ان کے مکاتیب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنے مکتوب بنام سر مرزا اسمٰعیل (نمبری ۲۰۱۰) مورخہ ۲۵ نومبر ۱۹۴۳ء میں جے پور کے مخلص اور سرگرم مسلم کارکن محمد امیر الدین[له] خاں صاحب سکریٹری انجمن تعلیم المسلمین (آپ ابھی بقید حیات ہیں اور حیدر آباد میں مقیم ہیں) کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔ امیر الدین خاں صاحب جے پوریا مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کے لئے اتنے ہی مفید ثابت ہوں گے جتنے آپ کے میسور میں غلام احمد کلامی اور خان بہادر عباس خاں ثابت ہو چکے ہیں۔ منشی امیر الدین خاں پر نواب صاحب مرحوم کو جو اعتماد تھا اس کی توثیق

له مولوی امیر الدین خاں صاحب پروفیسر حامی الدین خاں صاحب حقیقی بھائی ہیں آپ کا یوپی کی ریاست رام پور کی روہیلہ نسل سے تعلق ہے۔ یہ پورا خاندان اپنی ذاتی قابلیت کے لحاظ سے ممتاز ہے۔

آپ کے ایک مکتوب گرامی نمبری ۲۰۵ مورخہ ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء سے ہوتی ہے۔ جس میں آپ نے منشی صاحب کو ان تمام مراسلات کی نقول ارسال کیں۔ جو اردو کے تحفظ کے متعلق سر مرزا سے ہوئی تھیں۔ اور سر مرزا کو مطلق کرنے کے لئے آپ سے امداد چاہی تھی اس عرصہ میں جے پور میں آئینی اصلاحات کا ایک منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں کی نمایندگی۔ ان کے لئے جداگانہ انتخاب کا حق اور بحیثیت ایک مؤقر اقلیت کے مسلمانوں کے لئے باعزت زندگی گزارنے کا مسئلہ رونما ہو گیا۔ اور سر مرزا و نواب بہادر کے درمیان سخت اختلافِ رائے پیدا ہو گیا۔ مسلمانوں کی اکثریت نواب صاحب کی ہمنوا تھی لیکن بعض مقامی سیاسی کارکن سر مرزا کے ہم خیال تھے۔ ان کے ذریعے سے سر مرزا نے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا چاہی اور ان ہی کی مدد سے نواب مرحوم اور مخلص مقامی لیڈروں میں غلط فہمی پیدا کرائی۔ چنانچہ آپ نے اپنے خط نمبری ۹۹۴ مورخہ ۲ فروری ۱۹۴۲ء بنام منشی امیرالدین خاں میں تحریر فرمایا کہ "سنا ہے کہ آپ نے .... ایک سیاسی جماعت تشکیل دی ہے۔ لیکن تعجب اس کے قیام پر نہیں، آپ کے ساتھ اس کی نسبت پر ہوا۔ جن کمزوریوں پر میں ناز کرتا ہوں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جن سے محبت کرتا ہوں ان پر شبہ کرنے کو بمشکل تیار ہوتا ہوں۔ اس سے ذرا آگے اپنے اس قدیمی مشفقانہ انداز میں دریافت کرتے ہیں۔ "کہئے معلنہ اصلاحات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ مرزا صاحب کے کیا رنگ ہیں، اور آپ کے خیال میں اب مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے۔ آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔"

واقعہ یہ ہے کہ اسی زمانے میں جے پور نہیں بلکہ کل راجپوتانہ کے واحد پرائیویٹ

مسلم مڈل اسکول جس کے بانی منشی امیرالدین خاں تھے۔ ہائی اسکول کے درجہ پر ترقی دینے کی کوشش زوروں سے جاری تھی اس سلسلہ میں سرمرزا کی اعانت اور سرپرستی حاصل کرنا بھی ضروری تھا۔ انجمن تعلیم المسلمین کا واحد مقصد مسلمانوں میں تعلیم کی ترویج اور ترقی تھا۔ سیاسیات سے اس کو کوئی سروکار نہ تھا۔ البتہ اردو کے تحفظ اور بقا کی کوشش اس کے اغراض میں شامل تھی۔ ان پیچیدہ حالات میں سرمرزا کے سیاسی اغراض کے آلۂ کار بنے بغیر مسلمانوں کی تعلیمی جدوجہد کے لئے ان سے اخلاقی امداد حاصل کرنا یہ منشی صاحب ہی کا کام تھا جس کا مثبت نتیجہ مسلم ہائر سیکنڈری اسکول۔ اس کی عالی شان عمارت اور اس کے متعلقہ گرلز و بائز اسکولوں کی صورت میں اب بھی موجود ہیں۔

جے پور میں اردو کے بقا کے لئے عوامی سطح پر کوشش جاری تھی کہ برصغیر کی تقسیم ہوگئی۔ اب تمام صوبہ کی انتظامی مشین کانگریسی نیتاؤں کے احکام و ہدایات کے مطابق کام کرنے لگی اور ہندی کے فروغ اور نفوذ کے لئے سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع تمام و کمال استعمال کئے جانے لگے اردو کے شیدائی بھی اجتماعی کوشش کے لئے خم ٹھونک کر میدان میں آگئے۔ یہ حقیقت ہے کہ سنہ ۱۹۴۸ء میں جس پیمانہ پر اردو کے لئے تعمیری اور تبلیغی کام ہوئے۔ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا انجمن ترقی اردو کی ایک فعال اور سرگرم کار شاخ قایم ہوئی ہے۔ جس کے صدر اور سکرٹری الحاج الطاف احمد صاحب خیری (جناب کراچی آ گئے ہیں۔) اور الحاج مولوی احترام الدین شاغل ہمہ تن اردو کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ایک طرف عمال حکومت سے اردو کا حق لینے کے لئے مصروف پیکار ہیں۔ اور دوسری طرف عوام

میں اردو سے دلچسپی پیدا کرنے کے لئے کنونشن جلسوں اور مشاعروں کا انتظام کرنے کے علاوہ اردو مکاتب قایم کئے جارہے ہیں۔ سرکاری اور غیر سرکاری سکولوں میں اردو پڑھنے والے طلبا اتنی تعداد میں داخل کئے جارہے ہیں کہ حکومت اور کارکنان اسکول اردو مدرسین کا تقرر کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ دفاتر اور عدالتوں میں اردو کی درخواستیں قبول نہیں کی جاتی تھیں۔ اس حکم کو منسوخ کرایا گیا اب ہر شخص آزاد ہے کہ چاہے تو اردو میں درخواست پیش کرے۔ مقابلے کے امتحانوں میں بھی اردو کے لئے گنجائش نکالی ہے۔ اردو کے فروغ کی یہ کوششیں مقامی نہیں ہیں۔ بلکہ ہر ریاست کے ہندو و مسلمان مل کر یہ خدمت انجام دے رہے ہیں خیری صاحب اور شاغل صاحب نے بے خوف اور بے دھڑک ہو کر اردو کے سرنگوں پرچم کو بلند کیا۔ اور بہت سے مخلص کارکنان کو اس کے نیچے جمع کر دیا ہے۔ حکومت کی پالیسی اور ہٹ دھرمی کی تو اور بات ہے لیکن سرکاری حلقوں میں اور انصاف پسند عوامی جماعتوں میں اب یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ اردو کے ساتھ بہت بے انصافی کی گئی ہے جس سے ملکی اور قومی مفاد کو نقصان ہو رہا ہے۔ اور ایک وقت آئے گا کہ اردو کو اس کا جائز حق دینے کے لئے حکومت کو مرکزی اور صوبائی سطح پر دوبارہ غور کرنا پڑے گا۔ یہ عجیب بات ہے کہ بھارت میں اس دور زوال میں اردو کے لئے سب سے زیادہ منظم سب سے زیادہ ٹھوس اور نتیجہ خیز کام ایسے صوبے میں ہوا ہے جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ راجپوتانہ کی شاخ انجمن ترقی اردو حیدرآباد (دکن) کی شاخ کے بعد سب سے زیادہ فعال اور سرگرم ہے۔ اس کے کارنامے دوسروں کے لئے قابل تقلید ہیں۔

جھالاواڑ :

ریاست جھالاواڑ میں سب ریاستوں کی طرح ابتداءً اُردو کا رواج تھا۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں مہاراجہ نے فارسی رسم الخط کے بجائے دیوناگری رسم الخط کے اجرا کا حکم نافذ کیا۔ غور فرمایئے یہی وہ زمانہ ہے کہ یوپی میں اردو ہندی کش مکش زور پر تھی۔ مسلمانانِ بھارت ہندی سے دامن چھڑانے کی زبردست جد وجہد کر رہے تھے۔ مسلمانانِ بنگال کو مجبور و مقہور بنایا جا چکا تھا۔ اور پنجاب میں بھی پنجابی کے سہارے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کش مکش ہو رہی تھی۔

برطانوی ہند میں جو انگریزوں کی پالیسی چل رہی تھی، وہی ان ریاستوں میں جاری تھی۔ چنانچہ ریاست کوٹہ میں ہندی رسم الخط سنہ ۱۹۱۱ء میں جاری ہوا۔

قرولی :

ریاست قرولی میں سنہ ۱۹۳۰ء تک اردو کا قدم جما رہا۔ لیکن سیاسی تحریکات کی آندھی اور تعصب کی فضا نے اردو کا خاتمہ کر دیا۔

بھرت پور :

مغربی یوپی سے ملحق ریاست بھرت پور میں جو جاٹوں کی ریاست تھی قدیم دور سے اردو ریاستی زبان چلی آ رہی تھی۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں یہاں اردو کے خلاف کارروائیوں کا آغاز ہوا۔ گویا وہی زمانہ ہے جبکہ برطانوی ہند میں یہ مسئلہ زور پر تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ مہاراجہ کشن سنگھ نابالغ تھے اور قاضی سر

عزیزالدین دیوان ریاست تھے۔ ہندی ساھتیہ سمتی نے کونسل سے درخواست کی کہ راج کے دفتروں میں ہندی بھاشا کے ذریعہ کام ہوا کریں۔ کونسل کے تینوں ہندو ممبروں نے اس درخواست سے اتفاق رائے کیا لیکن قاضی مرحوم نے فرمایا

"والئ ریاست اس وقت با اختیار نہیں ہیں اور ان کے علم و اطلاع کے بغیر ریاست میں اس قسم کی تبدیلی نہیں ہونا چاہئے۔ جس کو جس وقت اختیارات مل جائیں اس وقت وہ چاہیں تو ریاست کی زبان بدل سکتے ہیں —"

تبدیلی رسم الخط کی سازش کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ کشن سنگھ کی والدہ کے خاندانی مہنت رادھا بلبھ نے مہاراجہ کی بلوغت کے بعد اپنی چیلی سے فرمائش کی کہ اپنے بیٹے سے کہہ کر ریاست کی زبان بدلوا دیں۔ چنانچہ راجہ کی والدہ نے اپنے بیٹے کو ہر طرح سے گھیر کر مجبور کر دیا اور یکم نومبر سنہ ۱۹۲۰ء سے ریاست کے دربار اور یکم جنوری سنہ ۱۹۲۱ء سے دیگر محکموں میں ہندی رسم الخط و زبان کا اجرا ہو گیا

دھولپور :

راجپوتانہ کی مشہور ریاست دھولپور میں سنہ ۰۵-۱۹۰۴ء میں ہندی کے اجرا کا عملی خیال اہلکاروں کے ذہن میں پیدا ہوا۔ اور حکم ہوا کہ فارسی الفاظ کے بجائے ہندی الفاظ استعمال کئے جائیں۔ سب سے پہلے تحریری اغراض کے لئے محکمۂ فوج میں ہندی کا استعمال رائج ہوا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۲۶ء میں محکمہ پولس نے ہندی زبان اختیار کی۔ اردو اور ہندی

دونوں رسم الخط استعمال کرنے کے متعلق باضابطہ حکم سنہ ۱۹۲۹ء میں صادر ہوا۔ اپریل سنہ ۳۰ء میں ریونیو اور جوڈیشل محکموں میں بھی ہندی رائج ہوئی ۳ر جون سنہ ۱۹۳۷ء کو ہر ملازم کے واسطے ہندی سیکھنا لازمی قرار پایا۔

نتیجہ :

اُردو داں ملازمین رفتہ رفتہ نکالے جا چکے تھے۔ اور جو کچھ موجود تھے وہ ہندی دانوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ اور تقریباً تمام دفاتر کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو گئے تھے۔

الور :

اس ریاست کو قایم کرنے میں سات مسلمانوں نے برابر کا حصہ لیا تھا۔ چنانچہ ابتداءً ریاست آٹھ حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ابتدائی راجہ پرتاب سنگھ کے بیٹے بختاور سنگھ نے اپنے محسن کو زہر دے کر مار دیا صرف ایک حصہ دار محمد بخش "ڈھائی پرگنہ" بچانے میں کامیاب ہوئے جو ریاست لوہارو کہلائی۔ مسلمانوں کا چونکہ ریاست کی بنیادیں قایم کرنے میں حصہ تھا اس لئے سنہ ۱۸۵۰ء تک ریاست کی زبان فارسی رہی۔ سنہ ۱۸۵۱ء سے ۱۹۰۹ء تک اردو کا چلن رہا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں اردو دشمنی زور پکڑ گئی عجیب بات یہ تھی کہ اس وقت کے مہاراجہ کو ہندی سے قطعی لگاؤ نہ تھا اس سلسلہ میں ایک عجیب کہانی بیان کی جاتی ہے۔

"پنڈت مدن موہن مالویہ یہاں تشریف لائے اور انھوں نے مہاراجہ کو ترغیب دی کہ ایک ہندو کا یہی دھرم ہے کہ وہ اپنی مذہبی زبان کو فنا

نہ ہونے دے۔ اگر ہماری زبان فنا ہوگئی تو ہم اپنا تمدن، تہذیب اور دیگر قومی خصوصیات سب کھو بیٹھیں گے۔ لہذا مہاراج کو چاہیے کہ اپنی ریاست کے دفاتر میں ہندی کو ترقی دیں۔ اس کوشش میں کچھ اس قدر اثر تھا کہ مہاراجہ نے فوراً ہی سنہ ۱۹۱۰ء میں ہندی کے رواج کا حکم دے دیا۔"

سنہ ۱۹۲۱ء تک صرف رسم الخط ہی بدلا تھا، اور زبان عملاً اردو تھی۔ لیکن اس سال کے بعد الفاظ بھی بدلنا شروع ہو گئے۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں ہائی اسکول الور کے سوا تمام ریاست سے اردو کا اخراج عمل میں آیا۔ ان باتوں نے مسلمانوں کو مشتعل کر دیا۔ اور ریاست میں انگریز پرائم منسٹر مقرر ہو گیا۔ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ یہ سب حرکتیں انگریز کی خاموش سرپرستی میں ہوتی تھیں۔ چنانچہ انگریز وزیر اعظم کے زمانے میں اور زور بندھا اور مسلمانوں کی بے چینی کا کوئی سدباب نہیں ہوا۔

نتائج:

ریاست الور میں رسم الخط کی تبدیلی کا مسلمانوں پر کیا اثر پڑا اس کا اندازہ ایک مشہور رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو جمالی رپورٹ کہلاتی ہے۔

"آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ ہندی کا امتحان مہاراجہ صاحب بہادر کے دور حکومت میں مقرر کیا گیا تھا، اور اس کا منشا یہ تھا کہ مسلمان اس کے ذریعہ ریاست کی ملازمتوں سے علیحدہ کیے جا سکیں۔ چنانچہ اس کے اثرات جیسے کچھ برآمد ہوئے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے

کہ ریاست کے تمام دفاتر میں مسلمان خال خال نظر آنے لگے تھے۔

بیکانیر :-

یہ ریاست مغربی پاکستان کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ اس ریاست کی زبان مغلوں کے دور میں فارسی تھی، اس کے بعد اردو۔ لیکن اس سلسلہ میں صحیح تاریخوں کا تعین نہیں ہو سکا ہے۔ البتہ اردو کے بجائے ہندی رسم الخط رائج ہونے کا سنہ ایک واقعہ کی وجہ سے محفوظ ہے جو درج ذیل ہے۔

" مہاراجہ بیکانیر کی سالگرہ سنہ ۱۹۱۲ء کے موقع پر پنڈت مالوی نے بھرے دربار درخواست کی تھی کہ میں بحیثیت برہمن بھیک مانگتا ہوں۔ میری دکشنا یہ ہے کہ اردو کو ہندی سے تبدیل کر دیا جائے[1]۔ اس تحریک پر ریاست کے دفاتر سے اردو زبان کو اٹھا دیا گیا۔ لیکن چار سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ ریاست کے دفاتر میں ابتری پھیل گئی۔ کاغذی نظام اور تحریری کاروبار درہم برہم ہو گیا۔

اس کیفیت کو دیکھ کر ایک کمیشن بنایا گیا جس کے جملہ ممبر ہندو تھے انہوں نے بھی فیصلہ کیا کہ ہندی دیر میں لکھی جاتی ہے اور کاغذ زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ اور ہندی کو لکھنے کے بعد پڑھنے میں دقت ہوتی ہے کیونکہ صرف رسم الخط بدلا گیا ہے زبان اور عبارت ابھی تک اردو ہے۔ اہلکار صرف ہندی داں ہیں اور ان کی قابلیت بھی زیادہ نہیں ہے۔ دفاتر میں ابتری کی یہی وجہ ہے۔

اس کمیشن کی رپورٹ کے نتیجے میں اردو دوبارہ ریاست کی زبان ہونے والی تھی کہ فرقہ پرستوں نے مذہبی بنیادوں پر ہنگامہ برپا کر دیا۔ اور آخری فیصلہ

---

[1] (اگلے صفحہ پر)

ان الفاظ کے ساتھ ہوا۔

"ریاست کے معمولی پڑھے لکھوں کی پرورش کے لئے ہندی میں دفتر کا رہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔"

جودھپور :

اس ریاست میں مغلوں کے زمانہ میں فارسی کا چلن تھا۔ یہ تحقیق نہیں ہو سکا کہ کب اردو رواج پذیر ہوئی۔ البتہ سنہ ۱۸۹۰ء میں پہلی مرتبہ اردو ختم ہوئی۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں اس کو مستقل طور پر ریاست بدر کیا گیا۔ جودھپور میں اردو کا خاتمہ دیگر ریاستوں کی طرح ایک واقعہ سے منسوب ہے جو درج ذیل ہے :

"کہا جاتا ہے کہ سر پرتاب سنگھ سابق مصاحب اعلیٰ ریاست جودھپور کی خدمت میں ایک جعلی تحریر پیش کی گئی۔ اس میں کسی جگہ فقرہ "ظروفِ گل" بھی لکھا ہوا تھا۔ سر پرتاب نے اس کو نہ سمجھ کر اہلکار سے سوال کیا کہ "ظروفِ گل" کیا ہووے؟ اس پر جواب ملا کہ اتنے بڑے افسر ہو کر آپ کی سمجھ میں یہ فقرہ نہ آنا تعجب والی بات ہے۔ بس اسی سے خفا ہو کر انھوں نے دفتروں سے اردو کے

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس سنہ ۱۹۲۰ء میں منشی امیر الدین خاں صاحب نے راجپوتانہ کے مسلمانوں کے سلسلے میں فرمایا کہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پنڈت مدن موہن مالویہ کے خاص تعلقات مہاراجہ بیکانیر سے ہیں۔ اور پنڈت جی کی ہی ایک خاص ذات کا اثر تھا کہ سنہ ۱۹۱۱ء سے ریاست میں اردو کے بجائے ہندی زبان قرار دی گئی پتہ نہیں یہ تبدیلی سنہ ۱۹۱۱ء میں ہوئی یا سنہ ۱۹۱۲ء میں۔

اٹھائے جانے کا حکم دیا۔ سر سکھ دیو پرشاد جو انتظام نابالغی مہاراجہ جودھپور منتظم اعلیٰ تھے اپنی اردو دشمنی اور مسلم دشمنی کے لئے بدنام تھے۔ ان کے عہد اقتدار میں نہ صرف اردو کو بالکل فنا کر دیا گیا بلکہ مسلمان افسروں اور مسلمان جاگیرداروں کو بھی ختم کیا گیا۔

اودے پور بانسواڑہ

ریاست بانسواڑہ اور اودے پور میں ہمیشہ سے ہندی زبان اور ہندی رسم الخط رائج رہا۔ لیکن سنہ ۲۲-۱۹۲۰ء تک محکمۂ بندوبست، محکمہ مدبست اور محکمۂ آبپاشی میں اردو زبان فارسی رسم الخط کے ساتھ رائج تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ صورت ختم ہو گئی اور سنہ ۱۹۴۷ء تک اس حقیقت کے جاننے والے بھی خال خال رہ گئے۔ اس زمانے میں تعلیم گاہوں میں میٹرک تک اردو تعلیم کا بندوبست تھا

کہا جاتا ہے کہ اردو ریاست میواڑ میں سرکاری طور پر دفتری زبان کبھی نہیں رہی۔ اس سلسلہ میں جناب طاہر علی صاحب نے اپنے مقالے ریاست میواڑ میں اردو ہی تحریر فرمایا ہے کہ اس ریاست کے گئے گذرے زمانے میں بھی حکومت کی جانب سے جو حکم نافذ کیا جاتا اور عدالتوں ومحکموں میں جو کچھ کارروائی ہوتی تھی وہ سب کھڑی بولی میں ہوا کرتی تھی۔ رسم الخط صرف دیوناگری ہوتا تھا۔ یہ بھی کوشش کی جا رہی تھی کہ عربی اور فارسی الفاظ نکال کر

نوٹ: اس باب کی تکمیل پروفیسر حامی الدین خاں صاحب جے پوری کی ذاتی اعانت نیز انجمن ترقی اردو ہند کی کتاب "جائزہ زبان اردو" مطبوعہ ۱۹۴۷ء کی رہین منت ہے۔

ان کی جگہ سنسکرت اور ہندی کے الفاظ استعمال کئے جائیں چنانچہ تحریروں میں خال خال، ہندی اور سنسکرت کے الفاظ نظر آنے لگے تھے۔ البتہ یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ یہ زبان کب سے عمل میں آنے لگی تھی۔ رسم الخط بھی کسی زمانے میں عربی و فارسی تھا اس کے متعلق نمونے بند و بست و محکمۂ مال وغیرہ کے دفاتر ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اس ریاست میں عربی و فارسی کا چرچا عرصہ دراز سے ہے۔

گذشتہ تیس سال میں بھی یہاں اردو اور اسلامی علوم کی اشاعت کے لئے کئی کوششیں عمل میں لائی گئیں سب سے زیادہ اہم کوشش یہ ہوئی کہ اردو کو میواڑ سول سروس کے امتحانات میں شامل کر لیا گیا۔ اور فتح ہائی اسکول، مہارانا کالج، اودے پور نوبلز اسکول، مدرسہ طیبہ، مدرسہ انجمن تعلیم الاسلام میں اردو اور فارسی کی تعلیم کا انتظام جاری و کیا گیا ہے۔[۱]

---

[۱] بحوالہ مقالہ "ریاست میواڑ اور اردو" از او۔ ایس طاہر علی۔ رسالہ قومی زبان ۱ بہ جون ۱۹۵۸ء

باب - ۱۲

مدراس بمبئی - میسور - حیدرآباد دکن اور ممالک متوسط و برار

تمہید اضلاع دکن اور شمالی ہند کے لسانی مسائل میں ہمیشہ ایک نمایاں فرق رہا ہے۔ اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ تامل، ملایم، کنناری مرہٹی، تلنگی، وغیرہ زبانیں دکن تک محدود ہیں اور شمالی ہند میں ان کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ دکن میں صوبہ مدارس و بمبئی بنگال کی طرح انگریزوں کی سرگرمیوں کا اولین مرکز رہے ہیں۔ انگریزی زبان کے اجرا کی حد تک ان سب صوبوں میں تقریباً ایک سی پالیسی پر عمل درآمد ہوتا رہا ہے۔ لیکن جس شدت کے ساتھ بنگال کی مرکزی حکومت نے اس کلیہ پر عمل کیا بمبئی کی صوبائی حکومت نہیں کر سکی۔ جہاں تک تعلیم عامہ کا تعلق ہے ابتداء دور انگریزی میں صوبہ مدراس و بمبئی میں خاصہ کام ہوا

بمبئی ایجوکیشن سوسائٹی سنہ ۱۹۱۵ء میں قایم ہوئی تھی، ایک ایسی کتب کمیٹی نیز اسکول سوسائٹی سنہ ۱۸۷۷ء میں قایم ہوئی۔ لیکن اس وقت تک ان دونوں صوبوں میں بنگال کی طرح ہندو کالج جیسا ادارہ موجود نہیں تھا سنہ ۱۸۲۷ء میں جب الفنسٹن بمبئی سے روانہ ہوا تو شرفائے بمبئی نے جامعات میں یورپین پروفیسروں کے تقررات کا فیصلہ کیا اور سنہ ۱۸۳۰ء

میں پہلے پروفیسر ہارکین اور اردبیبر کا تقرر عمل میں آیا۔

صوبہ بمبئی میں مرہٹی۔ گجراتی۔ کناری۔ سندھی۔ اردو اور پرتگیزی زبانیں رائج تھیں۔ لسانی الجھاؤ اس صوبے میں بھی خاصہ تھا۔ چنانچہ یونیورسٹی ریفارم کمیشن سنہ ۲۵-۱۹۲۴ء کے روبرو جب یہ مسئلہ آیا تو اس نے حسب ذیل سفارش کی۔

"جہاں تک بمبئی (پریزیڈنسی) یونیورسٹی کا تعلق ہے، ہمارے خیال میں جامعہ میں ذریعہ تعلیم اور امتحانات کی زبان صرف انگریزی ہونی چاہیے البتہ دیسی زبانوں کی تعلیم اور ان کے امتحانات اس بات سے مستفیض ہوں گے۔ سنسکرت۔ فارسی اور عربی زبان کی تعلیم دیسی زبان میں دی جائے"

صوبہ بمبئی کے مسلمانوں کی زبان

ہندوستان کے دیگر صوبوں کے مسلمانوں کی طرح صوبۂ بمبئی کے مسلمانوں کی بھی فطری وابستگی عربی اردو اور فارسی زبانوں سے تھی۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں ایک اردو کانفرنس پونا میں منعقد ہوئی تھی اس کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے مولوی رفیع الدین بیرسٹر نے تو صوبہ کے مسلمانوں کی مادری زبان اردو قرار دی تھی۔ یہ بات خواہ صحیح ہو یا غلط تاہم یہ واقعہ ہے کہ صوبے کے مسلمان اردو سے فطری لگاؤ اور محبت رکھتے رہے۔ چنانچہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس سنہ ۲۴ء میں جو قائد اعظم محمد علی جناح کی دعوت پر بمقام بمبئی منعقد ہوا تھا۔ اینگلو اردو سکول کھولنے کی سفارش کی گئی تھی دوسری طرف مسلمانان بمبئی کو ایک بڑی کامیابی بھی اسی سال ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ بمبئی یونیورسٹی نے ایم اے تک امتحانات کے واسطے اردو زبان کو تسلیم

کر لیا تھا۔ چنانچہ اجلاس مذکورہ میں ایک رزولیوشن بطور شکریہ پاس ہوا تھا اور حکومت سے درخواست کی گئی تھی کہ طلبا کو پڑھانے کے واسطے بھی اردو و فارسی کے اعلیٰ قابلیت کے حامل اشخاص کا تقرر کیا جائے۔ آگے چل کر صوبہ کے دفاتر میں اردو کو مناسب مقام حاصل نہ ہو سکا۔ انگریزی کے رواج نے نیز دیسی زبانوں میں مرہٹی اور گجراتی کے اثر سے اہالیان صوبۂ بمبئی کی اردو زبان کا تلفظ کافی حد تک کمزور ہو گیا۔ نیز انگریزی سے عدم واقفیت اور اردو سے دوری کی وجہ سے مسلمانوں کا ملازمتوں میں حصہ بھی بہت کم رہ گیا۔

صوبہ مدراس :۔ سر تھامس منرو (۲۷ - ۱۸۱۵ء) مدراس کا پہلا گورنر تھا جس نے ملاقائی عوامی تعلیم کے مسئلہ پر سنہ ۱۸۲۲ء میں سب سے پہلے توجہ کی۔ اس نے سنہ ۱۸۲۶ء میں بورڈ آف پبلک ایجوکیشن قائم کیا۔ اس بورڈ کی ابتدائی کوشش سے دیسی تعلیم کے فروغ کے اسباب ظاہری پیدا ہوئے۔ لیکن عملی صورت سنہ ۱۸۴۱ء میں پیدا ہو سکی۔ جب ایک ہائی اسکول کھولا گیا جو مدراس یونیورسٹی اسکیم کا پہلا جزو تھا۔ ایک مشنری اسکول کھلا جو بعد کو مدراس کرسچین کالج کہلایا۔ خلاصۂ کلام سنہ ۱۸۴۳ء میں صوبہ بمبئی میں صرف (۲) اسکول تھے۔ جن میں انگریزی پڑھائی جاتی تھی۔ ایک اسکول میں پڑھنے والے طلبا کی تعداد ۱۴۲ تھی۔ اور دوسرے میں ۱۰۰ لڑکے تھے۔ سنہ ۱۸۳۵ء میں دیسی زبان اور انگریزی کے طلبا ۵۰۱۸ تھے۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں ۲۶۴۳، طالب علم تھے۔ الفنسٹن کالج میں ۶۸۱ - ۱۸۵۰ - ۵۱ء میں گورنمنٹ اسکولوں اور کالجوں میں ۶۰۴۳۱۳ طالب علم تھے۔ اور انگریزی ذریعہ تعلیم کے حامل طلبا ۲۰۶۶ تھے۔ سنہ ۱۸۳۷ء میں مدراس میں صرف ایک انگلش اسکول

قائم تھا۔ جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے۔ یہ اسکول بنگال کے ہندو کالج کے طرز پر قایم ہوا تھا اور بعد کو مدراس یونیورسٹی کہلایا۔ صوبہ مدراس میں مشنریوں کا کام خاصہ وسیع پیمانہ پر جاری تھا۔ انھوں نے سنہ ۱۸۵۲ء تک ۱۱۸۵ اسکول کھولے۔ مدراس کرسچین کالج میں دو تین سو طلبا کا اوسط رہتا تھا۔ ان تصریحات کا یہ خلاصہ ہے کہ جب سنہ ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے نے انگریزی زبان کے بارے میں جو مشہور زمانہ فیصلہ صادر کیا تو اس وقت بمبئی اور مدراس میں انگریزی زبان کے فروغ کے لیے ابتدائی کام شروع ہوچکا تھا۔ سنہ ۱۸۴۴ء تک فروغ انگریزی کی جملہ کوششوں کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوسکا تھا۔ جب لارڈ ہارڈنگ نے یہ فیصلہ کیا کہ سرکاری ملازمتوں میں ان لوگوں کو قطعی فوقیت دی جائے گی جو انگریزی داں ہوں گے نیز عوامی کاروبار کی زبان بھی انگریزی ہی قرار دے دی گئی تو اس زبان کی مقبولیت یا دوسرے لفظوں میں ضرورت بہت بڑھ گئی اور لوگ اس طرف توجہ دینے پر مجبور ہوگئے۔ آخرالذکر کارروائی کی افادیت کے بارے میں لارڈ ولیم بینٹنگ اپنے خیالات واضح طور پر سنہ ۱۸۲۹ء میں ہی ظاہر کرچکا تھا۔ لیکن چونکہ انگریز جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کرتا ہے، اس لئے عمل درآمد سنہ ۱۸۴۴ء کے بعد ہی ہوسکا۔

مشرقی زبانیں اور صوبۂ مدراس

صوبہ مدراس میں انگریزی زبان کے رواج کے سلسلے میں حکومت اور مشنریوں نے مسلسل جد و جہد کی۔ اس کے باوجود تقریباً چالیس پچاس برس تک مسلمانوں کی اجتماعی کوششیں فارسی اور اردو کی حیثیت برقرار رکھنے میں کامیاب رہیں پھر آہستہ آہستہ زوال کی آندھیاں صدیوں کے سرمائے کو بہا

لے گئیں۔

اسی بچاسی سال پہلے (تحریر سنہ ۱۹۳۰ء) مدراس میں اردو کی ترقی کا جو رجحان تھا وہ اس وقت کے حالات کے مدنظر بڑی تعریف اور ستائش کا مستحق ہے صوبہ مدراس میں اس وقت تلنگی۔ کنڑی، تامل وغیرہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ مگر ان میں سے ایک کو بھی صوبہ کی زبان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر کوئی زبان پورے صوبۂ مدراس میں مستعمل نظر آتی تھی تو وہ صرف ہندوستانی تھی۔

"افضل العلما ڈاکٹر محمد عبد الحق مدراسی اپنے مقالہ" انیسویں صدی میں مدراس کے اخبار میں رقم طراز ہیں،۔

"سنہ ۱۸۸۰ء سے سنہ ۱۸۹۰ء تک کا زمانہ مدراس میں اردو اخبارات کی ترقی کے سلسلہ میں منتہائے عروج کا تھا۔ اسی دور کے بعد یہاں کے اردو رجحانات کو بھی زوال شروع ہوتا ہے۔ اب تک مسلمانان مدراس میں فارسی اور عربی تعلیم کا چرچا تھا۔ اسی دور سے یہاں کی اردو صحافت کو بھی زوال شروع ہوتا ہے ——

—— لیکن سنہ ۱۸۸۰ء کے بعد مسلمانوں کے اعلیٰ اور متوسط طبقہ کے افراد میں فارسی اور اردو کی جگہ انگریزی نے لے لی۔ اور رفتہ رفتہ اخباروں کے دلدادہ حضرات کی تعداد میں خاصی کمی ہونے لگی۔ اس کے علاوہ کرناٹک کے انگریزوں کے حوالے ہونے کے بعد ہند ر

فارسی سے منہ موڑنے لگے۔"

سنہ ۱۹۴۱ء کی حالت

انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی مجلہ "اردو" میں اردو زبان کی صوبۂ مدراس میں کس مپرسی اور بے کسی کا حال ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

"اس امر پر بے حد تعجب ہوتا ہے کہ جس شہر میں بیک وقت آٹھ دس کامیاب ہفتہ وار اخبار جاری رہے ہوں، آج وہاں ایک بھی ایسا قابل الذکر ہفتہ وار اخبار نہیں ہے جو اپنی طباعت تحریر اور مضامین کے لحاظ سے دیگر صوبوں کے اخبارات کی برابری کر سکے"! [1]

خلاصۂ کلام مدراس میں ایک زمانے تک فارسی کورٹ اور دفاتر کی زبان رہی اس کے بعد اردو کا دور دورہ ہوا۔ سنہ ۱۹۰۰ء تک عدالتوں میں اردو مترجمین کا وجود ملتا ہے۔ اگرچہ اس وقت تک اردو عدالتوں کی حدود سے خارج کی جا چکی تھی۔ چنانچہ اسی سنہ ۱۹۰۰ء میں جب گورنر جنرل نے صوبہ مدراس کا دورہ کیا تو مسلمانوں کی انجمن مفید الاسلام نے ایک معروضہ پیش کیا کہ اردو کو بھی کورٹ کی ایک زبان قرار دیا جائے۔ گورنر کی جانب سے ایک ٹالنے والا جواب دیا گیا کہ اس درخواست کی منظوری سے بے شک مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا۔ لیکن

---

[1] یہ مقالہ ماہنامہ "اردو"، انجمن ترقی اردو ہند دہلی کی اشاعت اپریل سنہ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔

ہم کو یہ نہیں معلوم کہ کتنے مدراسی مسلمان ہندوستانی (اردو) بولتے ہیں۔

سنہ ۱۵۰۱ء میں جب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنا اجلاس مدراس میں منعقد کیا تو زبان کے مسئلہ پر حسب ذیل رزولیوشن پاس ہوا:۔

"یہ کانفرنس گورنمنٹ مدراس سے استدعا کرتی ہے کہ ہندوستانی (اردو) زبان کے سرکاری امتحانات سررشتہ میں بہ طور سرکاری زبان کے منظوری عطا فرمائے۔ نظر بریں کہ مسلّمہ السنہ میں سے زبان ہندوستانی کے شامل نہ ہونے سے ان مسلمانوں کو جو سرکاری ملازمت میں داخل ہوتے ہیں نقصان پہنچتا ہے۔"

مندرجہ بالا رزولیوشن پر بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ مسٹر مارلیسن جو انگریزی مفاد کے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ماحول میں ایک طرح کے خاموش نگراں تھے مخالفت میں بولے مگر نواب محسن الملک و خان بہادر مولوی بشیر الدین کی دلیرانہ تقریر نے رخ پلٹ دیا۔ ان دونوں بزرگوں کی تقاریر کے اقتباس حسب ذیل ہیں:۔

نواب محسن الملک:

"حضرات! مسئلہ زبان معمولی مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ دولت۔ تہذیب۔ شائستگی۔ علم اور ایمان کا مدار سب زبان پر منحصر ہے۔ جب زبان ہی ہم سے لے لی گئی تو در حقیقت سب چیزیں لے لی گئیں۔

خود ہماری غفلت سے نقصان ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ اسی مسئلہ

پر جو اس وقت پیش ہے۔ غور کیجئے چالیس برس ہوئے ہماری زبان ہمارا خط دفتروں سے اٹھ گیا اور ہم نے کچھ خبر نہ لی۔ اگر وقت پر ہم اس کی خبرگیری کرتے اور اپنی آنے والی مصیبت گورنمنٹ پر ظاہر کرتے تو یہ روزِ بد ہم کو کیوں نصیب ہوتا۔"

خان بہادر، مولوی بشیر الدین ۵

"حضرات: میں اردو کا سب سے بڑا حامی ہوں۔ اور میری رائے یہ ہے کہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی مادری زبان اردو ہے۔ میں نے ہندوستان میں کسی مقام پر خواہ بنگالہ ہو یا پنجاب، بمبئی ہو یا مدراس۔ کسی جگہ کسی طبقہ اور حیثیت کا مسلمان ایسا نہیں دیکھا جو اردو نہ سمجھتا یا نہ بولتا ہو۔ اگر کچھ فرق ہوگا تو تلفظ اور لہجہ کا تذکیر و تانیث کا یا غلط الفاظ بولنے کا لیکن کسی مقام کے کسی مسلمان سے بات چیت کرنے اپنا مفہوم سمجھانے یا اس کی بات چیت سمجھنے میں مجھے کبھی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

میری یہی رائے ہے کہ مدراس کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی نہ پانے کی وجہ صرف یہی ہے کہ اردو زبان عدالتوں سے خارج ہے۔ یہی رونا بنگال میں ہے۔ ایجوکیشن کمیشن (غالباً ہنٹر کمیشن) نے خاص مدراس کے مسلمانوں کی کمی تعلیم کی بابت یہ لکھا تھا کہ جن مقامات پر عدالتوں کی زبان ہندوستانی ہے وہاں کے مسلمان تعلیم میں کم نہیں ہوئے۔ لیکن جہاں عدالتوں کی زبان کوئی مقامی دوسری دیسی زبان ہے وہاں کے مسلمان تعلیم میں بمقابلہ اپنے ہم وطنوں کے کم ہیں۔ پس ان وجوہ سے میرے نزدیک ہندوستانی زبان

کی حمایت ہر ایک مسلمان کا فرض ہے "

ڈاکٹر ضیاء الدین:

" اگر کوشش برابر جاری رکھی جائے اور متفقہ طور سے کام کیا جائے اور گورنمنٹ میں ثابت کر دیا جائے کہ مسلمانوں کی عام تباہی کا باعث صرف ہندوستانی زبان کا عدالتوں سے اخراج ہے اور ان کا ترقی کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ ان کی زبان کو تسلیم نہ کیا جائے تو ضرور ایک نہ ایک دن کامیابی ہوگی "

تقریر حیدر شریف صاحب:

" ان کی (مسلمانان مدراس) کی انگریزی تعلیم سے لاپرواہی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی درخواستوں پر جیسی یہ درخواست ہے کہ ان کی مادری زبان ہندوستانی کو سرکاری دفاتر میں شامل کیا جائے اب تک کچھ التفات نہیں ہوا۔"

صوبۂ مدراس میں انگریزوں کی لسانی پالیسی

افسوس کے ساتھ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ سرکاری ملازمت میں مسلمانوں کی کمی تعداد اور ان کے اعلیٰ عہدے نہ پانے کے وجوہ میں ایک یہ بھی سبب ہے کہ سرکاری امتحانات سے ہماری مادری زبان کو خارج کر دیا گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ احاطہ مدراس

لے سابق ایڈیٹر البشیر اٹاوہ یوپی وبانی اسلامیہ کالج اٹاوہ

ﷺ رپورٹ اجلاس کانفرنس سنہ ۱۹۰۱ء صفحہ ۸۸ ۔

میں (۲۲) اضلاع ہیں۔ جہاں مختلف زبانیں تلنگو۔ کناری۔ اُڑیا وغیرہ بولی جاتی ہیں۔ جن میں سے ہر زبان کو گورنمنٹ نے ایک یا ایک سے زیادہ اضلاع کی زبان تسلیم کیا ہے۔ جس کا نتیجہ ہمارے لئے بے حد ضرر رساں ثابت ہو چکا ہے۔ تمثیلاً میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عدالت ہائے منصفی اور ججی میں عرضی دعوی وغیرہ اسی زبان میں پیش کرنے کا حکم ہے جہاں پر وہ زبان بولی جاتی تسلیم ہوئی ہے۔ درصورت عدم تعمیل اخراج مقدمہ کا حکم صادر کیا جاتا ہے علی ہذا عدالت ہائے مال میں بھی نالش یا تو انگریزی میں پیش کیجاتی ہے تو مقامی دیسی زبان مسلمہ گورنمنٹ میں۔

مسلمانوں کی مشکلات

چونکہ مسلمانان احاطۂ مدراس قومی حیثیت سے انگریزی یا اُن دیسی زبانوں کو جنھیں گورنمنٹ نے اس ضلع کی دیسی زبان قرار دیا ہے لکھنے پڑھنے سے قاصر ہیں۔ لہذا وہ مجبور ہیں اور انھیں عرایض نویسوں کو اجرت دینا پڑتی ہے . . . . علاوہ ازیں ریونیو اور جوڈیشل صیغہ جات میں سرکاری اعلیٰ عہدوں کے لئے علاوہ زبان مادری کے دو اور دیسی زبانوں کے سیکھنے اور ان میں امتحان پاس کرنے کی شرط لگائی گئی ہے۔ لیکن بدنصیبی سے منجملہ (۲۲) اضلاع کے کسی ضلع کی دیسی زبان اردو نہیں قرار دی گئی جس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ مسلمانوں کی قوم کسی خاص ضلع میں سکونت پذیر نہیں ہے "

اس کمزور بنیاد پر ہندوستانی زبان عدالتی زبان نہیں قرار دی گئی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ احاطۂ مدراس میں کوئی صدر عدالت ایسی نہیں ہے جہاں

گورنمنٹ کی طرف سے زبان اردو کا مترجم موجود نہ ہو۔ ہم نے بارہا گورنمنٹ سے مفصل اور مجمل طور پر اس کی بابت استدعا کی ...... تاہم نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلا

مدراس میں اردو بولنے والوں کی تعداد سنہ ۱۹۰۱ء میں

ضلع کشنا	۹۵۶۶۳
نلور	۶۴۶۹۴
کڈاپا	۹۶۷۲۳
کرنول	۷۸۱۸۲
بلاری	۷۴۵۲
انت پور	۴۱۳۰۴
مدراس	۵۰۰۵۷
شمالی ارکاٹ	۶۵۴۱

دیگر زبانوں کے اعداد و شمار

ضلع وزیگاپٹم	۲۷۰۰۱ اڑیا بولنے والے
ضلع نیلگری	۸۰۷۷۶ ملایم بولنے والے
ضلع کائمبٹور	۱۱۸ فی صد کناری بولنے والے

مندرجہ بالا اعداد کا جب ہندوستانی (اردو) بولنے والوں کی تعداد سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو انگریزوں کی یہ زیادتی صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔ کہ ضلع وزیگاپٹم کی لازمی زبان "اڑیا" ضلع نیلگری کے لئے "ملائم" تو تسلیم کر لی گئی۔ لیکن کشنا کڈاپا۔ کرنول میں اردو کو تسلیم نہیں کیا گیا۔

دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک صوبہ میں کئی کئی زبانوں کو منظور

کرکے جو انتشار پڑھے لکھے طبقے میں پھیلا اس کے نتیجے میں انگریزی کا بول بالا ہوا۔

پورے ۲۰ سال بعد ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس بمقام مدراس زیر صدارت سر شیخ عبدالقادر منعقد ہوا۔ اس کانفرنس میں زبان کے مسئلہ پر حسب ذیل رزولیوشن پاس ہوا۔

"جو تجربہ چند اسکولوں میں طلبا کے لئے اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کے متعلق کیا گیا ہے۔ اسے یہ کانفرنس بہ نظر استحسان دیکھتی ہے۔ اور گورنمنٹ سے درخواست کرتی ہے کہ بالخصوص آندھرا دیس میں اور بالعموم دیگر مدارس میں جہاں اس قسم کے حالات ہوں اس تجربے کی توسیع کرے"

مسلمانان مدراس کی پستی کے اسباب

کسی قوم کی پستی میں زبان کا کیا کردار ہوتا ہے۔ اس کا حقیقی نمونہ علاقہ مدراس میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مولوی غلام احمد کلامی نے مدراسی مسلمانوں کی زبوں حالی اور تعلیمی پستی کے حقیقی اسباب کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

"صوبہ مدراس کے مسلمانوں کا تعلیم سے فائدہ نہ اٹھانا اور سرکاری مدارس میں تعلیم نہ پانے کا سبب یہ بھی ہے کہ اول تو ہر ہائی اسکول میں ہندو اساتذہ ہیں اور تعلیم سے وہ رغبت اور خواہش ان کو نہیں پیدا ہو سکتی جو اپنے ہم قوم استادوں کے زیر نگرانی اور زیر تربیت ہو سکتی ہے

دوسرے مدراس میں تامل اور تلنگی زبانیں رائج ہیں
اور وہ اپنی خاص زبان میں تعلیم پانے سے مجبور ہیں۔
جنوبی ہند کے مسلمانوں کی تعلیم میں ہارج ہونے کے یہ
دو بڑے سبب ہیں جو ان کی سکنڈری تعلیم کو جب حاصل
نہیں کرنے دیتے تو کالج کی تعلیم کا کیا مذکور ہے"[۱]

ریاست میسور

سلطان حیدر علی اور شیر میسور ٹیپو سلطان کے دربار کی زبان فارسی تھی سلطان نے اپنی مشہور زمانہ کتاب "فتح المجاہدین" فارسی زبان میں ترتیب دی تھی سلطان کے دور میں اردو زبان کی بھی خوب ترقی ہوئی۔ سلطان نے اپنی بیان کردہ کتاب میں اُردو زبان میں مختلف فوجی نغمات درج کئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک نمونہ درج ذیل ہے

وقت آہستہ قدم

ملک ہندوستان میں دیں کا وہی سلطان ہے
غرق جس کے آب خنجر سے فرنگستان ہے
کیا ہے نسبت جاہ و حشمت میں سکندر سے تجھے
بارگاہِ قدر کا دارا ترا دربان ہے ....
ہے وہی انسان کامل جس میں ہو معنی کی بو
نقش دیبائی وگرنہ صورت انسان ہے ....

---

[۱] رپورٹ اجلاس کانفرنس صفحہ ۲۵۶ سنہ ۱۹۲۶ء

اصل کتاب برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ ٹیپو سلطان و حیدر علی کے دور میں اردو نثر و شاعری کو بڑا میدان ملا۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب "دکنی کلچر" میں مختصر تفصیل بھی درج کی ہے۔ یہ سبھا ٹیپو سلطان کی شہادت سنہ ۱۷۹۹ء کے ایک سال بعد اجڑ گئی اور علاقہ میسور کی زبان فارسی کے بجائے کنڑی اور انگریزی قرار پا گئی۔

زبان کی تبدیلی کا مسلمانان میسور پر اثر

دفتری زبان کی تبدیلی نے سیاسی اور فوجی محاذ پر شکست کھاتے ہوئے مسلمانوں کا بالکل ہی کچومر نکال دیا۔ اس دور کا ایک انگریز لکھتا ہے:۔

"حکومت کی تبدیلی کی وجہ سے بنگلور میں مسلمان تباہ حالت میں نظر آئے اس لئے کہ ان کی فوجی ملازمتیں ان کے ہاتھ سے نکل گئی تھیں اور یہ نئی حکومت کی فوجی یا سول ملازمت نہیں کرنا چاہتے تھے۔"[1]

مندرجہ بالا حالات کا یہ اثر ہوا کہ تمام سول ملازمتوں پر ہندوؤں کا قبضہ ہو گیا۔ مسلمان دانے دانے کو محتاج ہو گئے۔ پھر زبان کلچر اور تہذیب کا کیا سوال؟ اس طرح سلطان شہید کا قومی غداروں کو مخاطب کر کے یہ کہنا بالکل صحیح ثابت ہوا کہ:

"اس غداری کا نتیجہ تمھیں اس وقت معلوم ہوگا جب تم اور تمھاری آئندہ نسلیں اس ملک میں محتاج اور ذلیل ہو کر ایک

---

[1] اقتصادی رپورٹ ڈاکٹر وچا

ایک دانہ چاول اور پیاز کی ایک گنٹھی کو ترسیں گے "

سلطنت آصفیہ مرحوم

دکن میں مسلمانوں کا حقیقی اثر و رسوخ علاؤالدین خلجی کے دور میں شروع ہوا۔ جب ملک کا فور دھاوے کرتا ہوا سنہ ۱۳۱۰ء میں راس کماری تک جا پہنچا سیاسی اقتدار کا دوسرا دور محمد بن تغلق کے زمانے میں شروع ہوا۔ جب دولت آباد سابق دیوگڑھ کو دارالحکومت بنایا گیا تو اس تبدیلی کے نتیجے میں ہزاروں لاکھوں مسلمان بھی دکن منتقل ہوئے۔ محمد بن تغلق کے آخری دور میں دکن کے علاقہ پر سلطنت بہمنی کا ستارہ نمودار ہوا۔ اس دور میں مختلف حیثیتوں سے مسلمانوں کو بڑی نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ علمی ترقی بھی اپنے معراج پر پہنچی۔ اس کل زمانے میں دفتری اور درباری زبان بے شک فارسی رہی لیکن اردو زبان یا دکھنی زبان کو بھی خاصی ترقی نصیب ہوئی۔ تاریخ فرشتہ کی ضخیم جلدیں اس حقیقت پر گواہ ہیں۔ مدرسہ خواجہ گاواں کی یاد تو ہم میں سے اکثر اصحاب کے ذہنوں میں ابھی تک تازہ ہے۔

زوال سلطنت بہمنی کے بعد دکن میں ایک علمی مرکز بیجاپور کا عادل شاہی دربار تھا۔ یہ حکومت یوسف عادل شاہ نے سنہ ۸۹۵ھ میں قائم کی تھی۔ یہ سلطنت سنہ ۱۰۹۷ھ (۱۶۸۶ء) میں عظیم مغلیہ حکومت کا جزو بن گئی اس دور کے اکثر ادبی اور فارسی شہ پارے مُدوّن ہو چکے ہیں۔

حکومت بہمنی کے زوال کے بعد گولکنڈہ میں قطب شاہی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ اس سلطنت کا قیام سنہ ۱۵۱۲ء میں سلطان قلی قطب شاہ

کے ہاتھوں ہوا۔ اس خاندان کا سلطان قلی قطب شاہ ثانی اور محمد قطب شاہ بڑے پاکیزہ علمی ذوق کا حامل تھا۔ اس کے زمانے میں اردو زبان کو خاص ترقی حاصل ہوئی۔

دکن کا تیسرا مرکز علمی احمد نگر کا خانوادہ نظام شاہی تھا۔ یہ سلطنت بھی دکن کی دیگر سلطنتوں کی طرح علم وفن کی ترویج و اشاعت کا کام کرتی رہی۔ اس کے علاوہ برار کے عماد شاہی۔ ارکاٹ کے والا جاہی درباروں نے بھی اپنے مقدور کے مطابق مسلمانوں کی علمی۔ تعلیمی اور سیاسی سربراہی میں خوب خوب حصہ لیا۔ اردو زبان اور مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ سلطنت آصفیہ نے اپنے دربار اور عدالتوں کی زبان اردو قرار دی۔ بسنہ ۱۲۸۸ھ میں عدالتی زبان کا مسئلہ ارباب حکومت کے سامنے پیش ہوا۔ اس وقت یہ فیصلہ کیا گیا کہ نظمائے عدالت اپنی صوابدید کے مطابق گواہوں یا اہل معاملہ کے اظہار اردو میں قلمبند کر لیا کریں۔ تقریباً ۵ سال بعد صاف صاف حکم صادر ہوا کہ اظہار صرف اردو میں قلمبند ہوا کریں۔ لیکن اہل معاملہ اپنی درخواستیں فارسی اور اردو دونوں میں سے جس زبان میں چاہیں پیش کر سکتے تھے۔ اس دور میں دفاتر مال اور بند و بست اردو زبان میں تبدیل کر دیئے گئے دو سال بعد ایک اور حکم نافذ ہوا جس کے مطابق فیصلوں میں شہادتیں بجنسہٖ اردو میں لکھی جانا لازمی قرار دیدی گئیں۔ نیز جہاں کہیں اظہارات اور عبارتوں پر استدلال کرنے کی ضرورت پیش آئے تو بجنسہٖ وہی عبارت نقل کرنے کا حکم دیا گیا۔ جو شہادت کنندگان کی زبان سے اظہار میں کیا گیا ہو۔

مندرجہ بالا احکام سے دفاتر سرکاری میں دو عملی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

عہدیداروں کے جو اردو لکھنے پر قادر نہیں ہیں، کوئی عہدیدار سرکاری بغیر کسی خاص ضرورت کے سرکاری تحریرات انگریزی زبان میں نہ کیا کرے۔ مگر چونکہ پولیٹکل اور پرائیویٹ سکریٹری کی مراسلت کا زیادہ تر تعلق دفتر ریزیڈنسی و نیز یورپین عہدہ داروں سے ہے، لہذا دفتر مذکور اس خصوصیت میں مستثنےٰ ہے۔ یعنی اس وقت دفتر مذکور اور دوسرے دفاتر کے مابین اردو اور انگریزی میں جس طرح مراسلت ہوا کرتی ہے وہ حسب حال بحال ہے۔ فقط [1]

دستخط

مدار المہام بہادر سرکار معتمد

عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام سلطنت آصفیہ ختم ہو گئی۔ لیکن اس حکومت کے جو کارنامے تا قیامت زندہ رہیں گے۔ ان میں عثمانیہ یونیورسٹی اور دارالترجمہ کا قیام بھی شامل ہے۔ اس یونیورسٹی کا خیال سب سے پہلے سنہ ۱۸۸۰ء میں عماد السلطنت نواب سالار جنگ ثانی مدار المہام کے ذہن میں۔ نظام یونیورسٹی کی شکل میں پیدا ہوا۔

اگست سنہ ۱۹۱۵ء میں کلیہ جامعہ عثمانیہ کا افتتاح پہلے وائس چانسلر المعین الامیر جامعہ علی گڑھ کے نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے فرمایا۔ نواب صاحب مرحوم و مغفور قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا اعلیٰ نمونہ تھے شرافت۔ نجابت علمیت اور ساتھ ہی ساتھ دولت و حشمت کا آشنا عظیم اتصال

[1] بحوالہ رپورٹ انجمن ترقی اردو۔ مولوی عبدالحق اجلاس کانفرنس سنہ ۱۹۱۴ء راولپنڈی۔

اور مسلیں فارسی و اردو کی مخلوط ہوگئیں. کسی دفتر سے مراسلت اردو میں ہوتی تھی تو دوسرا جواب فارسی میں دینے لگا. یہی حال عدالتی فیصلوں کا ہوگیا چنانچہ ابتدائی فیصلے کے تقریباً بارہ تیرہ برس بعد یعنی سنہ ۱۳۰۱ھ میں ایک قطعی فیصلہ ہوا جس کا حکم نامہ ۲۲ ربیع الثانی سنہ ۱۳۰۱ھ کو جاری ہوا اس کے مطابق تمام دفاتر سرکار آصفیہ اردو میں منتقل کر دیئے گئے

مندرجہ بالا فیصلوں پر عملدر آمد کے دوران محسوس ہوا کہ فارسی کے بجائے انگریزی کا عمل دخل بڑھ رہا ہے. لہذا حکومت حیدر آباد نے مندرجہ ذیل سرکلر جاری کیا:

نقل گشتی فرمان محکمۂ سرکار

واقعہ ۲۲ شعبان سنہ ۱۳۳۱ھ نبوی

اہل نظر کو محسوس ہو رہا ہے کہ آخر چند سال کے عرصہ میں دفتری تحریرات میں ایک قسم کا ناپسندیدہ تغیر ہو رہا ہے. جا و بے جا انگریزی الفاظ کا استعمال روزافزوں ترقی کر رہا ہے. جس سے نہ فقط عوام و رعایا اور عموماً غیر انگریزی داں لوگوں کو سرکاری تحریرات کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے. بلکہ اس سے مسلمانوں کی مادری زبان مخلوط ہو کر خراب اور بہت سی صورتوں میں باعث مضحکہ ہو جاتی ہے. اس لئے عام طور پر اطلاع دی جاتی ہے کہ تحریرات میں غیر مانوس انگریزی الفاظ کا استعمال بالکلیہ ترک کیا جائے. اکثر اوقات یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ بعض عہدہ دار معمولی اردو روبکارات کا جواب انگریزی میں لکھتے ہیں جس سے عملہ اور اہل معاملہ کو بڑی دقت پیش آتی ہے اس لئے عام طور پر حکم دیا جاتا ہے کہ سوائے یورپین

بہت کم دیکھنے میں آتا ہے نواب صاحب مرحوم نے عم محترم سید الطاف علی صاحب بریلوی سے جامعہ عثمانیہ کی کہانی بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ بیان کیا کہ اعلیٰ حضرت فرماں روائے دکن سے یونیورسٹی کے واسطے تقریباً ایک کروڑ کی رقم کی منظوری لینے کے واسطے ان کا ہی انتخاب کیا گیا تھا. نظام دکن خود تو درویش صفت آدمی تھے. لیکن اس بڑی رقم کی منظوری دینے میں ایک لمحہ کا توقف نہیں کیا. اور ایک لفظ پوچھے بغیر دستخط کر دیئے. قیام پاکستان کی نعمت غیر مترقبہ کے حصول کی خاطر ہم کو جو عظیم قربانیاں دینی پڑیں اس میں جامعہ عثمانیہ. جامعہ علی گڑھ سب سے قیمتی اثاثے ہیں. بقول ڈاکٹر محمود حسن "اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی مخالفت کرنے والوں کے لئے جامعہ عثمانیہ کی طرز تدریس ایک ایسی مثال کی حیثیت رکھتی ہے جس کی تردید کوئی باشعور شخص نہیں کر سکتا۔

(تقریر یوم تاسیس انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ جنگ کراچی مورخہ ۲۲ ستمبر سنہ ۲۲ ستمبر ۱۹۶۹ء)

جامعہ عثمانیہ محض آرٹس اور علوم مشرقیہ کی تعلیم تک محدود نہیں تھی. بلکہ اس میں طب، سائنس، انجینئرنگ. قانون. دینیات. غرض جملہ علوم متداولہ کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام تھا. دارالترجمہ حیدرآباد میں سنہ ۱۹۲۲ء تک تین سو کتابوں کا ترجمہ ہو چکا تھا. مشہور بنگالی ادیب و شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام پر سر اکبر حیدری کے نام جو مکتوب ارسال کیا تھا اس کا اقتباس حسب ذیل ہے.

"میں مدتوں سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا. جب غیر ملکی زبان کے

الطواق و سلاسل سے آزاد ہو کر ہماری تعلیم بالطبع تمام اہل ملک کے لئے قابل الحصول ہو جائے گی۔ اس وقت کی حالت تو یہ ہے کہ ہمارے اہل ملک کو گویا پیدائش کے وقت سے ایک ہندوستانی زبان بولنے کی سزا مل رہی ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے مواقع سے ایک حادثۂ اتفاقی کی وجہ سے محروم ہیں۔ جس کے لئے انھیں شرمندہ یا رنجیدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ جب تک ہندوستان میں موجودہ صورت حال مُروّج ہے، اس وقت تک یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ علم و تہذیب کی دولت عامہ میں ہمارے ملک کو اس کی حقیقی جگہ مل سکے گی۔

یہ ایسا مسئلہ ہے جس کے حل کے لئے ہماری آنکھیں دیسی ریاستوں کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اور مجھے نہایت مسرت ہوئی کہ آپ کی ریاست ایک جامعہ قایم کرنے کی تجویز کر رہی ہے جس میں تعلیم اُردو کے ذریعہ سے ہوگی۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ آپ کی تجویز کو میری کامل پسندیدگی حاصل ہے۔[1]

خلاصۂ کلام قیام پاکستان سنہ ۴۷ء۱۹ میں حیدرآباد دکن کے علاقوں میں اردو زبان کی کیفیت یہ تھی کہ یہ زبان اس وقت نہ صرف مسلمانوں کی مادری زبان تھی بلکہ غیر مسلموں کی اکثریت کی بھی مادری زبان تھی۔ مثلاً راجپوت۔ کایستھ۔ کھتری۔ اور لودھا بلاتکلف اس زبان کو استعمال کرتے تھے اور آج بھی یہ عمل بڑی حد تک جاری ہے۔

---

[1] تقریر سید عبدالرزاق مترجم کورٹ اکولہ اجلاس کانفرنس ناگپور ص ۱۵۳ سنہ ۱۹۱۰ء

صوبجات متوسط و برار

یہ علاقہ مغلوں کے زوال کے زمانے میں مرہٹہ حملہ آوروں کی مسلسل آمد و رفت کی وجہ سے خاصا پامال ہو چکا تھا سیاسی اقتدار کی کمزوری کی وجہ سے مسلمانوں کے مضبوط ٹھکانے اور گڑھ بھی تباہ ہو گئے تھے اس وجہ سے اس کُل علاقے میں مسلمانوں کی اقلیت خاصی کمزور ہو گئی تھی پھر بھی اپنی جفاکشی، دلیری اور بہادری کی بنا پر انھوں نے اپنا ایک مقام پیدا کر لیا تھا۔ جب تک اردو اور فارسی کا بول بالا رہا مسلمان تدریجاً سرکاری دفاتر میں نظر آتے رہے۔ غالباً ۱۸۵۵ء میں جب اردو کا خاتمہ ہوا تو قسم کھانے کو مسلمان اہلکاروں کا ملنا دشوار ہو گیا۔ سنہ ۱۹۰۲ء تک صوبہ برار ایک علیحدہ علاقہ تھا اور اس علاقہ کا ہر محکمہ ایک جداگانہ حیثیت رکھتا تھا لیکن جب برار کا علاقہ سی پی (صوبجات متوسط) میں مدغم کیا گیا تو یہ محکمے بھی ختم کر دیے گئے۔ اس فیصلہ سے نقصانات پہنچے ان میں مسلم نصابی کتب کمیٹی کا خاتمہ بھی تھا۔ یہ کمیٹی ڈاکٹر نیکل ناظم تعلیمات برار نے مسلم اراکین پر مشتمل بنائی تھی۔ اسی دور میں مسلمانوں کے واسطے علیحدہ اردو مدارس بھی کھولے گئے تھے۔ صوبہ برار پر ریاست نظام کا بھی جائز دعویٰ تھا لیکن انگریزوں نے ان کو محض پچیس چھبیس لاکھ سالانہ کی ادائیگی پر ٹال دیا۔ اور شہزادہ دکن ولیعہد نظام کو پرنس آف برار کے خطاب سے خوش کر دیا تھا۔

سی۔پی میں مسلمانوں کی تعلیمی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندی اور مرہٹی زبانیں رہی ہیں۔ چونکہ یہاں کی زبان مرہٹی قرار دیدی گئی تھی اس لئے مدارس میں بھی عموماً مرہٹی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ چونکہ مسلمان اپنے بچوں کو اردو پڑھانا چاہتے تھے

اس لئے وہ مرہٹی کے سرکاری مدارس سے کنارہ کش رہے. جب مسلمانوں نے بہت احتجاج کیا تو سنہ ۱۹۰۳ء–۰۴ کے لگ بھگ گورنمنٹ نے اس طرف توجہ کی اور چند اردو اسکول کھولنے کے علاوہ مرہٹی اسکولوں میں اردو کلاسوں کا اضافہ کر دیا. سنہ ۱۹۰۵ء تک مسلمانوں میں جمود کی کیفیت طاری رہی. چونکہ مسلمانوں کی تعداد کم تھی نیز ان میں بیداری بھی نہیں تھی اس لئے علیحدہ اسکول قایم نہ رہ سکے. صرف برار کے علاقہ میں یہ اسکیم کسی حد تک کامیاب رہی [1]

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ. سی. پی کے مسلمانوں کی تباہی و بربادی سے غافل نہیں تھی. مسلمانوں کے بچوں کو جس قسم کے ناکارہ نصاب سے واسطہ تھا. اس کے متعلق کانفرنس کے اجلاس میں زیر صدارت عبداللہ یوسف علی سنہ ۱۹۰۱ء حسب ذیل رزولیوشن پاس ہوا:-

"یہ کانفرنس گورنمنٹ ممالک متوسط و برار سے با ادب مستدعی ہے کہ ممالکِ متوسط کے اردو مدارس کا کورس بدل دیا جائے اور بجائے اس کے صوبہ پنجاب کا کورس داخل کیا جائے. کیونکہ ممالک متوسط کا موجودہ کورس ہندی کتب کا ترجمہ ہے. ان کتابوں کی زبان مسلمانوں کی اپنی زبان نہیں ہے. اور بعض سبق جو ہندو مذہب کے متعلق ہیں، وہ نہ مسلمان لڑکے سمجھ سکتے ہیں اور نہ آیندہ زندگی میں وہ ان کے کسی کام آسکتے ہیں"

کانگریس راج میں اردو کا مسئلہ

یہ تو اس وقت کی داستان ہے جب انگریزی راج اپنی اصلی حیثیت میں ہندوستان پر مسلط تھا. جب غلامی کی زنجیریں ذرا

---

[1] بیان مسٹر شکلا وزیر اعظم سی پی مورخہ ۱۷ ستمبر سنہ ۳۹ء بحوالہ کتاب سی پی میں کانگریس راج از حکیم اسرار احمد کریوی صفحہ ۱۰۰

کمزور پڑنا شروع ہوئیں اور صوبوں میں کانگریسی حکومت قایم ہوئی تو واردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیموں کا اعلان کیا گیا۔ ابتداءً برادران وطن ہندوستانی سے مراد ایسی زبان لیتے تھے جو سادہ الفاظ پر مشتمل ہو اور ہندی اور اردو رسم الخط میں لکھی جا سکے۔ لیکن جب اقتدار ہاتھ میں آیا تو مادری زبان کی تشریح حسب ذیل الفاظ میں کی گئی

۔ مادری زبان سے مراد اس علاقہ کی اکثریت کی زبان ہے جہاں اسکول واقع ہو۔ [1]

مسلمانوں کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ "مادری زبان" کے معنی طالب علم کی حقیقی مادری زبان سمجھے جائیں نہ کہ علاقہ کی اکثریت کی زبان۔ علاقہ کی اکثریت کی زبان کے اصول کو اگر مان لیا جاتا تو مسلمانوں کی مادری زبان اردو کا نام و نشان باقی نہیں رہتا۔

بیان افتخار علی قاضی ایڈووکیٹ [2]

اس سلسلہ میں قاضی افتخار علی ایم۔ ایل۔ اے نے جبل پور میں تقریر کرتے ہوئے ثابت کیا کہ واردھا اسکیم میں بھی جس کی بنا پر ودیا مندر اسکیم کا نصاب تیار کیا گیا ہے۔ مادری زبان سے طالب علم کی مادری زبان مراد لی گئی ہے نہ کہ علاقہ کی اکثریت کی مادری زبان۔

نواب صدیق علی خاں کا راست اقدام

زبان کے مسئلہ پر سی پی کے مٹھی بھر مسلمان خم ٹھونک کر کھڑے ہو گئے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے بھی

---

[1] بیان مسٹر شکلا وزیر اعظم سی پی مورخہ ۱۴ ستمبر سنہ ۱۹۳۸ء بحوالہ کتاب "سی پی میں کانگریس راج" از حکیم اسرار احمد کریوی صفحہ ۱۸۰

[2] افتخار علی قاضی صاحب ایڈووکیٹ کراچی ہی میں قیام پذیر ہیں اور اب بھی قومی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

ایک رزولیوشن پاس کیا جس میں مسلمانوں کے موقف سے اتفاق کیا گیا تھا۔
۲۶ جنوری ۱۹۳۹ء کو سی پی کے مقتدر رہنما نواب صدیق علی خاں میدان عمل میں اتر آئے۔ یہ ایجی ٹیشن اس حد تک بڑھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو مداخلت کرنا پڑی بالآخر ۷ فروری سنہ ۱۹۳۹ء کو لیاقت شکلا معاہدہ عمل میں آیا۔
سنہ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان آزاد ہوا تو برادرانِ وطن نے سب معاہدے دریا بُرد کر کے ہندی اور صرف ہندی کا بول بالا کر دیا۔

آزادی کے بعد جنوبی ہند میں اُردو

آزادیٔ ہند کے بعد شمالی ہند کے ساتھ ساتھ جنوبی ہند بھی ہندی سامراج کی لپیٹ میں آگیا۔ اس حصۂ ملک میں ہندی زبان کو واحد سرکاری زبان بنانے کے خلاف مسلمانوں سے ہزار گنا زیادہ برادران وطن خلاف تھے۔ لیکن ایک پیش نہ گئی۔ جناب احمد اللہ خاں مدیر جمہور بنگلور۔ (ریاست میسور) دکن میں اردو کی داستان آزادیٔ وطن کے بعد اس طرح بیان کرتے ہیں۔

جنوبی ہند میں کوئی بھی اگر یہ معلوم کر سکتا ہے کہ یہاں ہندی کس زبان کا نام ہے۔ برار۔ حیدرآباد۔ جنوبی مہاراشٹر۔ کرناٹک (بشمول ریاست میسور) تامل ناڈ۔ ٹراونکور۔ کوچین۔ اور کورگ کی آبادی مجموعی تیرہ چودہ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ راقم السطور ان علاقوں کے اندرونی حصوں سے بھی واقف ہے۔ ۱۴ کروڑ میں سے ۶ کروڑ سے زیادہ وہ زبان بولتے ہیں جنھیں وہ ہندی یا اردو ہندوستانی کہتے ہیں۔ برار اور حیدرآباد۔ آندھرا کے بارہ اضلاع شمالی

سرکار (آندھرا کے شمالی اضلاع ، جنوبی مہاراشٹر (بمبئی سے بلگام تک کا علاقہ) اسبلی - دھارواڑ - منگلور - مدراس اور بنگلور کے درمیان واقع مدراس کے اضلاع (شمالی ارا کاٹ - ریاست میسور کے مغربی شمالی اضلاع اور جنوب میں ضلع میسور میں آپ کو اردو بولنے والے اور سمجھنے والے ہر دس میں پانچ افراد ملیں گے (لب ولہجہ یوپی سے بہت مختلف ہوگا۔) اس زبان کا یہاں ایک اور نام ہے وہ ہے دکنی زبان ۔ تمل ناڈ کے انتہائی جنوب میں ضلع مدورا کے صدر مقام مدرے (مدورا) میں تین سو سال سے آج تک ایک زبان بولی جاتی ہے۔ اس زبان والے اسے دکنی زبان کہتے ہیں اور یہ عام طور پر مسلمان ہی بولتے ہیں۔ مگر ہندو ہمسائے اس زبان کو ہندی کہتے ہیں ۔ اس طرح تمل ناڈ کا ایک اور ضلع تنجاور ہے۔ اس کے صدر مقام تنجاور میں فصیح و بلیغ دکنی بولی جاتی ہے۔ دکنی دکنی کے محاورے اور اس کے روزمرہ اپنی پوری فصاحت و بلاغت کے ساتھ یہاں آج تک اپنا سکہ جمائے ہوئے ہیں۔ یہ زبان یہاں کے مرہٹی ہندوؤں اور مسلمانوں کی مادری زبان ہے یہ لوگ اس کا نام دکنی بتاتے ہیں مگر دوسرے ہندو اور مسلمان جن کی مادری زبان تمل (تامل) ہے اسے ہندی بھی کہتے ہیں ۔ اور ہندوستانی بھی۔ واضح رہے کہ مدورا آبادی اور تجارت کے لحاظ سے لکھنؤ اور کانپور سے بڑا شہر ہے۔ تنجاور بھوپال کا ہم پلہ ہے۔

جنوبی ہند میں جہاں تک دراوڑی زبانوں ، (تلنگو۔ تامل ۔ کنڈی اور ملیالم وغیرہ) کا سکہ چلتا ہے وہاں ایک اور نام دکنی کے لئے عام طور پر بولا جاتا

ہے۔ یہ نام ہے تلکرو، یا ترک رو۔ پہلے عربی۔ فارسی کے لئے یہی نام تھا۔ جنوبی۔ جنوب مشرق اور جنوب مغرب ہند کے ان تمام شہروں میں جہاں چھاؤنیاں تھیں اردو یا ہندی عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کا امتیاز نہیں کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ نیز ان تمام شہروں میں اردو، یا ہندی مادری زبان ہے۔ اور کاروباری بھی۔ جہاں مرہٹوں کی حکومت رہی جیسے تنجاور، بنگلور، بلہاری، ہبلی، دھارواڑ وغیرہ۔ سارے جنوبی ہند میں برار سے لے کر راس کماری تک مرہٹوں کے لاکھوں خاندانوں کی دو زبانیں مادری ہیں۔ ایک اردو اور دوسری مرہٹی۔ اسی فیصد ہنود کے یہاں جو کرناٹک کے مشرقی علاقوں میں ہیں، رسم الخط اردو (فارسی) ہے۔ اسی طرح رایل سیما کے اکثر اعلیٰ ذات کے ہندو چار صدیوں سے اردو رسم الخط رکھتے ہیں۔ شعر و شاعری بھی ایسے لوگوں نے اسی زبان میں کی ہے۔

ریاست میسور کے راجپوت ہندو خاندانوں کی زبان اردو یا ہندی ہے۔ یہ اعداد و شمار۔ مردم شماری کی ۱۹۲۱ء کی رپورٹوں میں مل سکتے ہیں۔

بحوالہ ہماری زبان۔ کانپور اردو نمبر بابت ۱۱ فروری سنہ ۱۹۵۶ء
ایڈیٹر احمد حسین پھلواری مرحوم

باب ۱۳

بلوچستان

بلوچستان کے مختلف علاقوں، تلات، مکران، خاران اور لسبیلہ وغیرہ کی جغرافیائی تقسیم کے ساتھ زبان بھی کسی قدر بدلی ہوئی نظر آتی ہے مغربی بلوچستان میں بلوچی زبان عام طور پر بولی جاتی ہے۔ اس علاقہ کی دوسری عام پسند بولی پشتو ہے۔ بلوچی زبان کا دائرہ ایران کے صوبہ کرمان تک پہنچتا ہے، اس بولی کا فارسی زبان سے گہرا تعلق ہے۔ مشرقی بلوچستان میں سندھی اور بروہی زبانوں کا چلن ہے۔ شمال و مشرق میں سرائیکی، بلوچی اور پشتو میں بولیاں بولی جاتی ہیں۔ کوئٹہ شہر زبانوں کے لحاظ سے اپنے دامن میں بکھرنگی دنیا سمیٹے ہوئے ہے۔ اور یہ شہر حقیقتاً عروس اللسان کا درجہ رکھتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں جس خطے میں اس قسم کے حالات پائے جاتے ہیں وہاں اردو زبان کا قدرتاً دور دورہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اردو دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔

بلوچستان کے مشہور قبیلے مینگل۔ بزنجو وغیرہ کی زبان بلوچی ہے۔ بروہی زبان ساہروان جھالاوان قبائل کے ساتھ مخصوص ہے۔

بروہی زبان پر بھی فارسی اور کسی قدر پشتو اور بلوچی بولی کا اثر ہے۔ مقامی زبانوں

میں بروہی کسی قدر دشوار طلب ہے۔ اس میں اب مذہبی کتب کا اچھا خاصہ ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔ سنہ ۱۸۴۴ء میں ایک انگریز سیاح چارلس میکسن نے لکھا تھا کہ :

"اس زبان میں واحد علمی کام جس کا مجھ کو علم ہوا وہ بھی کوئی تخلیقی کام نہیں تھا بلکہ خداوند قدوس کی شان کبریائی و ربوبیت کے بارے میں فارسی حروف میں ترجمہ پر مشتمل تھا"[1]

سابق بلوچستان کا کوئٹہ ڈویزن پشتونوں کا علاقہ ہے۔ جہاں پشتو کے کئی نامور شاعر گزرے ہیں۔ ان میں پیر محمد کاکڑ اور ملا عبدالسلام کا کلام بلند پایہ ہے۔ کوئٹہ کے علاقے میں علامہ عبدالعلی خان کا پشتو ادب میں خاص مقام ہے۔

سابق صوبہ "لس" (ابتدائے عہد انگریزی میں "لس بیلہ" کو علیحدہ صوبہ تحریر کیا گیا ہے) کے باشندوں کی زبان پر سندھی بولی کا اثر غالب تھا۔ لیکن دربار کی زبان فارسی تھی۔ معزز اور مقتدر سردار بخوبی فارسی بولتے اور سمجھتے تھے جس کا تذکرہ متعدد انگریزوں کے سفر ناموں میں ہوا ہے۔ جو ہماری نظر سے گزرے ہیں

ڈاکٹر انعام الحق کوثر اپنی معرکۃ الآرا کتاب "بلوچستان میں اردو" میں لکھتے ہیں :-

"انگریزوں کی آمد سنہ ۱۸۷۶ء کے بعد جلد ہی اس خطے کے اندر دفاتر میں اردو بروئے کار آنے لگی۔"

---

[1] سفر نامہ چارلس میکسن مطبوعہ لندن سنہ ۱۸۴۴ء

لیکن اردو زبان و ادب نے اس علاقہ میں بسنے والے باشندوں کی ذہنی تربیت میں بہت کم حصہ لیا۔ وجہ یہ تھی کہ بلوچستان میں انگریزی استبداد بری طرح چھایا ہوا تھا۔ کل دورِ انگریزی میں مدرسوں کی تعداد نوے سے آگے نہ بڑھی۔ تقریر و تحریر کی آزادی کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ یہاں کے تعلیمی نصاب پر پنجاب یونیورسٹی اسکولوں و کالجوں اور مدرسوں کے نصاب کا خاصہ اثر رہا ہے۔ انگریزی۔ فارسی اور عربی مضامین کسی نہ کسی شکل میں شامل نصاب تھے۔ جو بلوچی کراچی کے لیاری کے علاقوں میں آباد ہو گئے تھے وہ زیادہ تر اپنی مادری زبان مکرانی۔ بلوچی و سرائیکی بولتے تھے۔ جب ابتدائی لازمی تعلیم سنہ ۱۹۲۰ء کا زور بندھا تو لیاری میں بھی مدرسے کھولے گئے، لیکن وہ منجملہ اور باتوں کے اس وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے کہ پڑھانے والے غیر مسلم مقامی بولیوں سے عموماً نا واقف ہوتے تھے۔ کراچی شہر میں ہمیشہ بلوچستان سے آنے جانے کا سلسلہ لگا رہا ہے۔ لیکن یہ رفتار سنہ ۳۶، ۱۹۳۵ء میں بہت بڑھ گئی تھی۔ جس پر اس زمانے کے پارسی میئر نے بڑی پریشانی کا اظہار کیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اس سیلانی آبادی کو خاصہ استحکام ہو گیا۔ اور اب تو ماشاء اللہ قوم کا قافلہ رواں دواں ہے۔

بلوچستان میں اردو کا مستقبل شاندار ہے کیونکہ یہی وہ واحد زبان ہے جو ہمارے مختلف تہذیبی عناصر کو یکجا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ چنانچہ بلوچستانی علاقوں میں مقامی زبانوں کے علاوہ علمی اور تہذیبی زبان اردو ہی ہے۔ چنانچہ گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں اردو ایم اے تک پڑھائی جاتی ہے۔ نیز خضدار سنڈیمن لورالائی۔ مستونگ کے کالجوں میں اردو کو نمایاں مقام حاصل ہے یہاں

کی لائبریری میں بھی اردو کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اردو زبان و شاعری سے بلوچی زبان میں بڑی وسعت پیدا ہوئی۔ بلوچی زبان میں قیام پاکستان سے قبل شاعری کا وجود نہیں تھا۔ جو اردو زبان کے اثر سے جاری ہوگئی۔ اردو کی افادیت کو محسوس کرتے ہوئے گورنر نور خاں نے بھی بلوچی سرداروں و عوام کو نصیحت کی کہ اردو پر دسترس حاصل کریں۔

حوالہ جات:

۱۔ بلوچستان میں اردو۔ از ڈاکٹر انعام الحق کوثر مطبوعہ سنہ ۱۹۶۸ء

۲۔ پاکستان میں اردو۔ از خاطر غزنوی۔ مقالہ ڈاکٹر اکبر حسین مطبوعہ
ر ، صفحہ ۹۴

۳۔ جائزہ بلوچستان از چارلس میکین مطبوعہ سنہ ۱۸۴۴ء

۴۔ یادداشت مسٹر ہیتہ میئر کراچی کارپوریشن سنہ ۱۹۳۵ء

۵۔ پانچ سالہ تعلیمی جائزہ اسکول بورڈ کراچی از ڈاکٹر گڈوانی

باب ۱۴

صوبہ سرحد

صوبہ سرحد میں مسلمانوں کو ہمیشہ عددی اکثریت حاصل رہی ہے یہاں کے باشندے فطرتاً بڑے بہادر، جفاکش اور تنومند ہوتے ہیں۔ تعلیمی پسماندگی، غربت اور افلاس اس علاقہ پر چھایا ہوا ہے۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں صوبہ سرحد کی خواندگی کا اوسط ڈیڑھ فی ہزار تھا۔ پورے ضلع اٹک میں صرف ایک شخص گریجویٹ تھا۔ جب چند دیگر اشخاص کو بی اے کرنے کا موقع مل گیا تو یہ خوش خبری مسلمانان ہند کے عظیم تعلیمی اجتماع بمقام راولپنڈی سنائی گئی۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا یہ اجلاس سنہ ۱۹۱۴ء میں منعقد ہوا تھا۔

مسلمانان سرحد کی پسماندگی کے کئی سبب ہیں۔ (۱) مثلاً سیاسی افراتفری (۲) آپس کے اختلافات اور (۳) جاگیردارانہ نظام

سیاسی افراتفری انگریزی حکومت کے قیام سے تقریباً چالیس سال قبل کا زمانہ مسلمانان سرحد کے واسطے بڑے امتحان کا دور تھا۔ سکھوں کی چیرہ دستیاں حد سے گذر چکی تھیں۔ کیپٹن جیمیس لکھتا ہے:

"سنہ ۱۸۰۰ء سے لے کر سنہ ۱۸۲۰ء تک پشاور میں متواتر ہلچل

بھی رہی۔ سکھوں کا وقتاً فوقتاً اس سمت میں آنا وہاں کے باشندوں کے لئے بلائے جان تھا۔ ان کا وہاں پہنچنا اس امر کی علامت تھی کہ مال و متاع اور جنس قیمت اسباب کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے یہاں تک کہ دروازے اور کھڑکیاں تک نکال لی جاتی تھیں عورتیں اور بچے کثیر تعداد میں گھر بار چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے اور ملک میں جلا وطنوں کی نوآبادیاں نظر آیا کرتی تھیں یہ قابل نفرت دشمن (سکھ) جہاں تک آگے بڑھتے تمام قطعہ ملک کو برباد کرتے جاتے اور جو کچھ سامنے آتا اسے تاخت و تاراج کرتے اور کھیتوں اور زراعت کو تباہ کر دیتے۔ وادی کے دہانہ سے لے کر دریائے سندھ تک شاید ہی کوئی ایسا موضع ہو جسے سکھ فوجی افسر نے نہ لوٹا ہو اور وہاں آگ نہ لگائی ہو۔ اس ملک میں آج بھی سفر کرتے وقت بوڑھے جن کی لمبی سفید ڈاڑھیاں اور چہروں پر کثرت سے زخموں کے نشان ہیں، ان پہاڑیوں کی نشان دہی کرتے ہیں جہاں سکھ بھیڑ بکریوں کی طرح ان کو ہنکا دیتے تھے۔ اور لوگ اب تک ان مقامات کو بتا سکتے ہیں جہاں ان کے آباء واجداد لڑ بھڑ کر گرے تھے "

جاگیر دارانہ نظام اور آپس کے اختلافات

صوبہ سرحد کو سکھوں اور انگریزوں سے بھی زیادہ آپس کے اختلافات نے شدید نقصان پہنچایا۔ کیپٹن جیمس نے ایک مقامی سردار کی "قوم فروشی" کی بڑی افسوس ناک داستان اس طرح بیان کی ہے:

"چمکیان کے سردار کو سکھوں نے جن شرائط پر آراضی دی تھی ان میں سے ایک شرط یہ تھی کہ ہر سال میں آفریدیوں

کے سرپیش کئے جائیں۔ بڈھا سردار ان دغابازیوں کو بیان کرنے سے نہیں شرماتا ہے۔ جو اس شرط کی تکمیل کے لئے اسے بعض اوقات عمل میں لانا پڑتی تھیں۔"

مسلمانان سرحد نے بحیثیت مجموعی سکھوں اور ان کے بعد انگریزوں کے عمل دخل کو کبھی بھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔ ان کو جب بھی موقع ملتا تھا مردانہ وار مقابلہ کرتے تھے۔ سکھوں کے عہد کے آخری دور میں کیپٹن ایڈورڈ نے بندوبست آراضی کی غرض سے ایک مضبوط سکھ فوج کے ہمراہ صوبہ کے طول و عرض میں دورہ کیا تھا اس کی ڈائری میں جا بجا دلاسا خان جیسے غازیوں کے واقعات ملتے ہیں۔

کیپٹن ایڈورڈ کی ڈائری کا ایک اقتباس حسب ذیل ہے:۔

۱۶ر مارچ سنہ ۱۸۴۷ء کیمپ کلی

"آج صبح سکھ فوجیوں کے بقول اس مہم کا مقصد حاصل ہو گیا۔ کیونکہ ملک دلاسا خاں حاضر ہوا اور اپنے آپ کو میرے روبرو پیش کر دیا۔ اس کا نام سکھوں کے واسطے خوفناک ہے وہ سکھوں کی نسل کے ہر فرد سے انتہائی خطرناک حد تک نفرت کرتا ہے۔ (ان کی بربریت کی وجہ سے)

حُلیہ۔ وہ ایک بوڑھا آدمی ہے تقریباً ستر سالہ۔ لیکن اس کے خدوخال، کشادہ پیشانی۔ خشمگیں آنکھیں بتاتی ہیں کہ اس میں نوجوانی کی گرمی برائے نام ہی کم ہوئی ہے۔ اپنی سادہ

گفتگو، اور آزادانہ اطوار کے مطابق اس نے اخفائے راز کی قطعی کوشش نہیں کی۔ اس نے کہا میں اپنے آپ کو آپ کے روبرو پیش کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ آپ صاحبان کا وعدہ مثل قسم کے سچا ہوتا ہے۔ (اس زمانے میں انگریزوں نے اپنی سچائی کا جھوٹا پروپیگنڈا کر رکھا تھا) اگر سکھ ایک لاکھ آدمی بھی بھیجیں تو مجھ کو حاصل نہیں کر سکتے۔ . . . . . .
وہ بڑی شان کے ساتھ صرف پچاس ساٹھ گھوڑے سوار ساتھیوں کے ہمراہ آیا میں اس کو اس کے ساتھیوں کے ساتھ دیکھ کر گھبرایا نہیں۔ کیونکہ اس کے آنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے کیمپ میں پھیل گئی تھی۔ اور میرا خیمہ بھورے بالوں والے بوڑھے سکھوں نے گھیر رکھا تھا۔ جو اپنے قدیم دشمن کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اسکول کے بچوں کی طرح کشمکش کر رہے تھے۔ (مجلس) ناکام ہوئی اور ملک دلاسا خاں اپنے ساتھیوں سمیت دلیرانہ زبردستی کے ساتھ سکھ کیمپ سے، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چلا گیا۔ اور کسی کو مقابلہ کرنے کی جرات نہیں ہوئی۔"

قدرتی بات ہے کہ جب ملک میں ایسی افراتفری پھیلی ہو تو کیسا ادب اور کہاں کی شاعری۔ ادیب و شاعر بھی در بدر ٹھوکریں کھانے لگے۔ سرحد میں دو طبقے ہمیشہ سے پائے جاتے ہیں، ا۔

(۱) جاگیردار

(۲) مزدور پیشہ اور زراعت میں مشغول لوگ ۔

اس وقت بھی صوبہ سرحد کی تقریباً ساٹھ فی صد آراضی بڑے بڑے خاندانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ کھیت کے مزدوروں کی حالت انتہائی سقیم ہے۔

کھیت مزدور کو صرف پندرہ روپے مہینہ (یہ سات آٹھ سال قبل کی تحریر ہے، ممکن ہے اب کچھ زائد ہو۔) اور معمولی کھانا ملتا ہے اور کام کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ صبح منہ اندھیرے سے رات تک اسے بیل کی طرح جتنا پڑتا ہے۔ اس پندرہ روپے کی قلیل ترین رقم میں اسے اپنے کنبے کا پیٹ بھی پالنا ہوتا ہے۔ میں نے ایسا کوئی کھیت مزدور نہیں دیکھا جسے کوئی بیماری نہ ہو۔ نیم فاقہ کشی نے ان میں بیماریوں کے مقابلہ کی طاقت باقی نہیں چھوڑی اس قسم کے مزدوروں کی زیادہ تعداد ضلع پشاور اور مردان میں ہے[۱]

جب خوانین سرحد نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ بھیجنا شروع کردیا اور جب یہ نوجوان واپس آئے تو قومی خدمت کا ایک جذبۂ عظیم ان کے سینوں میں موجزن تھا۔ یہ لوگ صوبے کے گھٹے ہوئے ماحول میں ابر رحمت ثابت ہوئے۔ دوسری طرف اسلامیہ کالج پشاور نے صوبہ سرحد کی کایا پلٹ دی۔

اسلامیہ کالج پشاور کا قیام

صاحبزادہ عبدالقیوم خان اور چند دیگر بزرگوں کا اس صوبے پر زبردست احسان ہے۔ کیونکہ ان کی کوششوں کے نتیجہ میں پشاور میں ایک ایسی معیاری درسگاہ قایم ہوئی جس کا فیض مسلسل

جاری ہے۔ سر ہارٹ کورٹ بٹلر نے اس کالج کے بارے میں بالکل صحیح کہا تھا:

درۂ خیبر کے سامنے ایشیا کی اس مشہور شاہراہ پر کھڑے ہو کر میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے تصور اور قوتِ متخیلہ پر اس آئندہ روشنی کا زبردست اثر پڑ رہا ہے۔ جو اس اسکول اور کالج سے نہ صرف اس صوبے میں بلکہ ایشیا کے دور و دراز گوشوں میں منعکس ہو کر پھیلے گی۔"

زبان۔ اس کالج کے قیام کے نتیجہ میں پٹھانوں کی تہذیب، تمدن، اور معاشرت۔ غرض جملہ شعبہ ہائے حیات متاثر ہوئے۔ عوام و خواص بیرونی زبانوں کے علوم و فنون سے واقف ہوئے۔ نتیجہ پشتو ادب کی ترقی کی شکل میں نکلا۔

پشتو زبان اپنی قدامت کی وجہ سے ایک خاص افتخار کی مالک ہے اردو زبان میں پشتو کے بیسیوں الفاظ رائج ہیں۔ اس مماثلت کی وجہ یہ ہے کہ اس علاقہ کے بیسیوں قبیلے روہیلکھنڈ۔ یو۔ پی۔ فرخ آباد۔ ٹونک اور بھوپال وغیرہ میں جا کر آباد ہو گئے تھے، رفتہ رفتہ ان کی بولی اردو میں ضم ہوتی گئی اور ان کی یادگار میں محدود تعداد میں پشتو الفاظ کا وافر ذخیرہ فراہم ہو گیا حافظ الملک حافظ رحمت خاں والیٔ روہیلکھنڈ (شہادت سنہ ۱۷۷۴ء) پشتو زبان کے مشہور شاعر تھے۔ اگرچہ کلام محفوظ نہیں رہ سکا۔ اسی طرح

مقالہ صوبۂ سرحد کے کسان اور سیاسی تحریکات۔ از مسٹر اور نگزیب بحوالہ کتاب "اٹک کے اس پار" ص ۳۲۰۔ از خاطر غزنوی بخاری و رضا ہمدانی

ان کے فرزند نواب محبت خاں محبت پشتو زبان کے صاحب دیوان شاعر تھے ان کی ایک تصنیف "ریاض المحبت" کا بھی پتہ ملتا ہے۔ حافظ رحمت خاں کے دوسرے صاحبزادے نواب اللہ یار خاں نے بھی ایک کتاب "عجائب اللغات" نامی پشتو زبان میں تحریر کی جو لندن میوزیم میں محفوظ ہے [۱]

جہاں تک قومی زبان کا تعلق ہے صوبہ سرحد میں اردو زبان پہلے سے رائج ہے۔ اس صوبے میں اردو میٹرک تک لازمی مضمون کی حیثیت رکھتی ہے۔ یونیورسٹی میں ایم اے اردو کی کلاسیں سنہ ۱۹۵۶ء سے جاری ہوئیں کالجوں میں آرٹس کے جملہ مضامین انٹرمیڈیٹ تک اردو میں پڑھائے جاتے ہیں۔ سرحد کے دور دور پہاڑی علاقوں میں اردو کا دور دورہ ہے۔ جیسیوں کتابیں اردو میں چھپ چکی ہیں۔ رسالے اور اردو روزنامے جاری ہیں۔

اس صوبے میں عدالتی فیصلوں کے علاوہ جملہ کام اردو میں ہی انجام دیا جاتا ہے۔ [۲]

---

[۱] سید الطاف علی بریلوی نے حیات حافظ رحمت خاں میں نواب اللہ یار خاں کے حال میں لکھا ہے: "عالم و محقق بھی تھے۔ انھوں نے پشتو اور ہندوستانی زبان کی ایک مبسوط لغت تیار کی تھی جو اب دستیاب نہیں ہوتی۔

[۲] مقالہ علاقہ سرحد میں اردو۔ از جناب پروفیسر شرر نعمانی صاحب بحوالہ کتاب "پاکستان میں اردو" از پروفیسر طاہر فاروقی و خاطر غزنوی صفحہ ۱۱۳

باب - ۱۵

کشمیر

ریاست کشمیر خوب صورت وادیوں، برف پوش پہاڑوں اور دلفریب نظاروں کی سرزمین ہے۔ لیکن اس خطۂ ملک کے حسن کو عوام کی بے پناہ جہالت اور افلاس و نکبت نے غارت کر دیا ہے۔ کسی قوم کے علم و ادب، زبان اور کلچر کی ترقی اسی وقت ہوتی ہے جب تعلیم کے ذریعے اس کا دماغ کھل جاتا ہے۔

تعلیمی حالت

عام کشمیری مسلمانوں کی تعلیم سے بے تعلقی کا یہ حال تھا کہ اکثر اسکول ان کے بچوں سے یکسر خالی پائے جاتے تھے۔ یہ انکشاف آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس علی گڑھ سنہ ۱۹۲۳ء میں کریم بخش (محکمۂ تعلیم سرحد) خان بہادر جعفر حسین نے حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے:

تقریر مولوی کریم بخش:-

> کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی ۹۵ فی صدی ہے۔ مگر باوجود اس کے تعلیمی تنزل کا یہ حال ہے کہ میں نے آٹھ دس مدرسے دیکھے ان میں ایک بھی مسلمان نہ تھا"

مندرجہ بالا انکشافات کے یہ معنی نہیں کہ مسلمانوں کو علم سے رغبت نہیں تھی، بلکہ معاشی اور ملکی حالات نے ان کو مجبور کر دیا تھا۔ جیسا کہ خان بہادر جعفر حسین صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا:

تقریر خان بہادر جعفر حسین:۔

"کشمیر میں مسلمانوں کو پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ ۸۰ فی صد قرآن خواں ملیں گے۔ اکثر دوکاندار قرآن خواں ہیں میرے سامنے ایک کشمیری لڑکا جو مشن میں پڑھتا تھا عیسائی ہوا۔ تو تمام کشمیر میں شور مچ گیا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کا کوئی مدرسہ نہیں تھا۔ اس پر ایک مدرسے کی تحریک ہوئی اور سنہ ۱۹۱۳ء میں ایک مدرسہ قایم ہوا اور پھر اس کی جابجا شاخیں کھلیں، یہ سب کچھ کشمیری مسلمانوں کی ذاتی کوشش تھی۔ حکومت کی طرف سے کچھ مدد نہیں ملی۔"

تاریخی سرگزشت:

کسی علاقہ یا ملک کی حالیہ کیفیت کا ماضی قریب و بعید کی تاریخ سے ایک گہرا ربط و تعلق ہوتا ہے۔ کشمیر کی قدیم تاریخ ہماری بحث سے خارج ہے۔ اس علاقہ میں علم و ادب کی محفلیں سب سے پہلے سلطان زین العابدین کے عہد میں شروع ہوئیں (تخت نشینی سنہ ۸۲۶ھ) جس میں اس کی کوششوں سے ہندوؤں کو فارسی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چونکہ فارسی دربار کی زبان تھی۔ اس لئے بھی غیر مسلموں کی توجہ کا خصوصی مرکز بن گئی۔ مولانا علم الدین سالک لکھتے ہیں۔

"آج بھی اگر کسی کو دور دراز علاقہ میں جانے کا اتفاق ہو، اور وہ کشمیری زبان سے بے بہرہ ہو تو فارسی کے ذریعے وہ وہاں کے لوگوں پر اپنا مافی الضمیر ظاہر کر سکتا ہے۔ مجھے جب کبھی پیدل سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ اور کسی ایسے گاؤں میں جانا پڑا جہاں کشمیری کے سوا وہاں کے رہنے والے کوئی اور زبان نہ جانتے ہوں تو فارسی زبان کی بدولت میں انھیں اپنے دل کی بات سمجھا سکا۔"

نوٹ۔ کشمیر کے پہاڑی دور دراز علاقوں میں ایک زبان "گوجری" بھی بولی جاتی ہے۔ جو اردو سے قریب تر ہے۔

کشمیری زبان پر فارسی کا اثر

فارسی زبان کے رواج پا جانے سے کشمیری زبان پر بڑا خوشگوار اثر پڑا۔ ایک تو کشمیری زبان کو فارسی رسم الخط مل گیا۔ دوسرے فارسی زبان کے ہزارہا الفاظ اور تراکیب کشمیری زبان میں داخل ہو گئے جن کی بدولت کشمیری زبان میں نہ صرف وسعت پیدا ہوئی بلکہ بیان میں رنگینی تخیل میں بلندی اور اسلوب میں ندرت پیدا ہو گئی۔ فارسی کے بہت سے قصے مثلاً لیلیٰ مجنوں۔ وامق و عذرا۔ اور شیریں خسرو۔ وغیرہ کشمیری نظم میں منتقل ہو گئے۔ فارسی کی بدولت تصوف کشمیری زبان میں داخل ہوا۔ سلطان زین العابدین کے زمانے میں سنسکرت اور عربی کتابوں کے تراجم فارسی میں ہوئے۔ اس کے زمانے میں "راج ترنگنی" کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔

ڈوگری زبان کا مسئلہ

کشمیر پر جب گلاب سنگھ ڈوگرہ کا خاندان قابض ہوا تو فطری طور پر، ان لوگوں کی خواہش تھی کہ عوام کی مرضی کے علی الرغم ریاست کی زبان ڈوگری قرار دے دی جائے۔ ڈوگری زبان کا رسم الخط مہاجنی رسم الخط سے ملتا جلتا ہے۔ اور بہت کچھ ترمیم و تنسیخ کے باوجود یہ عام تعلیمی اور دفتری زبان کا درجہ حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ سب سے بڑی خرابی اس زبان میں یہ ہے کہ ایک کی تحریر کردہ ڈوگری دوسرے کی سمجھ میں صحیح طور پر بمشکل ہی آتی ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور میں فارسی کے ساتھ ساتھ ڈوگری میں درخواستیں دینے اور حسابات ڈوگری میں رکھے جانے کی زبردست کوششیں ہوئیں۔ لیکن فارسی کی مقبولیت اور ہمہ گیری نے اس زبان کا چراغ نہیں جلنے نہیں دیا۔ ریاستی دفاتر میں فارسی کے بجائے اردو۔ برطانوی ہند کی تقلید میں رائج ہوئی۔ صحیح تاریخ کا ہم کو علم نہیں۔

ریاست میں اردو کی مقبولیت کے ذرائع

مہاراجا کشمیر کا باڈی گارڈ ریاست رام پور (یوپی، روہیل کھنڈ) کے خوبرو اور شاندار روہیلہ النسل افغانوں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ رواں رواں اردو بولتے تھے۔ جس کے اثرات محلاتی ماحول میں لازمی پڑے ہوں گے۔ سنہ ۱۸۶۲ء میں پادریوں نے بھی اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا دائرہ اس ریاست میں پھیلادیا۔ سنہ ۱۸۸۸ء میں پادری ینگسن نے باقاعدہ لٹریچر اردو زبان میں پھیلانا شروع کردیا۔ سنہ ۱۸۸۵ء میں والیٔ ریاست پرتاب سنگھ کو ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کرنے کا خیال آیا جس میں فارسی، انگریزی۔ ہندی اور اردو کی قلمی و مطبوعہ کتابیں بڑی تعداد

میں مہیا کی گئی تھیں۔ عدالتوں میں اردو کا رواج پنڈت بھاگیرا ج جج ہائی کورٹ کے ہاتھوں نفاذ پذیر ہوا۔

سنہ ۱۹۳۶ء تک ریاست میں اردو کا رواج بغیر کسی خاص مخالفت کے جاری رہا لیکن جب نمایاں اختلافات سامنے آئے لگے تو حکومت کی جانب سے ایک کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا جس کے صدر خواجہ غلام السیدین اور ایک رکن ڈاکٹر ذاکر حسین تھے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ سنہ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کمیٹی نے اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے حق میں فیصلہ دیا۔ لیکن حکومت نے سفارشات مسترد کرتے ہوئے حکم دیا کہ :۔

"اسکولوں میں آسان اردو رائج کی جائے۔ لیکن اس کے لکھنے اور پڑھنے کے لئے فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخط استعمال ہوں گے"

اب عملاً یہ ہوا کہ دیوناگری رسم الخط کی ترویج واشاعت کے واسطے اساتذہ کا ہندی جاننا لازمی کر دیا گیا۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں ریاستی اسمبلی کے گرمائی اجلاس میں لالہ دینا ناتھ نے تجویز پیش کی کہ :

"ہندو لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے پرائمری اسکولوں میں ہندی کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔ اس تجویز کی تائید طرا لدکس کول نے ان الفاظ میں کی :۔

"پانی ہوا اور دیگر لوازمات زندگی کے بغیر انسان زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن کوئی قوم اپنی زبان اور اپنے تمدن وتہذیب کے

بغیر زندہ نہیں رہ سکتی "

مندرجہ بالا تحفظات ذہنی کے تحت اردو و فارسی زبان کو ریاست سے خارج کرنے کی مسلسل کوششیں جاری ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مہربانی کی بدولت مقبوضہ کشمیر میں ابھی تک اردو کا جھنڈا بلند رہے۔ خوش قسمتی سے آزاد کشمیر میں بھی اردو کو ہر مرحلہ پر سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ آزاد کشمیر میں سینکڑوں مدرسوں۔ اسکولوں اور کالجوں میں اردو زبان ذریعہ تعلیم ہے۔ اگر زبان کے معاملہ میں بھی دیگر صوبجات ہند کی طرح کشمیر میں بھی تبدیلیاں ہو جاتیں تو مسلمانان کشمیر کی مظلومی کا درجہ مقرر کرنا تقریباً ناممکن ہو جاتا۔

حوالہ جات :-

۱۔ مقالہ "کشمیری زبان و ادب" از میر غلام احمد کشفی

۲۔ کشمیر مسلمانوں کے عہد میں از مولانا علم الدین سالک

۳۔ کشمیر میں اردو، از حبیب کیفوی

(بحوالہ سالنامہ ادبی دنیا۔ کشمیر نمبر۔ لاہور۔)

۴۔ رپورٹ اجلاس کانفرنس علیگڑھ سنہ ۱۹۲۳ء

۵۔ پاکستان میں اردو، از خاطر غزنوی۔

ضمیمہ

"الف"

ابواب۔ ابواب قاسم خاں۔ ابواب جعفر خاں۔ ابواب شجاع خاں۔ ابواب صوبہ داری آب کاری۔ عدالت۔ عدالت دیوانی۔ عدالت فوجداری۔ اہک۔ احکام نامہ اخراجات۔ اخراجات ارنگ۔ اقطاع۔ آلتمغا۔ امانت دفتر۔ امانت۔ دفتر امیر۔ امیرالامرا۔ طومار۔ ذاتی۔ عملہ۔ ارباب۔ ارباب المال۔ متصدی۔ احشام احشام عملہ۔ احشام سپاہی۔ اشرف دیوان وزارت۔ آصف۔ اصل۔ اصل طومار جمع۔ امانی۔ امین۔ عامل۔ عمل دار۔ عملی۔ عمل نامہ۔ ارنگ۔ آوردہ نویس ایمہ۔ مذکورات۔ ایمہ داران۔ ایمہ دار۔ آزمائش۔

"ب"

بابو۔ باغات۔ بہادری بخشی۔ باقی۔ باقی کفایت۔ بنیا۔ بنا۔ بازار۔ بعضی۔ بعضی خرج۔ بعضی دفعہ۔ بعضی جمع۔ بعضی زمین۔ زمین دفتر بعضی۔ بی بی۔ بی بی نذر۔ بی بی۔ نذر۔ بیگارہ۔ بیکار۔ بیگھا۔ بیگم۔ بھیکھی۔ بھیکہ۔ بلاد۔ بہادری بھائی خلعت۔ بیر بندی۔ بیں۔ بلاشرط و مشروط۔ بلاشرط۔ برج باسی۔ برت بدرقہ۔ بخشیان اعظم۔ بند۔ بستن۔ بندہ والا۔ بارگاہ۔ بندر۔ بندوبستہ بیگارا برق انداز۔ برسات۔ بٹائی۔

"س، ق، ک"

قبولیت۔ قانون گو۔ قاضی۔ قاضی القضات۔ چاکران۔ چیلا۔ چراغی۔ چراغ چوار۔ چوکیدار۔ چوکی۔ چوتھ۔ چوتھ مرہٹہ۔ چوتھائی۔ چودھری۔ چوکیداری

چوب دار۔ چکلا۔ چونا۔ سرکار۔ سرکار۔ سرکار۔ سرکار عالی۔ سرکار مرمت۔ کھلاڑی۔ مرمت۔ کروہ۔ قول۔ قول نامہ۔ کرور۔ کروری۔ از کرور۔ قصبہ۔ کچا۔ کچہری۔ قطعہ۔ کتوال۔

"د" "ڈ"

دادنی۔ دادنی ملنگیاں۔ داؤ۔ از داشتن۔ داروغہ۔ دارالضرب۔ دام۔ دکمن جمع کامل۔ ڈکیت۔ ڈکیتی۔ دہ دار۔ دہ داری۔ دہ خرچہ۔ دہسالہ خرچ درو بست۔ در۔ بست۔ انعام۔ دیشوار۔ دیوان۔ دیوانی۔ دیوھرا۔ دول۔ بندوبست۔ دفعدار۔ دفتر۔ دفتر بند۔ از دفتر۔ دفتر خانہ۔ دفتر خانہ۔ دنبالہ دھرنا دربار۔ دربار خرچ۔ دربار۔ خرچ۔ دسادیس۔ دسہرا۔ خرچ۔ دستور۔ دستور چاکراں۔ دستورالعمل۔ دستور۔ ال۔ عمل۔

"الف" "ع"

اہتمام۔ اہتمام بندی۔ اہتمام دار۔ اجارہ۔ اجارہ دار۔ انعام۔ انعامات۔ انعام کی جمع۔ انعام دار۔ عیدین۔ افسانہ۔

"ف"

فقیر۔ فاخرالتجار۔ فارخ خطی۔ فصل۔ فیل خانہ۔ فردش لنک۔ فرمان۔ فوجدار۔ فوج۔ دار۔ فوج داران۔ فوج دار کی جمع۔ فوجداری۔ فوج داری ابواب۔ فوج دار۔ فوج سہبندی۔ فصلی۔ فصل۔ فصل خریف۔ فصل ربیع۔ فتوی۔

"گ"

گانو۔ گانگانہ۔ گھاٹ وال۔ گھاٹوار۔ گمی۔ گمی۔ گردآور۔ گرد وار۔ گدع۔ گددغ

گماشتہ ۔ گماشتن ۔ گوشوارہ ۔ گوینده ۔ گفتن ۔ خرچ ۔ گنج ۔

"ح" "ہ"

حقیقت ۔ حقیقت جمع ۔ حاکم ۔ حال داری ۔ حال ۔ دار ۔ داری ۔ حال حقیقت ۔ حارس ۔ حاصل ۔ حاصل کھلاڑی ۔ حاصل نمک ۔ ہست و بود ۔ حویلی ۔ ہاٹ ۔ ہزاری ۔ ہزار ۔ ہزاریاں ۔ ہزاری ۔ ہندو ۔ حصہ ۔ حساب ۔ حساب خرچ ۔ حدود ۔ حد کی جمع ۔ حسب الوصولی ۔ حضور ۔ حضوری ۔ حضور ۔

"الف"

اجارہ ۔ اجارہ دار ۔ استمرار ۔ استمراری ۔ استمرار دار ۔ استمراری ۔

"ج"

جائے گیر ناوارہ ۔ جائے گیر تھانہ جات ۔ جائے گیر ۔ جا ۔ گیر ۔ ی ۔ جائے گیر تن ۔ جائے گیر سر ۔ جائے گیر بخشی ۔ جائے گیر سرکار ۔ جائے گیر دیوانی ۔ جائے گیر تھانہ ہات ۔ جمع ۔ جمعبندی نقدی ۔ جمعدار ۔ جمع کامل ۔ جمع خرچ ۔ جمع توماری ۔ جمع واصل باقی ۔ جناجات ۔ جنگل تر بیبیان ۔ جریبی کی ۔ جریب ۔ جزیہ ۔

"ق" ۔ "ک" ۔ "خ"

قادم ۔ قرار جمع دہ سالہ ۔ کامل ۔ کفایت ۔ کفایت ہست و بود ۔ کفایت سایر کھیدا ۔ کھیدای انیال ۔ قسم وار ۔ قسموار گوشوارہ ۔ خراجی ۔ کہان ۔ کاہن ۔ خالصہ خالصہ شریف ۔ خام جھٹا ۔ خام وصول ۔ خانہ ۔ خانہ ۔ خارج جمع ۔ خاص ۔ خاص نویسی خاص ۔ نویسی ۔ خریف ۔ خیرات ۔ خلعت ۔ خرچ ۔ گرام ۔ خرچ ۔ خود کاشت خود ۔ خود ۔ کاشتن ۔ خوش باش ۔ خوراک افیال ۔ خرچ ۔ خرچ ۔ خرچہ ۔ خرچہ

خرچہ صدر ۔ خدمت گار ۔ قطعہ دار ۔ قیمت خشت گور ۔ قسمت ۔ قصاص ۔
قسط ۔ قسط بندی ۔ خشت گور ۔ کوت ۔ قرآن ۔ قدم رسول ۔ کلوار ۔ کمی ۔ کنگال
خرچ ۔ خرچہ ۔ قصور ۔ کچا ۔ کیال

"ل"

لاخراج ۔ خراج ۔

"م"

مدرسہ ۔ مہتران ۔ محصول ۔ محصول سائر ۔ محصول ۔ محصولی ۔ مال ۔ مالگزار ۔
مالگزاری ۔ مال گزاشتن ۔ مالگزاری تحصیل کل ۔ مال ضامن ۔ مال ضامنی
مالک ۔ مالکانہ ۔ مالک ۔ معمول ۔ مرمت ۔ متفرقات ۔ مقبوضہ فیل خانہ ۔ متموٹ
موضع ۔ موضع دار ۔ موضع ۔ میراث ۔ میراث دار ۔ میراثی ۔ محال ۔ محل ۔
مال ۔ مہالی ۔ مہماں ۔ ملکیت ۔ ملکیت استمرار ۔ من ہا ۔ مبیعی ۔ مقدم ۔ مقدمی
مقدم ۔ مقرر ۔ مقرری ۔ مقرر ۔ مقرری دار ۔ مداخل ۔ مفصل ۔ مفصل دیوانی
عدالت ۔ مور ۔ محترفہ ۔ مقدم ۔ مخارج ۔ ملنگی ۔ مفتی ۔ مولوی ۔ منشی ۔ متعینہ
مشاہرہ ۔ موضع ۔ موضع دار ۔ موضع ۔ معین ضابطہ ۔ مچلکہ ۔ مچلکہ این دارد
مقرری ۔ مدد ۔ مدد معاش ۔ مجرائی ۔ مجرا ۔ مجموعہ دار ۔ مجموعہ ۔ دار ۔
ملا ۔ منصف ۔ منصب ۔ منصب دار ۔ منصب داران ۔ منصب دار
کی جمع ۔ مرمت ۔ مذکور ۔ مذکورات ۔ مذکورہ کی جمع ۔ مذکوری ۔ مشاہرہ
ملکگزاں ۔ مشروط ۔ مشروط تھانہ جات ۔ مسند ۔ متصدی ۔ مزروعہ ۔ موزونات
موزون ۔ ۔

"ن"

ناب۔نائب ناظم۔ وار۔ واری۔نانکار۔ نان۔ وار۔ نایب۔ ناظم ناظر۔ ناظر جمعدار۔ نیابت۔ نیکداری نیم سالی۔ نمکی۔ نمک۔ نگاہ بان۔ نصفت۔ نیکواریاں۔ نرخ۔ نرخ بندی۔ نظام۔ نظارت۔ نظامت عدالت۔ نوارا۔ آرا۔ اراسن۔ نواری عملہ۔ نقد۔ نقدی۔ نالا۔ نقب زنی۔ نذر۔ نذرانہ۔ نذر۔ نذرانہ حال۔ نذرانہ مقرری۔ نذرانۂ منصور گنج۔

"ع" "الف"

عملہ۔ عامل۔ انار۔

"پ"

پادی۔ پایباقی۔ بادی۔ باقی۔ پیکان۔ پیک کی جمع۔ پانام پیٹی شریک۔ پنچوترا۔ پنچوترہ۔ کفایت۔ پاسبان۔ پان۔ پان مالا — پائے مالی۔ پیر۔ پیشوا۔ پیادہ۔ پرگنہ۔ پرگنات الجمع۔ پیش کار۔ پیش کار۔ پیش کش۔ پیش۔ کش۔ پل بندی۔ پشتہ بندی۔ پشتہ۔ پشتی۔ بندی۔ پتا۔ پتاجناجات۔ بنیا۔ خرچ۔ پنکدار پتواری۔ پایکاری کاریدن۔ پائی۔ پایکاشت۔ پائی۔ کاشتن۔ پائیکاشت۔ پیک۔

"ر"

راجوار۔ وار۔ راہ براں۔ راہ بر کی جمع۔ راہ۔ بر۔ راہ بر۔ راہ داری راہ۔ داری۔ داشتن۔ راجوار۔ وار۔ راضی نامہ۔ راضی۔ نامہ۔ رقمی

رقم وار ۔ روبکار ۔ روبکاری ۔ روانہ ۔ روانیدن ۔ را ہایاں ۔ روزینہ داران
روزینہ دار ۔ روزینہ ۔ روز ۔ ربیع ۔ رقبہ ۔ روپیہ ۔ رسوم ۔ رسم کی جمع ۔ رسوم نظارت
رسوم زمینداری ۔ رسد ۔ رسد جمع ۔ رعیت ۔ رعی ۔ رعیتی ۔ رعیت ۔ رعیتوار ۔

"س" "ث" "ص" "ش"

سربراہ کار ۔ صادر وارد ۔ سدوانیاں ۔ صافی نامہ ۔ صافی ۔ نامہ ۔ سلام ۔
سلامی ۔ سلام ۔ سالیانہ ۔ سالیانہ دار ۔ سالیانہ داران ۔ سالیانہ دار کی جمع ۔ ثالث
ثالثان ۔ ثالث کی جمع ۔ سب ۔ نگار ۔ سادرہ ۔ سایر ۔ سیر کی جمع ۔ سیاست
سہ بندی ۔ سہ بندی فصلی ۔ سر ۔ سرف ۔ سرف سکہ ۔ سرانجامی ۔ انجام ۔ سر ۔
سزاول ۔ سازاول ۔ شاہ بندر ۔ شیخ دار ۔ شیخ داری ۔ شامل سررشتہ ۔ سررشتہ دار
صراف ۔ شفیعہ ۔ سردار ۔ سر ۔ سردار فوج ۔ سنار ۔ سنی ۔ صورت حال ۔ صوبہ داری
ساہوکار ۔ وار ۔ صوبہ ۔ صوبہ دار ۔ صوبہ داری ابواب صدر ۔ صدر دیوانی
عدالت ۔ صدر نظامت عدالت ۔ سند ۔ دار ۔

"ت" "ط"

تحریر ۔ تعلق ۔ تعلق دار ۔ تعلقداری ۔ تعلقہ ۔ تعلقہ جدید ۔ تعلقہ قدیم —
تعلقۂ مال ضامنی ۔ تعلقۂ زبردستی ۔ تھانہ ۔ تھانا ۔ تھانہ دار ۔ تھانہ جات
تھانہ ہات ۔ تھانہ کی جمع ۔ توفیر ۔ تعزیر ۔ ٹھیکہ ۔ ٹھیکہ دار ۔ ٹھیکا پٹا ۔ ٹیپ تصحیح ۔
دار وغیرہ ۔ تحصیل ۔ تحصیلدار ۔ تحصیل دیوانی ۔ تحصیل سرانجامی ۔ طرف ۔ دار ۔
متصدی ۔ تعہد ۔ تاڑی ۔ تخم ریزی ۔ تخم ۔ ریزی ۔ تعہد ۔ توپ ۔ توپ خانہ ۔
توفیر ۔ توفیر جاگیرداراں ۔ ترجیہ ۔ تقاوی ۔ تقسیم ۔ تخصیص ۔ تخصیص جمعبندی ؛

طومار - تومار جمع - تنخواہ - تن. خواہ - تیا - طرف دار - طرف - دار - تعینات
تعین کی جمع -

"و"

وکیل - واقعہ نگار - واصل - واصل باقی - وضیعہ - وجوہات - وجہ کی جمع -
وجوہات خاص نویسی -

"ی" "الف"

یافت خدمت - اہتمامی

"ذ" "ز" "ض"

ذاتی - ضبط - ضبطی - زین چاکران - زمیندار - زین - دار - زمینداران
زمیندار کی جمع - زمینداری - زیر مثھوت - ضلع - زور طلب - زور - طلب
زنجیر - ضامن - ضمن -

کتابیات

۱۔ وارن ہسٹنگز اور انگریزی راج۔ از ای۔ پی۔ جون۔ مترجمہ سید اولاد علی گیلانی۔ شائع کردہ کتاب منزل۔ لاہور۔

۲۔ تقاریر کیپٹن ایسٹ وک (لندن) ۱۸۶۵ء (انگریزی)

۳۔ عظیم انقلاب ۱۸۵۷ء (انگریزی) از ڈاکٹر معین الحق۔ ہسٹاریکل بورڈ کراچی

۴۔ بغاوت پنجاب کا ریکارڈ جلد دوم۔ مطبوعہ گورنمنٹ پریس لاہور ۱۹۱۱ء (انگریزی)

۵۔ خطبۂ استقبالیہ کل پاکستان اردو تدریس کانفرنس کراچی۔ جون سنہ ۱۹۶۴ء (پمفلٹ)

۶۔ خطبات عبدالحق۔ مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۵۲ء

۷۔ تعلیم و تعلم۔ از سید الطاف علی بریلوی بریلوی۔ شائع کردہ اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

۸۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ از ڈبلو ڈبلو۔ ہنٹر (ترجمہ)

۹۔ نقوش سلیمانی۔ از سید سلیمان ندوی۔ مکتبۂ مشرق آرام باغ کراچی مطبوعہ ۱۹۵۱ء

۱۰۔ تحریک آزادی ہند۔ از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی شائع کردہ اسلامک پبلیکیشن ڈھاکہ۔ مرتبہ پروفیسر خورشید احمد

۱۱۔ مرحوم اردو کالج۔ از مولوی عبدالحق۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند

۱۲ لسانی مسائل۔ از ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ مکتبہ اسلوب ۳/۵۲ مسلم لیگ کوارٹرز۔ ناظم آباد کراچی

۱۳۔ اردو زبان اور اسالیب۔ از سید محمد محمود احمد مخمور اکبرآبادی۔ شائع کردہ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

۱۴۔ خط و خطاطی۔ مرتبہ پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے و ممتاز حسن جونپوری۔ شائع کردہ اکیڈمی آف آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

۱۵۔ رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۹۹ء کلکتہ۔

۱۶۔ تاریخ التعلیم۔ از میجر بی۔ ڈی۔ باسو۔ (انگریزی)

۱۷۔ رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کلکتہ ۱۹۳۹ء

۱۸۔ تاریخ ہند۔ عہد جدید لارڈ ولیم بینٹنگ اور ملکی اصلاحیں۔ از ڈاکٹر یوسف حسن خاں۔ دارالترجمہ حیدرآباد دکن

۱۹۔ ہماری قومی زبان۔ از مسٹر ایم ایم متین۔ (انگریزی) کراچی۔

۲۰۔ تاریخ ادب اردو۔ از رام بابو سکسینہ ترجمہ از مرزا محمد عسکری نولکشور پریس بکڈپو۔ لکھنو۔ ۱۹۵۲ء

۲۱۔ اسٹیٹوٹری رپورٹ جلد اول مطبوعہ لندن ۱۹۳۰ء (انگریزی)

۲۲۔ گل کرائیسٹ اور اس کا عہد از محمد عتیق صدیقی۔ انجمن ترقی اردو ہند علیگڑھ
۲۳۔ رپورٹ اجلاس ایجوکیشنل کانفرنس کلکتہ ۱۹۱۶ء
۲۴ مقالات گارسان دتاسی ۱۸۷۰۔۷۲ء۔ شائع کردہ۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۶۴ء
۲۵ مقالات گارسان دتاسی ۱۸۷۴-۱۸۷۷ء شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند۔ دہلی۔ ۱۹۴۳ء
۲۶۔ بنگال کا پوتھی ادب۔ از احسن احمد اشک (کتابچہ)
۲۷۔ ہند کے اسلامی عہد میں تعلیمی ترقی۔ از این این لا۔ مترجمہ اخلاص حسین ایم اے۔ وسیدہ سلطان فاطمہ بلخی۔ شائع کردہ اکیڈیمی آف ایجوکیشنل کانفرنس کراچی۔
۲۸۔ مسلم بنگالی ادب از ڈاکٹر انعام الحق (ترجمہ) ۱۹۵۷ء ادارۂ مطبوعات پاکستان کراچی۔
۲۹۔ تاریخ التعلیم۔ از پی۔ ایل۔ راوت (انگریزی)
۳۰۔ بنگالی مسلمانوں کی صدسالہ جدوجہد آزادی۔ از عبداللہ ملک شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور۔
۳۱۔ معاشی تاریخ ہند جلد دوم از رامیش دت۔ ترجمہ از محمد نصیر الدین خاں۔ ایم اے۔ دار الترجمہ۔ حیدر آباد دکن ۱۹۳۶ء
۳۲۔ رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس دہلی ۱۹۲۶ء
۳۳۔ سوانح عمری راجہ رام موہن رائے از نتھورام جیوں ۱۸۹۳ء

۳۴ ۔ رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس پنجاہ سالہ جوبلی ۱۹۳۵ء
۳۵ ۔ رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۳ء لکھنؤ۔
۳۶۔ ” ” ” ۱۹۰۸ء امرتسر
۳۷۔ اردو کی فضیلت چند بنگالی اکابر کی نظر میں۔ انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۵۲ء
۳۸ ۔ خود نوشت سوانح حیات فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں سابق صدر پاکستان
۳۹ ۔ مقالات سرسید جلد ہشتم مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ انجمن ترقی ادب. لاہور۔
۴۰ ۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ از مولوی طفیل احمد منگلوری۔ شائع کردہ نظامی پریس بدایوں۔
۴۱ ۔ تذکرۂ محسن از مولوی محمد امین زبیری ۱۹۳۵ء
۴۲ ۔ مجموعہ تقاریر نواب محسن الملک شائع کردہ ملک چنن اینڈ کو۔ لاہور
۴۳ ۔ اپنی کہانی از ڈاکٹر راجندر پرشاد مترجمہ گوپی ناتھ امن۔ شائع کردہ ساہتیہ اکیڈمی ۔ نئی دہلی ۔ ۱۹۶۱ء
۴۴ باپو کے قدموں میں۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد ۱۹۵۳ء ترجمہ شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ۔
۴۵ ۔ رپورٹ بابت واردھا تعلیمی اسکیم۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کراچی
۴۶ انجمن ترقی اردو کی کہانی از مولوی غلام ربانی۔ مطبوعہ ۱۹۳۹ء دہلی

۴۷۔ اردوئے معلیٰ (منجانب عبدالحق جوبلی کمیٹی) ناشر سید ابو تمیم فرید آبادی
۱۲۔ اردو بازار۔ لاہور۔
۴۸۔ ہندوستان میں ترقی تعلیم ..... رپورٹ گورنمنٹ آف انڈیا مرتبہ سٹرآر ناتھن۔ بابت ۱۹۰۲ - ۱۸۹۷ء
۴۹ ہندوستان میں ترقیٔ تعلیم ۹۷ - ۱۸۹۲ء مرتبہ جے۔ سی۔ کاٹن
۵۰۔ پاکستان میں اردو۔ از محمد طاہر فاروقی و خاطر غزنوی۔ یونیورسٹی بک ایجنسی۔ خیبر بازار پشاور ۱۹۶۵ء
۵۱۔ رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۰۷ء
۵۲۔ کتابچہ سندھی ادب از پیر حسام الدین راشدی
۵۳۔ سندھ کے فارسی گو شعرا از ڈاکٹر سداگرانی (انگریزی) شائع کردہ سندھی ادبی بورڈ کراچی۔
۵۴ سفرنامہ ڈاکٹر برنس (انگریزی ۱۸۲۹ء
۵۵ خود نوشت سوانح حیات نائول بھوجوانی لندن ۱۹۱۵ء
۵۶ کتابچہ سندھ مدرسۃ العلوم از سید الطاف علی بریلوی
۵۷۔ مرقع کانفرنس جلد اول ۱۹۲۵ء
۵۸۔ " " جلد دوم "
۵۹ تکملۂ مقالات الشعراء، سندھ ادبی بورڈ کراچی
۶۰ مرقع فیض۔ مصنفہ مولوی عنایت علی بریلوی مطبوعہ ۱۹۰۸ء
۶۱ جائزہ زبان اردو۔ مرتبہ انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۴۸ء

۶۲ انیسویں صدی کے اخبارات از افضل العلما، ڈاکٹر محمد عبدالحق مدراسی
۶۳ رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مدراس
۶۴ " " " ۱۹۰۱ء
۶۵ تاریخ جنوبی ہند از محمود بنگلوری
۶۶۔ رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس راولپنڈی
۶۷ " " " " ناگپور ۱۹۱۰ء
۶۸۔ سی پی میں کانگریس راج۔ از حکیم اسرار احمد کریوی
۶۹۔ سفرنامہ چارلس میسن۔ مطبوعہ لندن ۱۸۴۴ء
۷۰۔ بلوچستان میں اردو۔ از ڈاکٹر انعام الحق کوثر۔ شائع کردہ مرکزی اردو بورڈ۔ گلبرگ لاہور ۱۹۶۸ء
۷۱ یادداشت مسٹر جمشید مہتہ میئر کراچی ۱۹۳۵ء
۷۲ رنجیت سنگھ از سر لیپل گرفن مترجمہ مولوی نظیر حسین فاروقی۔ ۱۹۲۲ء دارالترجمہ حیدرآباد دکن
۷۳ اٹک کے اس پار۔ از فارغ بخاری و رضا ہمدانی گوشہ ادب لاہور
۷۴ حیات حافظ رحمت خاں از سید الطاف علی بریلوی۔ شائع کردہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۷۵ رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ ۱۹۳۵ء
۷۶ ڈائری کیپٹن ایڈورڈ ۱۸۴۷-۴۸ء شائع کردہ پنجاب گورنمنٹ پریس ۱۹۱۱ء

۷۷ چشم دید خود نوشت سوانح حیات سر فیروز خاں نون (ترجمہ)
شائع کردہ فیروز سنز کراچی ۱۹۶۷ء
۷۸ کتابچہ تقریر مسٹر محمد علی بوگرہ (مئی ۱۹۵۴ء)
۷۹ ہنٹر کمیشن رپورٹ پنجاب ۱۸۸۲ء (انگریزی)
۸۰ صوفیائے بنگال از مولانا اعجاز الحق
۸۱ " " " سندھ "
۸۲ " " " پنجاب "
۸۳ " " " سرحد "
۸۴ تاریخ سندھ از مرزا قلیج بیگ (انگریزی)
۸۵ گزیٹر سندھ مرتبہ ڈاکٹر سودے

اخبارات و رسائل و مقالات

۱. مقالہ تاریخ پاکستان کی جھلکیاں۔ از رئیس احمد جعفری۔ روزنامہ انجام مورخہ ۱۴ر مئی سنہ ۱۹۶۰ء

۲. مقالہ فارسی زبان کا اثر ہندوستانی زبان پر۔ معارف اعظم گڑھ

۳. رپورٹ السنۂ شرقیہ از مطیع الرحمٰن قریشی ملتان

۴. معارف اعظم گڑھ اپریل سنہ ۱۹۶۸ء

۵. روزنامہ جنگ کراچی بابت ۳۱ر اگست ۶۷ء، ۲۵ر دسمبر ۶۵ء، ۱۷ر جون ۶۸ء، ۲۰ر نومبر ۱۹۶۹ء، ۲۲ستمبر ۶۹، ۱۲ر اکتوبر ۶۹ء

۶. المعارف جنوری و فروری ۱۹۶۰ء

۷. العلم کراچی جون ۱۹۶۸ء ستمبر سنہ ۶۷ء

۸. روزنامہ حریت مورخہ ۱۱ر اکتوبر سنہ ۱۹۶۹ء

۹. ہماری زبان علی گڑھ بابت یکم مارچ ۱۹۶۷ء، ۲۲ر مئی ۱۹۶۵ء

۱۰. نقوش لاہور۔ لاہور نمبر۔

۱۱. سالنامہ ادبی دنیا کشمیر نمبر

۱۲. الزبیر بہاولپور ۱۹۶۸ء

۱۳. قومی زبان بابت جون ۱۹۶۹ء

۱۴. ہماری آواز کانپور۔ ۱۱ر فروری ۱۹۵۶ء

۱۵ ۔ حروف القرآن (بنگلہ اخبار بخط عربی) بابت ۱۲ر نومبر ۱۹۵۱ء پروپرائٹر مولوی ذوالفقار علی ۔ ایڈیٹر مولوی فریدالرحمٰن ۔ بی ۔ ایل ۔ سب ایڈیٹر حکیم محمد سلامت اللہ ۔ بدویہ پریس چاٹگام

۱۶ رسالہ ایجوکیشن بمبئی بابت جون ۱۹۰۹ء

ANGRIZON KI LISSANI POLICY

(LINGUISTIC POLICY OF THE ENGLISH PEOPLE)

COMPILED BY

SYED MUSTAFA ALI BRELVI

B. Com L.L.B.

PREFACE BY

MIRZA ALI AZHAR BARLAS

ACADEMY OF EDUCATIONAL RESEARCH
ALL PAKISTAN EDUCATIONAL CONFERENCE
KARACHI